سہ ماہی

اردو

جلد - ۴۴　　　　شمارہ - ۲

اپریل ۱۹۶۸ء

انجمن ترقی اردو بابائے اردو روڈ

کراچی-۱

فہرست مضامین

مسلسل مضامین

طابع : انجمن پریس لارنس روڈ کراچی

زیر اہتمام : محمد مصلح الدین سعدی

ناشر : انجمن ترقی اردو ، بابائے اردو روڈ کراچی

قیمت فی پرچہ : ~~تین روپے پچاس پیسے~~

قیمت سالانہ : بارہ روپے

تذکرہ مسرت افزا

قاضی عبدالودود *

[۱]

مولف تذکرہ مسرت افزا (= مسرت) نے (۱) اپنی کتاب کے دیباچے میں اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے : " ابوالحسن امیر الدین احمد المشتہر بہ امراللہ الہ آبادی " (ص ۱) ابوالحسن کنیت ہے جو شعور آنے پر اختیار کی ہوگی ، امیر الدین احمد اصلی نام ، امراللہ عرف اور الہ آباد وطن تھا ۔ اس بنا پر کہ مولف نے ۱۱۹۳ھ کی ۳ جمادی الاخریٰ کو اپنی عمر ۲۳ سال بتائی ہے (ص ۱) ۱۱۷۰ھ اس کا سال ولادت قرار پاتا ہے ۔ وہ اپنے برادر بزرگ خیر الدین محمد کا شاگرد تھا (ص ۱٦) اور "سیر و تحصیل علم" کی غرض سے ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ بھی گیا تھا (ص ۹۷) ۔ دیباچے میں ۲۰ ابیات کی ایک فارسی مثنوی شامل ہے جو بظاہر خود مولف کی زائیدۂ فکر ہے ، اس کے شعر ذیل میں "حامد" بطور تخلص آیا ہے :

بس (۲) حامد ازیں فضول خاموش
دریائے عنایت است در جوش (ص ۴)

مولف صفر ۱۱۹۲ھ میں اپنے برادر بزرگ کی رفاقت میں پٹنہ پہنچا اور یہاں "چندے" مقیم رہا (ص ۲)۔ پٹنہ سے وہ کب رخصت ہوا ، اس کے متعلق

---

* بیرسٹر ایٹ لا ، بانکی پور ، پٹنہ

۱- مولف اور اس کے اقربا کے حالات صرف وہی درج ہیں جو مسرت میں ہیں ، دوسرے ذرائع سے ان پر اضافہ ہو سکتا ہے ۔

۲- مولف کا ترجمہ مسرت میں نہیں ۔

مولف کے دو اقوال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ۱۱۹۲ھ کی بات ہے ، اور ایک اس پر مشعر ہے کہ ۱۱۹۳ھ میں یہاں سے روانہ ہوا -

(الف) اقتباس ترجمہ' ٹہاکر داس ضمیر : ''در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و دو ہجری کہ مولف بعزم کلکتہ در مرشد آباد رسیدہ'' - (ص ۱۲۰)

(ب) ترجمہ' علی ابراہیم خاں خلیل میں بجنسہ یہی عبارت - (ص ۷۲)

(ج) اقتباس ترجمہ' مفتی برکت اللہ: در سنہ یک ہزار و یکصد ونود وسہ برائے استفسار مقدمہ' ورثہ' شہباز بیگ .. کہ صاحبان کوسل (کذا) آں بلدہ (پٹنہ) در ظاہر باستصواب و استفتائے اہل شرع انفصال نمودہ بودند ہمراہ دیگر افتا پناہاں حضور طلب صاحبان کوسل کلکتہ شدہ ، تا حالت تحریر در قید آب و دانہ' آں بلدہ پابند است......... مولف در آں حین بعزم کلکتہ وارد عظیم آباد بود کہ ایں حکم رسیدہ - (ص ۳۶ ، ۳۸)

مرشد آباد میں جو پٹنہ اور کلکتہ کی راہ میں واقع ہے ، مولف کا قیام زیادہ نہ رہا ہوگا ، وہ ترجمہ' مفتی برکت اللہ میں برکت اللہ وغیرہ کی پٹنہ سے روانگی کے ذکر کے بعد لکھتا ہے : ''مولف ہم مقارن ایں حال وارد کلکتہ شدہ'' (ص ۳۹) - اس کا امکان ہے کہ کلکتہ سے واپسی میں مولف مرشد آباد و پٹنہ میں کچھ ٹھیرا ہو - بہر حال ۱۱۹۴ھ میں وہ بقول خود پھر لکھنؤ میں تھا (تختمہ' تذکرہ' مسرت افزا = تختمہ) اور اس سفر میں اس کا فرخ آباد جانا بھی ہوا (ص ۲۱۴) . ترجمہ' سید امام تصور سے معلوم ہوتا ہے کہ تصور مولف کی رفاقت میں الہ آباد سے رام نگر بنارس گیا تھا ، اور وہاں ایک ''مدت'' تک فارغ البال رہا تھا ، یہاں تک کہ راجہ چیت سنگھ اور اس کے متوسلین کے فرار کی وجہ سے تصور بھی وہاں سے شعبان ۱۱۹۵ھ میں رخصت ہوا - (ص ۴۰)

ترجمہ' غلام حسین خاں پسر ہمت خاں سے جو پہلے راجہ بلونڈ سنگھ اور اس کی موت کے بعد راجہ چیت سنگھ کی رفاقت میں تھے ، زمانہ' فرار راجہ چیت سنگھ میں مولف کی اقامت بنارس ثابت ہوتی ہے (ص ۴۰) - ترجمہ رستم علی رستم سے تحریر ترجمہ سے پیشتر کسی زمانے میں غازی پور جانے کا ثبوت ملتا ہے - (ص ۸۵)

[۲]

اقربائے مولف اور اس کے والد کے نام مسرت میں نہیں - ترجمہ' خیرالدین

محمد حسرت میں ہے کہ ایک دن مصیوب و محزوں "جہت ملاقات پدر بزرگوار مد ظلہم العالی" تشریف لائے (ص ۵۲)۔ اس ترجمے کے صفحہ ۶۳ میں مولف نے اپنی طرف سے پدر خیر الدین محمد کو "حضرت قبلہ گاہی" لکھا ہے ، اس میں کچھ شک نہیں کہ دونوں کے والد ایک ہیں ، محزوں نے ان سے مخاطب ہو کر خیرالدین محمد کے بارے میں کہا ہے : "این فرزند خود را بمن دهند"۔ (ص ۶۳)

خیر الدین محمد کا زمانہ' ولادت صفر ۱۱۶۵ھ کا عشرہ' اوایل ہے - ۱۴ سال کے تھے کہ محزوں نے ان کی تعلیم اپنے ذمے لی ، اور اس کا سلسلہ محزوں کی موت (۱۱۸۵ھ ، ص ۱۹۱) تک جاری رہا ۔ اس کے بعد یہ تکمیل کے لئے جونپور گئے اور وہاں ایک سال محمد عسکری سے اکتساب علم کیا - ان کا تخلص حسرت تھا ، ابتدا میں شعر گوئی کا شوق تھا ، لیکن بعد کو "بحسب اتفاق و ضرورت محل" کہا کرتے تھے ۔ ان کے ایام خردسالی میں ان کے ایک دوست نے دعوے کے ساتھ اپنا یہ مطلع پڑھا :

بسکہ دم از صفا زند موے بموے موے تو
آئینہ آب میشود روے بروے روے تو

انھوں نے بر جستہ یہ مطلع کہا اور سب نے اس کی تعریف کی :

اے مہ و مہر منفعل روے بروے روے تو
شاہ و گدا بجستجو کوے بکوے کوے تو

مثنوی مناجات کے تقریباً سو شعر فارسی جو مظہر الغرائب کے آخر میں ہیں یک جلسہ کہے ۔ مسرت میں اس کے ۱۷ اور اردو کے چار شعر موجود ہیں ۔ خیرالدین محمد صاحب تصانیف عربی (۱) و فارسی (۲) تھے ، مسرت میں مؤلف نے کتب فارسی کی جو نامکمل فہرست دی ہے ، یہ ہے:

مظہر الغرائب در مناقب علی ابن ابی طالب ، وسیلہ' النجات والوصول شرح مثنوی معراج القبول ، گلزار اسرار در لطائف ابرار ، خوارق قادریہ بادشاہ کے لئے لکھی ، لطائف الابرار در مباحث ظرفائے اهل سنت و امامیہ ، تحفتہ المجالس

۱۔ کسی عربی تصنیف کا نام مسرت میں نہیں ۔

۲- خیر الدین محمد کی مشہور ترین کتاب عہد شاہ عالم ثانی کی تاریخ عبرت نامہ ہے ، جس کا ایک نسخہ کتاب خانہ' خدا بخش پٹنہ میں ہے ۔

در ذکر آثار سلاطین - مولف مسرت کو ان سے بڑی عقیدت تھی، ان کے ترجمے میں یہ ۳ شعر شامل ھیں جو بہ ظاھر اسی کے ھیں -

چہ نسبت ذرہ را با مہر انور	نیابد از صدف(۱) توصیف گوھر
اگر خواھم کہ باشد آبرویم	ھمیں گویم کہ من شاگرد اویم
نہ شاگردم غلام کمترینم	بگرد خامہ' او خوشہ چینم

(ص ۶۱ تا ۷۰)

ص ۲۹۲ میں ان کا ایک شعر ھے : '' پتھر پہ ھے سر الخ — ''

مولف کے بھائی (۲) صلاح الدین خاں بھی ان سے عمر میں بڑے تھے ، مسرت میں ان کے متعلق صرف یہ عبارت ملتی ھے :

ترجمہ' کرم علی خاں شہید مخاطب بہ مخدوم علی خاں : ''شہید..... قطع نظر از برادری با مہین برادر مولف صلاح الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ کمال ربط و یکجہتی دارد و مدتہا باھم در مجلس.....خدیو گیہان ھمنشین و ھم صحبت بسر بردہ '' - (ص ۱۱۳)

مولف کی ایک بہن شاہ غلام قطب الدین مصیب الہ آبادی کی زوجہ تھیں - اقتباس ترجمہ مصیب :

''بعد چہار ماہ از روانہ شدن آں جناب... کہ غرہ' ذیحجہ روز دو شنبہ سنہ یک ھزار و یک صد و ھشتاد و شش بود ، نور بصر ، لخت جگر شاہ غلام حیدر ...... خلف آں حضرت (مصیب) بوجود آمدہ ...... زبانی والدہ ماجدہ اش کہ ھمشیرہ' مولف است مکرر شنیدہ ام چوں ایام تولد وے قریب رسیدہ اکثر خواب مژدہ' مبارکباد بگوش ما میرسید''- (ص ۱۸۶)

[۳]

نسخ تذکرہ' مسرت افزا — دو قلمی نسخوں کا علم اب تک ھوا ھے-

۱- خزف ؟

۲- مولف ، خیر الدین محمد ، صلاح الدین خاں محض رشتے کے بھائی بہن نہیں معلوم ہوتے ، اعیانی یا علاتی بھائی بہن ھیں -

ایک سرو۔ اوزلے کی ملک تھا اور مدتوں سے کتب خانہ' دانشگاہ آکسفورڈ میں ہے۔ اس کا ذکر وہاں کی فہرست مخطوطات میں ہے، دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی اور دیوان جوشش کی ترتیب میں اسی سے کام لیا گیا ہے۔ بعد کو پوری کتاب کا عکس کتب خانہ دانشگاہ پٹنہ کے لئے حاصل کیا گیا، اور نسخہ' مطبوعہ جو باقساط معاصر پٹنہ میں شائع ہوا اسی پر مبنی ہے۔ مگر اس میں بوجوہ بہت سے اشعار درج نہیں ہوئے اور اغلاط طباعت بھی بہت ہیں۔ دوسرا نسخہ کتاب کی طباعت کے بعد کتب خانہ' خدا بخش میں آیا ہے، میں نے ابھی دونوں کا تقابلی مطالعہ نہیں کیا، غالباً ایک غیر معروف شاعر کا حال موخرالذکر میں زیادہ ہے اور اس کا متن نسبتاً صحیح ہے۔ تقابلی مطالعے کے نتائج اس مقالے کی قسط آخر میں پیش کئے جائیں گے۔

یادگار ضیغم کی دوسری روایت میں جو کتب خانہ' ادارہ' ادبیات اردو حیدرآباد میں ہے، بہت سے مطالب اس سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں، میرا گمان ہے کہ اس کے مصنف کے پیش نظر اس کی تیسری روایت ہوگی جس میں امر اللہ نے اضافے کئے ہوں گے۔ ان کے اخلاف سے اس کے متعلق تحقیق کی جائے تو ممکن ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ واقعی اس کی تیسری روایت سے انھوں نے استفادہ کیا تھا، یا کوئی اور تذکرہ ان کے پاس تھا، جو اب تک عام نظروں سے پنہاں ہے۔

[۴]

زمانہ' تالیف مسرت ۔ تذکرے کے اقتباسات ذیل سے زمانہ' تالیف کے متعلق اطلاعات ملتی ہیں :

۱۔ '' از بدایت ایام صبا تا ایں آوان کہ سنین عمرم بثلاث و عشرین رسیدہ اوقات خود را در خدمت صاحبان فضل و کمال بسر بردم و از فیض صحبت شاں رسیدم بمقامے کہ پیوستہ دل حزین و خاطر محزوں جرأت کردہ ...پیام درد و الم بعرض میرساند کہ تا کے ... سامان بے سامانی و رسوائی خود در گنجینہ' سینہ نہاں دارم اگر دستوری یابم قصہ' درد مندی و آوارگی' خود در ضمن حالات شاعران ریختہ... شرح سازم ... چہ کمتر از سخنوران درپے تالیف حالات شاں رفتہ اند ، و اکثر طالبان را تلاش ایں نوادر احوال

می باشد ... لیکن نیرنگیٔ روزگار فرصت دم‌زدن نمی داد...
ناگاه ... در شہر صفر سنه یک ہزار و یک صد و نود و دو
ہجری .. بعد قطع مراحل وطی اقامت در ... عظیم آباد
نہادم . چندے قائم آں مقام شدم و سخنوران آنجا که
در شیوهٔ محبت یکرنگ و یک دل می نمودند ، دریافتم ...
دل مشتاق مرا ... بر آں آورد که شمهٔ از حالات شاں ...
سطح تحریر را آرایش بخشم . در ہموں (کذا) اندیشه
باز خیال سیاحت دارالامارت کلکته گلوگیر گردید ... براه کشتی
روبراه آوردیم ... در اثنائے راه بخاطر رسید که اوضاع
زمانه را ثبائے نیست ... پرده از روئے مخدرات حجلهٔ سینه
برداشته برمنصهٔ شہود منجلی گردانم و برائے حاضراں
تذکارے و آیندگاں یادگارے گذارم ، مبادا سہو و نسیان
تاخت آرد و ... مطالب و مضامین را که آمادهٔ جلوه گری . اند
تاراج نماید ، لہذا دامن سعی بمیاں جان بستم که از لآلی
حالات اسلاف و اخلاف که ... عمرے مجاوری خمخانهٔ
ایں فن نموده در سلک انتظام در آوردم" (۱) (ص ۱ تا ۳)

از ہجرت افضل البشر بود	تسعین و ہزار صد سه افزود
بوده ز مه جماد دوم	تاریخ سوم نه بیش و نه کم
کیں تذکرهٔ مسرت افزا	ایں خامهٔ من نمود املا (۲)

(ص ۱ تا ۴)

۲- " چوں فقیر دراں زماں (ورود مرشد آباد ۱۱۹۲ھ) درپے
تالیف حالات شاعراں زبان ریخته بود از دوستان آں دیار
شنیده که وے (علی ابراهیم خاں) خلیل .. تذکره شعرائے

۱- حسب ذیل الفاظ مسرت میں بطور تخلص آئے ہیں : دل ، حزیں ،
محزوں ، جرأت ، پیام ، درد ، الم ، ساماں ، رسوا ، نہاں ، دردمند، آواره ،
طالب ، فرصت ، قائم ، یکرنگ ، یکدل ، مشتاق ، حاضر .

۲- اس کے یہ معنی نہ لئے جائیں پوری روایت اول ایک دن میں
سپرد قلم ہوئی .

ریختہ نیز ترتیب دادہ ... بخواہش تمام ... استدعائے آں تذکرہ نمودم تا از آں حالات اساتذہ کہ از حالات شان بما خبر نرسیدہ خصوصاً احوال وے را از تالیف وے استخراج نمایم لیکن خدا داند بخاطرش چہ خطور کرد .. کہ ابا و انکار آورد ، مکرر ارشاد فرمود کہ بعد ترتیب پریشاں ساختم - واللہ اعلم'' - (ص ۲۷)

۳- ''مولف در ... یک ہزار یک صد و نود و سہ ... در اثنائے سفر کلکتہ ... ایں تذکرہ ترتیب نمودہ بود ، چوں در سنہ نود و چہارم... ورود ... لکھنؤ رو داد بر احوال اکثر نکتہ پردازان ایں زماں اطلاع دست داد ، تذکار شان دریں تذکرہ ... مناسب دید'' - (تختمہ) -

۴- ''امسال کہ شروع سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہارم است '' - (ترجمہ' آفتاب ، ص ٦)

۵- ''بعد تحریر تذکرہ در ... رجب یک ہزار و یک صد و نود و پنجم ہجری '' - (ترجمہ' خلیل ، ص ۳۷)

٦- ''بعد اتمام ایں تذکرہ در عشرہ' اولیٰ ماہ شعبان سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنجم ہجری میر شورش جہان ...... را پدرود کردہ '' - (ص ۱۱۲)

۷- ''بعد تحریر تذکرہ امسال کہ سنہ یک‌ہزار و یکصد و نود و پنجم است ... وے (مظہر) را بتاریخ ہفتم تا نہم ماہ محرم بضرب گولی پستول بدرجہ' شہادت رسانیدہ '' - (ص ۱۸۳)

۸- ترجمہ' تصور میں شعبان ۱۱۹۵ھ کا ذکر ہے - (ص ۴۱)

تذکرہ نویسی کا خیال لڑکپن سے تھا ، مولف ۱۱۹۲ھ میں وارد پٹنہ ہوا تو وہاں کے شعرا کا تذکرہ لکھنے کا خیال آیا - یہ اس کی عبارت سے مستفاد ہوتا ہے جو میری رائے میں اس کے مدعا کو صحیح طور پر ظاہر نہیں کرتی- اس سلسلے میں نظر بظاہر اس نے پہلا عملی قدم مرشد آباد میں اٹھایا، اور تذکرے نے دوران سفر میں بتاریخ ۳ جمادی الاخریٰ ۱۱۹۳ھ کتابی شکل اختیار کر لی ، ۱۱۹۴ھ میں لکھنؤ جانے کے بعد اس نے اضافے کئے ، اور اس کا

سلسلہ شعبان ۱۱۹۰ھ تک جاری رہا ۔ اس کے بعد بھی اگر اضافہ ہوا تو اس تذکرے سے اس کا حال نہیں کھلتا ۔

[۵]

روایت اول و ثانی ۔ اقتباس تختمۂ مسرت : " انحصار کتاب بذکر شاعرانے کہ اسامی شاں در خطبہ مذکور است برهم نموده " ۔ مؤلف نے یہ التزام کرنا چاہا تھا کہ کل شعرائے تذکرہ کا نام مسرت کے خطبے میں آجائے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا ۔ خطبے (دیباچے) میں جو روایت اول کے لئے لکھا گیا تھا ، جن شعرا کے تخلص یا نام کسی نہ کسی طرح آئے ہیں ، ان میں سے ۱۹ زیر نظر مقالے کے ص ۱۰ پر حاشیۂ اول میں ملیں گے ، باقی یہ ہیں : رنگین ، احسن ، آبرو ، حسرت ، اضطراب ، آگاہ ، کامل ، عزیز ، شورش ، فغاں ، بیتاب ، خاکسار ، بسمل ، سودا ، عزلت ، عشق ، شوق ، سعادت ، منتظر ، خوشدل ، فرحت ، سوز ، گداز ، گریاں ، نالاں ، مصیب ، برکت ، مسافر ، دوست ، جوشش ، راغب ، راسخ ، منت ، اشتیاق ، قبول ، کافر ، انجام ، ہدایت ، صواب ، غریب ، روشن ، امید ، بیان ، امیر ، حسن ، فقیر ، یاد ، عاشق ۔ یہ سب بشمول الفاظ حاشیہ مذکورہ ۶۷ ہیں ۔ یہ کس طرح باور کیا جائے کہ روایت اول میں مظہر ، مضمون ، امین عظیم آبادی ، جنون کا ذکر نہ تھا ؟ میرا خیال ہے کہ روایت ثالث بھی ہوگی ، لیکن اس وقت صرف روایت ثانی منظر عام پر ہے ، اور روایات قعر گمنامی میں پڑی ہیں ۔ (رجوع بفصل ۲)

[۶]

سبب تالیف مسرت ۔ مولف نکات الشعرا پر اعتراض کے بعد لکھتا ہے :
" اگر راست بگویم سبب تالیف این تذکرہ ... ہم ہمیں بود کہ من بر غم حاسدان عیب بین و خردہ گیران نکتہ چین حالات ہر یکے کماہی در مسطر تحریر کشیدم (کذا) (ص ۱۹۹) ۔ میرا خیال ہے کہ یہ تنہا سبب نہ تھا ۔

[۷]

تذکرے ۔ اس فصل میں ان تذکروں سے بحث ہوگی جن کے نام مسرت میں آئے ہیں ، اس سے قطع نظر کہ مولف کی نظر سے گزرے تھے یا نہیں ۔

نکات الشعرا : " بسبب رعونت ... کہ خلقی اوست زبانزد زبان آوران شدہ و باعث عیب جوئی سنخنوران در زبان شان ہریکے را حوصلہ عیب جوئی او بہم رسید - میرزا رفیع گوید :

ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے

در ... نکات الشعرا... عجب نکتہ چینی در کلام شعرا... نمودہ ، ہر کرا بتحقیر و بےادائی آوردہ و اشعار ایشاں راےبے رتبہ و ناپسندیدہ چیدہ ... طرفہ ترکہ میرچوں ہمت خود بانتخاب اشعار ناپسندیدہ شعرا گماشتہ بود ، طبعش بہمین مرغوب گشتہ ، ازیں جہت از اشعار خود ہرچہ دراں تذکرہ نوشتہ اکثرے از آں بے رتبہ و ناپسندیدہ است ، در دیوانش بہتر ازیں اشعار بنظر فقیر درآمدہ - شنیدم کہ محمد تقی سید نیست ، میر ناصر مرحوم والد میر درد بمشاہدہ جودت طبعش در عنفوان جوانی ... میگفت کہ محمد تقی میر میدان سخنوری خواہد شد ، از اں خود را ملقب بمیر ساختہ " (ص ۱۹۹)

راقم کے تلمذ میر و سودا کا ذکر نکات الشعرا کے حوالے سے ہے (ص ۸۶) اور مولف نے خاکسار کی خود بینی اور سفلگی پر میر کے اعتراض کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ عیب جوئی میرا شعار نہیں ، اچھے اشعار سے مطلب ہے ، شاعر کی " نخوت " سے کیا کام (ص ۲۰۵) - یہ صحیح نہیں کہ میر نے ہر شاعر کی تحقیر کی ہے ، اور اس سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ میر نے چن چن کر بے رتبہ شعر درج تذکرہ کئے ہیں - پدر درد کا قول خود نکات‌الشعرا (ترجمہ درد) میں ہے ، اس کا اختیار تخلص سے کچھ سروکار نہیں - مؤلف نے محمد علی نالاں کے دیوان کے دیکھنے کا ذکر کیا ہے ، اور اس کے شعر:

گر عدو میری بدی کرتا ہے خاص و عام میں
میں اسے رسوا کروں گا باندھ کر دیوان میں

کے متعلق لکھا ہے کہ " لیکن بیت حاتم (است) ' شاید غلطی کاتب باشد یا توارد شدہ " (ص ۲۲۷) -

حاتم کا شعر نکات الشعرا میں ہے مگر اس اختلاف کے ساتھ کہ مصرع آخر میں ردیف " میں " نہیں " کے بیچ " ہے - مسرت میں نکات الشعرا کے بہت سے شعرا کا ذکر نہیں مثلاً بینوا ، عطا ، میر حسن ، حسن شاگرد سودا ، عشاق وغیرہ -

تذکرۂ گردیزی میں صنعت کے شعر ذیل پر اعتراض ہوا ہے کہ اس کے دونوں مصرعوں میں " گھر " بطور قافیہ آیا ہے :

یار گھر جاتا ہے یارو کیا کروں
ہائے گھر جاتا ہے یارو کیا کروں

مولف کا جواب یہ ہے : " در مصرعۂ (کذا) اول ' گھر جاتا ہے ' بمعنی ' بخانہ خود میرود ' ، و در مصرعۂ دوم بمعنی ' خانہ خراب می شود ' و این ہر دو معنی در محاورۂ اردو کثیرالاستعمالست ، و یک لفظ قافیہ اگر بدو معنی تکرار یابد ، مستحسن است " مولف نے اثر کا نام لئے بغیر ان کا ایک مطلع بطور سند پیش کیا ہے ، اس کے دونوں مصرعوں میں 'پاس' قافیہ ہے لیکن مختلف معنوں میں ، یہ مطلع ص ۲۱ میں بھی اثر کے دوسرے اشعار کے ساتھ درج ہے ۔ مسرت میں کسی اور جگہ تذکرۂ گردیزی کا حوالہ نہیں ، لیکن یہ مولف کی نظر سے ضرور گزرا ہے ۔ نکات الشعرا کی طرح اس سے بھی جیسا چاہئے استفادہ نہیں کیا ، تذکرۂ گردیزی کے متعدد شعرا ، الہام ، میر یحییٰ عاشق ، عمر دکنی ، رحم علی موزوں وغیرہ مسرت سے غیر حاضر ہیں ۔

تذکرۂ میر حسن کا ذکر ترجمۂ میر حسن میں ہے ، اور ان کا حال اس تذکرے کے حوالے سے لکھا ہے ، لیکن میر حسن نے میر امامی (یکے از اجداد میر حسن) کا دھلی آنا لکھا ہے ، مولف نے اسے ان کے والد پر منطبق کر دیا ہے ۔ تذکرۂ میر حسن میں میر ضیا کا تخلص ہے نام نہیں ، مولف نے میر ضیاءالدین بتایا ہے ، اور اس طرح کہ تذکرۂ میر حسن میں اس کے ہونے کا گمان ہوتا ہے ۔ مسرت میں ہے کہ طرز ضیا کو چھوڑ کر میر و سودا کی راہ پر چلے ، میر حسن نے کہا ہے کہ میر ضیا کی طرز کا سرانجام جیسا چاہئے نہ ہوسکا ، میں نے سودا و میر و درد کی پیروی کی ۔ مسرت میں ہے کہ تلاش معاش میں گھر سے نکلے ، تذکرۂ میر حسن میں ہے کہ "گردش روزگار بدھنجار" نے لکھنؤ و فیض آباد پہنچایا ۔ مسرت میں گھاسی رام خوشدل کے دو شعر تذکرۂ میر حسن کے حوالے سے درج ہوئے ہیں ۔ میر حسن نے ترجمۂ جعفر علی حسرت میں ، حسرت کے ایک شعر :

شاید اس دامن میں پیارے خون بے تقصیر ہے
تیرا دامن آج کیوں تیرا گریباں گیر ہے

کے متعلق لکھا ہے '' در ہندوستان رسم است کہ برائے پوشیدن پستان اکثر زنان دامن رابگریباں میکشند '' مولف کہتا ہے کہ مصرع اول 'بے رتبہ' اور مصرع آخر سے کچھ 'مناسبت' نہیں رکھتا ۔ اس لے اس کی جگہ یہ مصرع تجویز کیا ہے اور یہ مؤلف کا واحد اردو مصرع یا شعر ہے جو نظر سے گزرا ہے: '' کچھ تو ہے اس کو چھپا مت تو کہ کیا تقصیر ہے'' (ص ۵۸)۔ تذکرۂ میر حسن سے بھی مولف کا استفادہ مکمل نہیں ، اس کے بکثرت شعرا مسرت میں نہیں ملتے ، مثلاً محمد اشرف معاصر آبرو ، مرزا اکبر قلی ، خواجہ زین العابدین آزاد ، افغان ، اسد علی اسد ، ظفر علی آزاد ، امانی ، اکرم ، انگریس ، بقا ، مصحفی ۔

مولف نے ان تینوں تذکروں سے جن شعرا کے حالات لئے ہیں ، وہ بھی بعض اوقات اطمینان بخش نہیں ، مثلاً یہ کہ محمد شاکر مشہور ایہام بند کے متعلق لکھا ہے : '' نمیدانم کیست او تعالیٰ او را ناجی کناد کہ از کلام وے بسیار راضی می شویم '' (ص ۲۲۹) ۔ نور خاں آگاہ کو شاگرد واقف تو بتایا ہے (ص ۲۴) مگر یہ نہیں لکھا کہ اس نے ضیا سے بھی اصلاح لی تھی ۔ یہ تذکرۂ میر حسن میں ہے ۔

تذکرۂ شیخ احمد وارث متخلص بہ احمدی ، متوطن زمانیہ غازی پور ۔ اس شاعر کا ذکر سب سے پہلے مبتلا نے کیا ہے ، لیکن اس کا نام شیخ احمد لکھا ہے (ص ۶۴) ۔ تذکرۂ عشقی میں وہی نام ہے جو مسرت میں ہے ، لیکن مبتلا و عشقی نے تذکرۂ احمدی کا ذکر نہیں کیا ، اور یہ تذکرہ فی الحال ناپید ہے ۔ مؤلف نے احمدی کے ترجمے میں اس تذکرے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کے اشعار اسی سے ماخوذ ہیں (ص ۲۷)۔ قطب الدین علی خاں شاداں کے اشعار کے لئے بھی اس کا حوالہ دیا ہے ، لیکن شاداں کے حالات بدون حوالہ لکھے ہیں (ص ۱۱۰) ۔ میرا خیال ہے کہ مولف نے اور باتیں بھی اس سے لی ہوں گی ، گو ان کا حوالہ موجود نہیں ۔

تذکرہ شورش : مولف شورش سے رفعت الہ آبادی کے یہاں اکثر ملا کرتا تھا ، فصل ۴ میں زمانۂ وفات شورش بقول مولف کا ذکر ملے گا ۔ ترجمۂ شورش میں مولف نے لکھا ہے کہ اس کا نام '' یادگار دوستان '' ہے ، ایک مدت کی سعی سے اس سنہ میں جو '' یادگار دوستان روزگار '' (= ۱۱۹۱) سے معلوم ہوتا ہے ، مرتب ہوا (ص ۱۱۲) ۔ مفتی برکت اللہ کی طرف جو دو

شعر مولف نے منسوب کئے ہیں ، اُن کی نسبت اس کا قول ہے کہ میں نے شورش سے سنے تھے (ص ٣٦) - تذکرہ شورش مطبوعہ ' کتبخانہ دانشگاہ آکسفرڈ کے عکس پر مبنی ہے ، اور یہ وہی نسخہ ہے جس سے اسپرنگر نے کام لیا تھا اور دیوان جوشش کی ترتیب میں مدد لی گئی تھی - اس نسخے میں نہ دیباچہ ہے ، نہ خاتمہ اور بعض مقامات میں صریحاً کسی شخص نے تصرف کیا ہے - اس نسخے میں نہ وہ نام ہے جو مولف نے دیا ہے اور نہ وہ مصرع تاریخ جو اوپر نقل ہوا ہے -

تذکرہ شورش کا جو خطی نسخہ ڈاکٹر محمود الہی نے جونپور میں دریافت کیا ہے ، اس میں وہ نام نہیں جو صورت میں ہے ، خود شورش کی عبارت جو انہوں نے ''باز یافت'' ص ١٩٢ میں نقل کی ہے اس پر مشعر ہے کہ '' رموز الشعرا '' نام ہے ، مگر شورش اس میں مضائقہ نہیں سمجھتا اگر اسے تذکرہ' شورش کہا جائے - نسخہ' مطبوعہ میں مفتی مذکور کا ذکر نہیں ، اور دو اشعار میں سے ایک بساون لعل بیدار کے نام درج ہے -

ہے تیرے سوا کون مجھے دیکھنے والا
ہاں تجھ کو سلامت رکھے اللہ تعالیٰ (ص ٩٧)

نسخہ' جونپور میں مفتی کا ذکر ہے یا نہیں ، اور یہ شعر کس نام سے ہے ' میں یہ بتانے سے قاصر ہوں -

تذکرہ' محافل الشعرا مولفہ علی ابراہیم خاں خلیل: مولف ترجمہ' خلیل میں لکھتا ہے : '' مدتیست کہ در پئے تالیف تذکرہ' شعرائے متقدمین و متاخرین کمر سعی بر میان بستہ و تذکرہ' محافل الشعرا نامش نہادہ لیکن ... تا حال . . بانجام نہ رسیدہ'' (ص ٤٢) - چونکہ مولف نے اس کے معاً بعد خلیل کے اردو تذکرے کا ذکر کیا ہے ، عدم صراحت کے باوجود ، واضح ہے کہ محافل الشعرا شعرائے فارسی کا تذکرہ ہے - اس تذکرے کا نام صحف ابراہیم ہے اور یہ خود خلیل کے بیان کے بموجب ١٢٠٥ھ میں مکمل ہوا تھا (صحف ابراہیم)- اس کا ایک ناقص نسخہ کتبخانہ' خدابخش پٹنہ میں ہے اور مکمل برلن کے ملکی کتب خانہ میں تھا ، جو اب ممکن ہے کہ ٹیوبنگن میں ہو - یہ نا ممکن نہیں کہ خلیل کا ارادہ ابتدا میں یہ ہو کہ محافل الشعرا نام رکھا جائے -

تذکرہ ریختہ مولفہ خلیل کے متعلق بیان مؤلف فصل ۴ میں دیکھا جائے - مؤلف جس زمانے میں مرشد آباد گیا تھا ، یہ تذکرہ لکھا جا رہا تھا ، اس کے برسوں بعد مکمل ہوا - اس زمانے میں مرتب کر کے " پریشان " کر دینے کا سوال ہی نہیں ، خلیل نے کسی مصلحت سے مولف کو ناتمام تذکرہ نہیں دکھایا - یہ وہی تذکرہ ہے جس کا نام گلزار ابراہیم ہے ، اور جو مسخ شدہ شکل میں طبع بھی ہو چکا ہے - کلیم الدین احمد صاحب نے دو یا تین خطی نسخوں سے اس کا متن تیار کیا ہے اور بہ طبع ہو رہا ہے -

مجمع النفائس مولفہ آرزو کا ذکر ترجمہ آرزو میں ہے ، مگر اس کے حوالے سے کوئی بات مسرت میں درج نہیں - اس کا سال تالیف مؤلف نے ۱۱۶۰ھ بتایا ہے ، مگر یہ بڑا ضخیم تذکرہ ہے ، برسوں کی محنت سے تیار ہوا ہوگا - زمانہ تالیف کی بحث مقدمہ دستورالفصاحت میں ہے -

سرو آزاد مولفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے حوالے سے امید کا حال لکھا گیا ہے (ص ۱۶) - لیکن مسرت اور سرو آزاد میں کچھ فرق ہوگیا ہے -

سرو آزاد : در زمان محمد معزالدین بتقریب خدمتی برہ...... برہان پور آمد و در ایام ایالت .... سید حسین علی خان معزول شدہ بخجستہ بنیاد (اورنگ آباد) رسید و بداروغگی احشام کرناتک مامور گردید و ... بہ ارکات رفت و بعد چند گاہ رفاقت مبارز خان ناظم حیدرآباد اختیار کرد و روز جنگ با مبارز خان حاضر بود ، بعد کشتہ شدن مبارز خان در قید ... آصف جاہ افتاد و غزلے بجناب نواب ارسال داشت ، نواب ... حراست قلعہ متی مرگ از توابع کرناتک ...تفویض فرمود - قزلباش خان بعد چندے رخصت حرمین . گرفت و .. مراجعت نمود - نواب ..بدستور سابق مورد الطاف ساخت و چون نواب...درسنہ خمسین و ماہ و الف حضور طلب شد، قزلباش خان در رکاب نواب بہ شاہجہان آباد رفت و در سفر بھوپال ملتزم رکاب بود ، ..موسیقی ہندی .. خوب میدانست و میگفت و چون نواب ... بہ .. شاہجہان آباد معاودت فرمود قزلباش خان ہمراہ رفت و ازان وقت در دارالخلافہ باز اقامت گشاد " موت ۱۱۰۹ھ ، قطعہ تاریخ وفات جس کا مادہ " جان دادہ قزلباش خان " - ذوالفقار خان سے متعلق حکایت (ص ۲۰۹) مسرت میں ہے کہ عہد معز الدین میں کسی خدمت پر برہان پور گئے اور مدتوں وہاں کے ناظموں کے ساتھ بخوبی بسر کی - عہد حکومت آصف جاہ میں قزلباش خان باجازت حجاز

گئے اور بعد تحصیل زیارت واپس آ کر بدستور مورد الطاف رہے - ۱۱۵۰ھ میں آصف جاہ دھلی طلب ہوئے تو یہ ھمراہ تھے ، اور اس وقت سے تا آخر وھیں رہے - قطعہ" آزاد مادہ " جاں داد قزلباش خاں" (اس سے ہ کا فرق ھو گیا ، مگر یہ کاتب کی غلطی ھوسکتی ہے) حکایت ذوالفقار خاں اور موسیقی کے متعلق وھی بات ہے جو آزاد نے لکھی ہے- (ص ۱٦)

مولف نے لکھا ہے کہ یہ "ما حصل" ہے ، لیکن بعض ضروری باتیں چھوڑ دی ھیں ، اور مدنوں ناظمان برھان پور کے ساتھ بخوبی بسر کرنا اپنی طرف سے اضافہ ہے - مسرت کے ترجمہ" آرزو میں آزاد کا کہا ھوا قطعہ" تاریخ وفات ہے (ص ۱۱) مگر یہ سرو آزاد میں نہیں -

[۸]

مولف الہ آباد و غازی پور وغیرہ کے متعدد شعرا سے ذاتی تعلقات رکھتا تھا ، دوران سفر میں لکھنؤ ، بنارس ، پٹنہ ، مرشد آباد ، کلکتہ وغیرہ میں وہ بہتوں سے ملا ، لیکن کبھی ذاتی تعلقات اور ملاقات کا ذکر کرتا ہے ، کبھی نہیں - پٹنہ ، مرشد آباد اور کلکتہ میں وہ خیرالدین محمد کے ساتھ تھا ، کہیں کہیں یہ لکھا ہے کہ ان سے فلاں شاعر سے ملاقات ھوئی - قرینہ" قوی ہے کہ وہ بھی ان شعرا سے ملا ھوگا ، لیکن لازماً اس کی طرف اشارہ نہیں کرتا - بعض شعرا سے ملاقات نہ ھونے کا صراحتاً ذکر کرتا ہے ، کبھی کبھی وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ کلام کس طرح حاصل ھوا یا کوئی بات کس سے معلوم ھوئی ، اس نے اس سلسلے میں بعض بیاضوں کا بھی حوالہ دیا ہے- بکثرت مقامات میں وہ یہ لکھتا ہے کہ اشعار حافظے سے لکھے -

(۱) خواجہ صاحب میر الم سے پٹنہ میں ملاقات ھوئی وہ "اکثر" اس کے یہاں جایا کرتے تھے ، آن کے اشعار جو مسرت میں ھیں ، خود انھیں سے سنے تھے- ص ۱۰ - (۲) اشعار آشنا از " سفینہ" آشنائی"- ص ۱۷ - (۳) اشعار تصور از "سفینہ" - ص ۱۴ - (۴) میرزا بنیاد مولف کی خرد سالی کے زمانے میں وارد الہ آباد ھو کر اس کے بھائی سے مربوط ھوا - جنگ نامہ" احمد شاہ درانی و مرھٹہ " زبان ریختہ " میں لکھا تھا ، بنیاد بالآخر دکن چلا گیا " وقت تحریر ... شعرے از اشعار ریختہ" او بخاطر نبود ، ... چند ابیات مخمس ... در تعریف ابہام ھو لی ... بقید قلم آوردہ شد "- ص ۴۳ - اس کے باوجود غزل کا ایک شعر موجود ہے - (۵) تحسین صاحب نو طرز مرصع (جس کا اقتباس مسرت میں ہے) مولف سے بہت محبت کرتے تھے - ص ۴۲ - (٦) میر حسن

صاحب تذکرہ کے ایک مطلع کے متعلق مرقوم ہے کہ '' مطلع سر دیوان '' ہے ، مگر اس سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ دیوان مولف نے دیکھا تھا ، یہ الفاظ تذکرہ میر حسن میں ہیں اور میر حسن کے کل اشعار تذکرے سے ماخوذ ہیں ۔ (۷) خیرالدین محمد حسرت کے اشعار فارسی مظہرالغرائب سے منقول ہیں ۔ ص ٦٥ - (۸) میرزا محمد حسین حسینی دہلوی اصفہانی الہ آباد پہنچے تھے اور وہیں فوت ہوئے ، مولف کے بھائی سے ''بغایت مربوط'' تھے ۔ ص ۷۰ - (۹) بنگالی لعل خوشدل کا بنگالی ہونا اور پٹنہ میں بفراغ بالی زندگی بسر کرنا، ٹھا کرداس ضمیر کے حوالے سے لکھا ہے ۔ ص ۷۴ - (۱۰) خادم عظیم آبادی سے ملاقات نہیں ہوئی ، دوستوں سے ان کی بہت تعریف سن کر مولف ان سے 'غائبانہ' محبت کرنے لگے تھے ۔ ص ۷۵ - (۱۱) خادم متوطن بیر بھوم کو مولف سے محبت تھی ۔ ص ۷٦ - (۱۲) درد کے ایک دھرے کی شان نزول بقول ''شخصے'' مصنوعی روایت معلوم ہوتی ہے ۔ ص ۷۷ - (۱۳) غلام احمد دوست پٹنہ میں مولف سے ملا کرتے تھے اور اپنے اشعار پڑھا کرتے تھے ۔ ص ۸۱ - (۱۴) سرب سکھ دیوانہ جس زمانے میں میر بحر الہ آباد تھے ، مولف نے '' اکثر اوقات '' انہیں دیکھا ۔ ص ۸۱ - (۱۵) آسا رام ذوق غازی پوری کلکتہ میں مولف کے بھائی کے اوصاف سن کر '' بہ ذوق شوق تمام شرف اندوز ملازمت '' ہوئے ۔ اشعار منقولہ '' بطریق یادگار نذر مولف '' کہے تھے ۔ ص ۸۳ - (۱٦) رستم علی رستم الہ آباد میں بیتاب سے اصلاح لیتے تھے ، دکن گئے ۔ غازی پور میں ایک 'شخص' نے رستم کے بنگالہ جانے کا ذکر کیا ۔ ص ۸۴و۸۵ - (۱۷) راسخ عظیم آبادی مولف سے 'اکثر' ملتے تھے اور اُن سے بہت محبت کرتے تھے ۔ ص ۸٦ - (۱۸) جعفر خاں راغب '' در وقت قیام گرامی برادر ...در...عظیم آباد عجبت تمام راغب ملاقات آں جناب شدہ ، دوستی تمام بہم رسانیدہ اکثر بملاقات خود راحت اندوز می‌ساخت '' ۔ ص ۸۹ - (۱۹) تدبیرعلی خاں رضا مولف سے اکثر ملاقات کیا کرتا تھا ۔ ص ۹۱ - (۲۰) رفعت الہ آبادی کے ترجمے میں ان سے ملاقات کا ذکر نہیں ، لیکن یہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ مولف شورش سے انہیں کے یہاں ملا کرتا تھا (رجوع بفصل ۷) ۔ (۲۱) ایک شعر زوار غازی پوری کا منصف غازی پوری سے سن کر درج تذکرہ کیا ۔ ص ۹٦ - (۲۲) مؤلف سودا سے لکھنؤ میں ۱۱۹۱ھ میں ملا اور ''زیادہ از شنیدہ'' پایا ۔ ایک حکایت جس کا آغاز '' گویند '' سے ہے یہ ہے :

سودا ایک دن میر ماشاءاللہ سے ملنے گئے ، اثنائے گفتگو میں '' صحبت

ناچاق '' ہوئی ، وہ متلون مشہور ہیں ، سودا نے فی البدیہہ ان کی ہجو میں چند شعر کہے جن میں سے ایک مسرت میں ہے :

دم میں تولا ہیں دم میں ماشا ہیں
میر کیا ہیں عجب تماشا ہیں　　(ص ۹۷)

یہ حکایت کہیں اور میری نظر سے نہیں گزری ، اور یہ شعر یا اس کے ساتھ کا کوئی اور شعر پچیس تیس نسخے کلیات سودا کے جو میں نے دیکھے ہیں ، ان میں نہیں ، کسی اور کتاب میں بھی یہ شعر نہیں ملتا ۔

مولف نے معارضہ سودا و ضاحک کے متعلق لکھا ہے کہ سودا نے جو مجویہ مخمس (مصرع ۱: ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا) لکھا تو میر حسن نے بڑی منت و الحاح سے التجا کی کہ اسے شہرت نہ دیں ، لیکن سودا کی سعی اخفا کے باوجود مشہور ہوگیا (ص ۹۸) ۔ اس حکایت کے قبول کرنے میں مجھے تامل ہے ۔ (۲۳) سجاد کا شاگرد مضمون ہونا سجاد کے دوست میر مہدی سے معلوم ہوا ۔ ص ۱۰۶ ۔ (۲۴) میر رحمت اللہ سویدا سے مرشد آباد میں '' اکثر '' ملاقات ہوتی تھی ، مولف نے ان کے اشعار مانگے ، سویدا نے بڑی معذرت کے ساتھ فارسی عبارت نثر کے ساتھ دی ، نظم و نثر ہر دو درج مسرت ہیں ۔ ص ۱۰۹ ۔ (۲۵) شورش کا دیوان بقول مولف مرتب تھا ، لیکن اشعار مندرجۂ مسرت شورش کی زبان سے سنے تھے ۔ ص ۱۱۲ ۔ (۲۶) جوشش کے دیوان کے بارے میں لکھا ہے کہ مرتب ہے لیکن '' وقت تالیف نزد مولف حاضر نبود '' ۔ ص ۴۵ ۔ اشعار مندرجہ کہاں سے لائے یہ نہیں لکھا ۔ (۲۷) خواجہ عاصم خاں شور پسر خواجہ محمدی خاں '' وے را مؤلف یک بار در عظیم آباد دیدہ و اشعار............ ..... از زبانش شنیدہ '' ۔ ص ۱۱۶ ۔ یہ نہیں بتایا کہ اشعار مندرجہ وہی ہیں جو ان سے سنے تھے یا کسی اور ذریعے سے حاصل ہوئے تھے ۔ (۲۸) غلام حسین شہید غازی پوری کے بارے میں لکھا ہے کہ منصف غازی پوری ان کی تعریف کرتے تھے ۔ تحفۃ المومنین کا نظم کرنا بھی ظاہرا انہیں کی زبانی لکھا ہے ۔ ص ۱۱۷ ۔ (۲۹) صانع بلگرامی کے دو شعروں کے متعلق لکھا ہے کہ ایک شخص سے سنے (مطلع : قوافی استخوان ، نشان ، ردیف اپنا ۔ شعر دیگر: نا مہرباں قافیہ ، ردیف اپنا) مگر جہاں تک مجھے یاد ہے یہ دونوں تذکرۂ گردیزی میں ہیں ۔ (۳۰) صمصام الدولہ متخلص بہ صمصام کے متعلق لکھا ہے کہ نہ جانے یہ صمصام الدولہ خاندوراں محمد شاہی ہیں یا کوئی اور شخص ۔

ایک شعر ان کے نام سے کسی جگہ دیکھا تھا ، یاد رہ گیا " نزدیک ہے خزاں کا ہوئے گذر چمن میں ... الخ" - ص ۱۲۰ - تذکرۂ گردیزی میں ان کا ذکر ہے ، مگر جہاں تک مجھے یاد ہے صمصام تخلص اس میں درج نہیں اور نہ اس کی کوئی قابل قبول شہادت موجود ہے - یہ شعر غالباً اس تذکرے میں ہے۔ (۳۱) میر ضیا سے "اکثر" پٹنہ میں ملنا ہوتا تھا۔ ص ۱۲۳ - (۳۲) ٹھاکر داس ضمیر نے اپنے اشعار ریختہ خود لکھ کر مرشد آباد میں دیے تھے - ص ۱۲۵ - مولف نے ضمیر کا ایک فارسی قصیدہ درج کیا ہے ، مگر اس کے ماخذ کا ذکر نہیں کیا - (۳۳) مرزا ظہور علی ظہور مقیم مرشد آباد " باستماع اوصاف گرامی برادرم ... از کمال قدر شناسی و فقرا پرستی برائے ملاقات آمد و محبت بسیار نمود" - ص ۱۲۹ - (۳۴) شیو سنگھ ظہور "ایں چند اشعار از دیوان اوست" - ص ۱۳۳ - مگر اشعار جہاں تک مجھے یاد ہے وہی ہیں جو تذکرہ گردیزی میں ہیں ، یہ بعید از قیاس ہے کہ اس شاعر کے دیوان سے لئے ہوں - (۳۵) میر اعظم اعظم دہلوی برادر خرد میر محمد معصوم ، مولف سے مرشد آباد میں ملاقات ہوئی - ص ۳۶ - (۳۶) عبداللہ عبد وارد مرشد آباد ، انہیں مولف سے محبت تھی - ص ۱۳۷ - (۳۷) رائے بھکھاری داس عزیز الہ‌آباد میں تھے تو اکثر ان پر نظر پڑتی تھی - ص ۱۳۹ - (۳۸) سید ہدایت علی خاں عاشق سے کلکتہ میں " اکثر " ملاقات ہوئی - ان کے دیوان کا ذکر کیا ہے ، لیکن صراحتاً یہ نہیں لکھا کہ اشعار اس سے ماخوذ ہیں- (۳۹) غلام حسین خان مقیم بنارس "بکمال محبت و سلوک مودت پیش می آید" - ص ۱۴۷ - (۴۰) میر شمس الدین فقیر کے ایک شعر :

ترا منہ دیکھ بلبل گل ستی بیزار ہو جائے
اگر گل تجھ تلک پہنچے گلے کا ہار ہو جائے

کے متعلق لکھا ہے " شاہ قدرت اللہ کہ از ہمنشینان وےست میگفت کہ عزیزی از دوستانش تالیف تذکرۂ شعرائے ریختہ داشت ، ازو استدعائے شعرے کرد بدیہہ ایں شعر گفتہ فرستاد " - ص ۱۵۰ - یہ شعر جس تذکرے میں سب سے پہلے آیا ہے وہ قائم کا تذکرہ ہے ، اس میں یہ باتیں درج نہیں ، مزید یہ کہ شاہ قدرت اللہ سے جیسا کہ ترجمۂ قدرت میں ہے ملاقات نہ تھی - یہ بات مولف نے قدرت سے نہیں ، کسی اور شخص سے سنی ہوگی - (۴۱) فغاں اور ایک رنڈی کے متعلق حکایت جس کا آغاز " خود می

گفت'' سے ہے۔ ص ۱۰۱ - مگر فغان مولف کے ورود پٹنہ سے کئی سال قبل مر چکے تھے اور فغان الہ آباد گئے بھی ہوں گے تو اس وقت مولف برس دو برس کا ہو گا - دیوان فغاں کی شہرت کا ذکر ہے لیکن یہ نہیں کہ اشعار کہاں سے لئے- (۴۲) مرزا محمد علی فدوی سے پٹنہ میں اکثر ملاقات ہوتی تھی ، مولف سے '' کمال محبت '' - ص ۳۰ - ذیل ترجمہ قمر الدین منت میں مولف نے ایک غزل کے متعلق جس کے قوافی سالوسی ، مایوسی ، طاؤسی وغیرہ ہیں اور ردیف ' ہے ' لکھا ہے : ''پیش ازیں از اکثر مردم شنیدہ بودم کہ ایں ریختہ از نتائج فکر گنا بیگم ..است و او هم منت تخلص می نماید ، لیکن چون در عظیم آباد تذکرہ ابن سخن مرزا فدوی درمیان آمد گفت کہ منت تخلص میرزا (خود مولف نے اس سے قبل و بعد میر لکھا ہے اور یہی درست ہے) قمر الدین است و نیز ایں اشعار زاد ہائے طبع اوست ، لہذا ... در ذیل احوال میر نوشتم'' - ص ۲۱۳ - (۴۳) فرحت اللہ فرحت کے دیوان فارسی و ریختہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ضائع ہو گئے - اشعار مندرجہ فرحت کے دوستوں سے سنے - ص ۱۶۰ - (۴۴) میرزا فدا علی فدا ''از فدائیان فدوی'' پٹنہ میں ان سے ملاقات کے لئے آئے اور چند شعر بطور ھدیہ دئے ظاہرا وھی منقول- ص ۱۶۵- (۴۵) فضائل علی خاں کی مثنوی کے متعلق لکھا ہے '' وقت تحریر تمام مثنوی باخود نبود ، مگر چند اشعار کہ از ایام خرد سالی ازبر بود می نگارد '' ص ۱۶۷ - اس کے ۷۹ اشعار مسرت میں ہیں جن میں سے ۲۱ تذکرہ میر حسن میں بھی ہیں، ۴۶ جو مسرت میں زیادہ ہیں کہیں اور نہیں ملتے- (۴۶) قدرت کے بارے میں رجوع بہ ۴۰ - مولف کی درخواست پر اپنے اشعار خود لکھ کر بھیجے - ص ۱۷۳ - مسرت میں ظاہرا وھی اشعار - (۴۷) برکت اللہ قرین کے متعلق لکھا ہے کہ برسوں یقین کے ھمنشین رہے ، اور خود ان کی زبانی یقین کے ادعا پرانھیں کی غزل کی زمین میں شعر پڑھے (ردیف ' کیا قدرت ') اور قرین کے عشق کا واقعہ لکھا ہے - ص ۱۷۴ و ۱۷۵ - مگر صراحتاً یہ نہیں لکھا کہ مولف سے کہتے تھے یا کسی اور شخص سے مؤلف کو معلوم ہوا - (۴۸) علی نقی کافر دھلوی '' در ھنگامے کہ ھمراہ ... عالی جاہ (میر قاسم) وارد الہ آباد شدہ بود اکثر جہت ملاقات مہین برادر مولف ... می آید و اشعار خود میخواند ... ایں چند اشعار او بر صفحہ سینہ مرقوم بود '' - ص ۱۷۸ - ظاہرا مولف نے خود کافر کی زبان سے سنے - ان میں ایک رباعی '' نت میکدے میں پھرے ہے

مٹکی مٹکی... الخ" بھی ہے (ص ۱۷۹) جو دوسروں کی طرف بھی منسوب ہے۔ (۴۹) مظہر۔ جان محمد ناتواں کی زبانی لکھا ہے کہ شہادت مظہر کے بعد ان کے بعض دوستوں نے دیوان مظہر کو اس ارادے سے کھولا کہ جو شعر "سر صفحہ" نکلے وہ "کتابہ لوح مزار" بنایا جائے، کرامت دیکھئے کہ یہ شعر نکلا :

بلوح تربتم از غیب پیدا ہست تحریرے

کہ ایں مقتول را جز بےگناھی نیست تقصیرے (ص ۱۸۳)

مصنوعی حکایت معلوم ہوتی ہے۔ (۵۰) محزوں کا فارسی قصیدہ مولف کو "ازبر" تھا، تذکرے میں ہے۔ ص ۱۹۲۔ (۵۱) مضمون کے متعلق "گویند" سے ایک حکایت شروع ہوتی ہے کہ مرض الموت میں روز وفات ان کے دوست ان کے پاس جمع تھے اور ان میں سے ہر ایک "شدائد قیامت" کا ذکر کر رہا تھا "حالت احتضار میں آنکھ کھولی یہ شعر پڑھا اور فوراً مر گئے :

شور محشر ستی واعظ نہ ڈرا مضموں کو

ھجر کے صدمے اٹھاتا ہے قیامت کیا ہے (ص ۱۹۸)

اس حکایت کے مصنوعی ہونے میں کچھ شک نہیں۔ (۵۲) خواجہ بخش منتظر شاگرد بیتاب آلہ آبادی مؤلف کے زمانۂ اقامت پٹنہ میں ایک انگریز کے ساتھ وارد ہوئے، مؤلف کو معلوم ہوا تو ملنے کا اشتیاق ہوا مگر وہ خود اس کے برادر بزرگ کے وھاں ہونے کی خبر سن کر آ گئے "خیلے خلیق و متواضع و یار باش... دیدم و از سخنوران عظیم آباد تعریف خوشگوئی بسیار شنیدم و قطع نظر از شعر گوئی شعر خوانی او بدل ناخن میزند"۔ ص ۲۰۷۔ مولف نے صراحتاً یہ نہیں لکھا کہ اشعار مندرجہ کہاں سے لئے۔ (۵۳) مشتاق عظیم آبادی۔ کہتے ہیں کہ دواوین ریختۂ شاعران ہندوستان و عظیم آباد و مرشد آباد جمع کئے ہیں اور تذکرہ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ص ۲۰۹۔ جمع دواوین کا ذکر دوسری جگہ بھی دیکھا ہے، لیکن ارادۂ تذکرہ نویسی صرف مسرت سے معلوم ہوتا ہے۔ مشتاق کا کوئی تذکرہ یا مجموعۂ اشعار موجود نہیں۔ (۵۴) میر ماشاء اللہ مصدر۔ مولف مصدر سے لکھنؤ میں ملا تھا، یہ صراحت نہیں کی کہ ۱۱۹۱ء یا ۱۱۹۴ھ میں۔ وہ لکھتا ہے کہ نکتہ فہمی و حاضر جوابی میں یگانۂ زمانہ ہیں، لیکن زیادہ گوئی

نے ان کے کمال کو مکدر کر دیا ہے - اپنی عمر سو سال کے قریب بتاتے ہیں لیکن دیکھنے میں جوان ہیں - ان کا قول ہے کہ ہمارے خاندان میں کوئی صد سالہ مرتا ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ جوان مرا - '' اکثر از جودت طبیعت اشعار نامربوط منتظم می سازد ، و بیت ہزاری و دو ہزاری و چہار و پنج و علی ہذا لقیاس نام می گذارد - لہذا اشعارش* کہ خالی از چاشنی و لطافت نیست آن ہم بے اعتبار گردیدہ ... روزے در لکھنؤ اتفاق رودادہ بود در اثنائے آن ابیات چہار ہزاری و پنج ہزاری ایں چند اشعار خواند کہ پسند طبع افتاد :

قاصد اشک نہ استاد کہ ہر سم خبرے
گرم از وادی' دل آمد و بیتاب گذشت

باز دل شد اسیر دام کسے　　رفت از خویش و گفت رام کسے
نیم بسمل گذاشت صیادم　　وائے بر کار ناتمام کسے

اشعار ہندی وے نیز از ہمین قبل است'' برہمی وضع بنگالہ کے بعد ' ہندوستان ' گئے اور شجاع الدولہ کی سرکار میں ''اقتدار کلی'' اور کمال تقرب حاصل کیا - ان کی موت کے بعد آصف الدولہ کی سرکار میں رہے - ۱۱۹۴ھ میں '' کشیدہ خاطر'' ہو کر لشکر نجف خاں میں چلے گئے :

تیرے نقش قدم کو لائیے گا　　کعبہ اپنا الگ بنائیے گا

مسی کی دھڑی اوپر کیا پان کی لالی ہے
شبخون کے کرنے کو یہ وضع نکالی ہے
(ص ۲۱۱ و ۲۱۲)

اشعار نا مربوط کو منتظم کرنے سے کیا مراد ہے ، واضح نہیں -
(۵۵) گنا بیگم زوجہ نواب عماد الملک - مقبول نبی خلف یقین سے جو حرم نواب میں پرورش پائے ہیں ، معلوم ہوا کہ اوائل میں گنا بیگم کا تخلص

منت تھا - میر قمر الدین کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کا یہ تخلص ہے تو اسے ترک کیا اور مقاطع میں تخلص نہیں لاتیں - ص ۲۱۳ -

گنا بیگم صبیہ' علی قلی خاں والہ داغستانی " در اہامیکہ نواب از جینگر بہ گوھد می آید وے نیز چوں جان با جسم ھمقرین نواب بود ، اتفاقاً در نور آباد کہ مابین گوھد و گوالیار واقع است سواری' بیگم قدرے پیشتر از سواری' نواب رسید ، بیگم از آبدار آب طلبید ... آبدار از چاہے کہ بر سر راہ بود قدرے آب برآوردہ کذرانید خوردنش ھماں بود و جاں دادنش ھماں ... نواب بعد رحلتش... رسید ... نعش وے را ھماں جا امانت گذاشتہ بہ گوھد آمد بعد مدتے از آں جا نقل نمودہ بہ دھلی فرستاد ... بیگم در سلیقہ' شاعر زیب النسائے مجالس نکتہ دانی بود و در شیوہ' حاضر جوابی نور جہان ثانی ... در اشعار وے بسیار اختلاف است ، مردم اشعار میر سوز اکثر بنام وے میخوانند ، روزے مذکور ایں معنے از میرزا مقبول نبی نمودم ، وے بیاض مسودہ' دست بیگم آوردہ بمن نمود ، ازیں چند اشعار ازو برچیدم :

جس(۱) طرح لگی دل کو مرے چاہ کسو کی
اس طرح نہ لگیو مرے اللہ کسو کی
اب زلف دراز اپنی کو ظالم نہ گرہ دے
کیا فائدہ جو عمر ہو کوتاہ کسو کی

—————

بلبلو (۲) تم کو وہ گل زار مبارک ہووے
ہم کو وہ سایہ' دیوار مبارک ہووے

—————

ایک تو رسوا کیا عالم میں تیری نیہہ نے
دوسرے سننے پڑے لوگوں کے طعنے میہنے

—————

اس کا پیغام (۳) مجھے کھونکہ زبانی آوے
نام سنتے ھی مرا جس کو گرانی آوے

۱- اس زمین کے دو شعر اور
۲- اس زمین کے چار شعر اور
۳- اس زمین کے دو شعر اور

اشک امڈا ہو تو پھر ضبط سے کم رُکتا ہے
ناصحا اٹھ مرے بالیں سے کہ دم رُکتا ہے

زلف کا کھولنا بہانا ہے(۱)
مدعا ہم سے منہ چھپانا ہے

شب کو طلب(۲) میں تیری تپاں ہم بھٹک بھٹک
جوں حلقہ در پہ رہ گئے سر کو پٹک پٹک

یوهیں جو تپش دل پہ ہر اک آن رہے گی
پھر کاہے کو اس دکھ سے مری جان رہے گی

مت کر (۳) خیال دل تو رخ و زلف یار کا
دن اور رات جمع ہوں بارے کہاں کہاں

مختلف زمینوں کے نو اشعار کے بعد '' گویند روزے عماد الملک در خواب بود بر بالین وے بیگم آمد، چوں غافل دید برگشت ، نا گاہ نواب بیدار شد و ایں مصرع بدیہہ خواند 'آ کر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے' بیگم فی الفور گفت 'خواب عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے' بعد ازیں ریختہ را تمام کرد'' اس زمین کے ۴ اور شعر جن میں سے ایک یہ:

کیا سحر تھا نہ جانیو گلشن میں آن کر
بلبل کو گل کی شکل سے بیزار کر چلے

مجھے یاد آتا ہے کہ ایک انگریزی کتاب میں دیکھا ہے کہ گنا بیگم کی قبر نور آباد میں ہے اور ''غم گنا بیگم'' = ۱۱۸۳ سے تاریخ وفات نکلتی ہے ۔ کل اشعار منسوب بہ گنا بیگم اسی کے ھیں یا ان میں دوسروں کے اشعار بھی شامل ھیں ، یہ بحث '' آوارہ گرد اشعار '' میں ہوگی ۔ '' کر چلے'' والے

۱- اس زمین کا ایک شعر اور

۲- اس زمین کا ایک شعر اور

۳- بارے قافیہ ، اس زمین میں دو شعر اور

شعر کے متعلق جو حکایت ہے وہ ظاہر ہے کہ مجموعۂ اشعار میں نہ ہوگی، اور ظاہرا اس کا راوی بھی مقبول نبی نہیں کوئی اور شخص ہے۔ یہ بعض دوسری کتابوں میں ہے، مگر اس کے مصنوعی ہونے میں شک نہیں۔ 'کر چلے' ردیف والے دو شعر جو میں نے نقل کئے ہیں اس زمین کے ایک اور شعر کے ساتھ جو مسرت میں نہیں، تذکرہ میر حسن میں عظیم شاگرد سودا مقیم فرخ آباد کے نام سے درج ہیں (۵۶) محمدی بیگم کے دو شعر بحوالۂ ولی اللہ محب درج ہیں۔ ص ۲۲۲۔ (۵۷) مقبول نبی مقبول سے فرخ آباد میں ملاقات ہوئی تھی اس کا ذکر گنا بیگم کے سلسلے میں آیا ہے مگر خود اس شاعر کے تذکرے میں اس کا ذکر نہیں، اور نہ یہ کہ اشعار کہاں ملے۔ (۵۸) ولی اللہ محب نے اشعار مندرجہ فرخ آباد میں "بطریق ہدیۂ دوستانہ" مولف کی نظر سے گزرانے تھے۔ ص ۲۱۰۔ (۵۹) شیخ فتح (علی) منصف غازی پوری "با مولف بسیار مربوط است"۔ ص ۲۲۳۔ (۶۰) میر مہدی دہلوی، بعد خرابی دہلی وارد الہ آباد ہوئے، طب میں "حذاقت کلی" اور تصوف کا ذوق رکھتے ہیں۔ شاعر فارسی و ریختہ، "تمام دیوان حافظ" کا تتبع کیا ہے اور غزل کے برابر غزل لکھی ہے۔ مضمون کے شاگرد ہیں۔ ان کے "مہین برادر" میر محمد عسکری مرشد آباد میں "کمال عزت و امتیاز" کے ساتھ بسر کرتے ہیں اور طب میں مسیحائی سے کام لیتے ہیں، وقت ورود مرشد آباد ان کی زیارت سے دل شگفتہ ہوا، لیکن سخت حیران ہوں کہ اس "جاہ و ثروت" کے باوجود وہ اپنے "مہین برادر" کے حال سے غافل کیوں ہیں۔ "میر موصوف" کی زبانی سنا کہ وہ بھی شعر فارسی برجستہ و خوب کہتے ہیں، یہ شعر ان کا ہے:

چرخ خونخوار کو لوہو میں ڈبونے نہ دیا
ناصحوں نے مجھے دل کھول کے رونے نہ دیا

اس کے چند اشعار اس عبارت کے ساتھ "این چند اشعار نتائج میر مہدیست" ان اشعار میں یہ بھی ہے:

مرا احوال سن فرہاد رو دے		وہ اپنا کھودنا پتھر کا کھودے
(ص ۲۲۵ و ۲۲۶)

مولف نے ایک جگہ میر مہدی اور دوسرے میر محمد عسکری کو "مہین برادر" لکھا ہے تو یہ حیرت کی جگہ ہے، لیکن قرینہ ہے کہ یہ کتاب کی

غلطی ہے۔ "میر موصوف" سے ظاہر میر مہدی مراد ہیں ، اور "چرخ الخ" میر محمد عسکری کا شعر ہے ، لیکن مقتضائے مقام یہ تھا کہ یا تو فارسی و ریختہ دونوں لکھنے کا ذکر ہوتا یا فارسی شعر ہوتا ۔ آخری شعر "مرا احوال الخ" تذکرۂ میر حسن میں بنام مرزا مہدی جن کا ذکر ذیل متوسطین میں ہے، میر حسن نے ان کے بارے میں صرف یہ لکھا ہے "شخصے بود"۔ (۶۱) دیوان محمد علی نالاں کا ذکر آ چکا ہے (رجوع بفصل ۷) صرف ایک شعر کے بارے میں صراحتاً لکھا ہے کہ دیوان میں دیکھا ۔ ص ۲۲۷ - (۶۲) جان محمد ناتواں جونپوری مقیم پٹنہ "روزے استدعائے اشعار او نمودم ایں چند (اشعار) بدیہہ انشا فرمود ، بپاس حقے کہ ہر مولف دارد خالی بودن ایں تذکرہ از ذکر وے گوارا نہ کردم ... یک شعر فارسی نیز روزے بنام میخواند فی الحقیقت ... برابر ہزار بیت است :

آفریں بر ہمت خس آستیں ہر کو گرفت

یا سلامت بر کنارش برد یا ہمراہ رفت" (ص ۲۲۸)

(۶۳) مبارک پسر قدرت کے ترجمے مس لکھا ہے کہ ان کا تخلص والا سنا تھا ، علی ابراہیم خاں سے معلوم ہوا کہ والہ ہے ۔ ص ۲۳۲ - (۶۴) مرزا محمد علی ولی شاگرد فدوی سے مرشد آباد میں ملاقات نہ ہوئی لیکن وہاں کے لوگوں سے ان کی تعریف سنی - ولی نے چند اشعار ایک دوست کی معرفت بطریق ہدیہ مولف کو بھیجے ، ان میں سے (ازاں جملہ) کچھ درج تذکرہ ص ۲۳۹- (۶۵) دیوان یقین "در چار طرف ہندوستان اظہر من الشمس گردید"۔ ص ۲۴۱ - (۶۶) میر عزت اللہ یکدل کے اشعار جو درج تذکرہ ہیں ، ان کے بیٹے سوپدا سے مرشد آباد میں ملے - ص ۲۴۳ - (۶۷) منصف کا ایک شعر (ذیل ترجمۂ یحیائی) ان کی تحریک سے درج - ص ۲۴۴ -

[۹]

حسب ذیل شعرا کا ذکر مسرت سے قبل کے کسی تذکرے میں جو میری نظر سے گزرے نہیں ہے - میں مبتلا و شورش کے تذکروں کو زماناً مقدم اور گلزار ابراہیم کو موخر سمجھتا ہوں ۔ اضطراب (ص ۱۳) صابر علی اظہر شاگرد مظہر (ص ۲۵) بنیاد (ص ۳۴) مفتی برکت اللہ (ص ۳۶) تصور (ص ۴۰) عطا حسین خاں تحسین (ص ۴۱) خیر الدین محمد حسرت (ص ۶۱)

میرزا محمد حسین حسینی (ص ۷۰) محمد شاہ حاضر صحبت یافتہ آرزو (ص ۷۱) بنگالی لعل خوشدل (ص ۷۴) حیدر علی خادم (ص ۷۶) رستم علی رستم (ص ۸۴) تدبیر علی خاں رضا (ص ۹۱) زوار غازی پوری (ص ۹۶) سویدا (ص ۱۰۹) کرم علی خاں شہید (ص ۱۱۴) امر سنگھ شائق (ص ۱۱۸) شیخ محمد اشرف صواب سید پوری شاگرد مصیب - متوفی ۱۱۹۲ھ مولف - نے صواب کے جو اشعار دئے ھیں ، ان میں یہ بھی ہے :

آ بیٹھو تو دو باتیں کریں تم سے میاں ھم
پھر دیکھئے اک دم میں کہاں ھم ھوں کہاں تم

(ص ۱۱۸ و ۱۱۹)

یہ شعر تذکرہ میر حسن میں بنام محمد اشرف جس کا تخلص درج نہیں - میر حسن نے اس کا حال یہ لکھا ہے " از مردم مرشد آباد بداروغگی اخبار فرنگی جان برسٹو صاحب سرفراز است ، طبع موزونی دارد ، یک بشیر نامہ گفتہ است ، کمتر ھندی و بیشتر فارسی میگوید ، خدایش سلامت دارد " میر حسن نے ذاتی طور پر جاننے کی صراحت تو نہیں کی ، لیکن یہ بعید از قیاس نہیں - محمد اشرف صواب یقیناً محمد اشرف صاحب بشیر نامہ سے مختلف ہے - شعر کا موخر الذکر کی طرف انتساب درست معلوم ھوتا ہے - صلاح الہ آبادی (ص ۲۱) ٹھاکر داس ضمیر جوان بنگالی نژاد ، انگریزی زبان میں " مہارت کلی " (ص ۱۲۴) مولف چونکہ خود انگریزی سے واقف نہیں ، اس کے سرٹیفکٹ کا کچھ وزن نہیں - انگریزی جانتا ھوگا ، لیکن " مہارت کلی " کے بارے میں تو وھی شخص کہہ سکتا ہے جو اس زبان کو اچھی طرح جانتا ھو - میر اعظم اعظم کا ذکر ردیف ع میں ہے (ص ۳۶) کہیں ایسا تو نہیں کہ تخلص در اصل عظیم ہے - ھدایت علی خاں ، عاشق (ص ۱۴۰) زین الدین عشق (ص ۱۴۳) سعداللہ خاں عاشق (ص ۱۴۴) محمد اسلم غم (ص ۱۴۵) کلب علی غیرت (ص ۱۴۵) غلام حسین خاں (ص ۱۴۶) فدا علی فدا (ص ۱۶۴) عبداللہ خاں ساری مسافر تخلص (ص ۲۱۳) تذکرہ میر حسن میں ایک شاعر مسافر کا ذکر ہے جس کا نام تک میر حسن کو معلوم نہیں ، ان کے تذکرے میں جو شعر ہے وہ مسرت میں نہیں - مقبول نبی مقبول (ص ۲۱۶) گنا بیگم (ص ۲۱۷) محمدی بیگم (ص ۲۲۲) فتح علی منصف (ص ۲۲۳) میرزا ابراھیم مشتاق بنارسی " این چند اشعار

وے بر السنہ' مشتاق اہی مشہور است'' (ص ۲۲۴) ان میں شعر ذیل بھی جو تذکرہ میر حسن میں واجہ رام نرائن موزوں کے نام سے ہے:

غزالو تم تو حاضر ہو کبھو مجنوں کے ماتم میں
دوانا مر گیا جس وقت میخانے پہ کیا گزرا

(کذا ، ص ۲۲۵)

میر محمد عسکری ، ذیل ترجمہ' میر مہدی (ص ۲۲۵) امام بخش نہاں (ص ۲۲۷) جان محمد ناتواں (ص ۲۲۸) نظام الدین نادر (ص ۲۳۰) نرنجن (ص ۲۳۲) عبداللہ عبد (ص ۱۳۷)

[۱۰]

مولف سے اس کی توقع کہ واقعات کی چھان بین یا اشعار کے انتساب میں دوسرے تذکرہ نگاروں سے زیادہ محتاط ہوگا بیکار ہے۔ غلط انتساب کے متعلق تو '' تحفتہ '' میں اس نے عذر بھی کیا ہے '' در تصحیح اشعار (و) لرقیم آں تحت احوال ناظمانش اہتمام عظیم بکار بردم وے چوں اتفاق تطبیق از دواوین شان نیفتاد ، اگر شعر یکے در ذیل شعر دیگرے مذکور شود قصور ناقل است نہ تقصیر مولف '' ۔ مولف کی اغلاط کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔ استقصا کی کوشش نہیں کی گئی ہے —

بات کیجے غور سے اور ہم سے منہ کو موڑیے
ٹک خدا سے ڈریے ان وضعوں کو اپنی چھوڑیے
منہ نہ موڑے گا یہ عاصی گر یہی منظور ہے
لیجئیے سنگ جفا اور شیشہ' دل توڑیے

بنام آفتاب (ص ۷) ، ماہر پسر اشرف علیخاں کے اشعار ہیں ۔

ذی قعدہ کا چاند دیکھنے کے ساتھ بادشاہ کسی گورے لڑکے کو دیکھنا چاہتے تھے ، علی وردی خاں نے کہا کہ امیر خاں انجام اپنے صاحب زادے کو بلا رکھیں ۔ انجام نے کہا کہ حاضر ہے ، لیکن آئیندہ ماہ کے لئے علی وردی خاں صاحبزادی کو تیار رکھیں (ص ۹) ۔ انجام لاولد تھے، قصہ مصنوعی ہے۔

انجام کے والد نے ان سے کہا کہ اپنی ماں سے جا کر کہو کہ بن سنور کر میری منتظر رہیں ۔ انجام نے کہا اگر وہ مصروف ہوں تو دادی سے کہوں گا (ص ۹) ، یہ بھی مصنوعی ہے ۔

میں کہاں تو کہاں یہ کہتے ہیں　　کہ یہ آپس میں دونوں رہتے ہیں
ایک بوسہ تو مجھ کو دو صاحب　　سنتے ہی منہ پھرایا لو صاحب

رباعی ''نہ دل کو قرار بے قراری کے سبب الخ'' دو مطلع اور یہ رباعی ان اشعار میں ہے جن کی نسبت مولف کا بیان ہے کہ الم سے سن کر درج تذکرہ کئے ہیں ۔ پہلا مطلع الم کے چچا اثر کا ہے اور دیوان اثر کے علاوہ بعض تذکروں میں بھی اثر کے نام سے ہے ، دوسرا دیوان سوز میں ہے ۔ رباعی تذکرۂ میر حسن وغیرہ میں بنام الم درج ہے ، لیکن درد کے نام سے بھی ملتی ہے ۔ یہ تذکرے ان کے ابتدائی زمانے کے ہیں ، ان کی پیدائش ۱۱۷۰ھ کی ہے ۔ (سناتھ سنگھ بیدار کا مجموعہ) کیا تعجب ہے اگر یہ اس زمانے میں اشعار کا سرقہ کوئی بڑی بری بات نہ سمجھتے ہوں ۔

احسن اللہ بیان (ص ۲۲) صحیح احسن الدین ۔

زادگاہ حزیں دہلی (ص ۵۵) ، شورش حزیں کے شاگرد نے لکھا ہے کہ اپنے والد کی شہادت کے بعد پٹنہ سے دہلی گئے اور نادر گردی کے بعد واپس آئے ۔ قائم نے انہیں از ''سادات اکبر آباد'' لکھا ہے ۔

خادم علی خاں خادم ساکن عظیم آباد (ص ۷۵) ، علی کی جگہ حسین چاہئے ۔

احمد علی خاں پدر خادم (ص ۷۵) ، خان نہ تھے ، تخلص قیامت دینا تھا ۔

فقیہہ درد مند (ص ۷۸) ، فقیہہ صاحب ، لفظ آخر جزو اسم ۔

رباعی ''از بسکہ حیا دوست ہے وہ مایۂ ناز الخ'' (ص ۷۹) ۔ یہ رباعی مولف نے درد مند کے نام لکھی ہے ، لیکن سید غلام نبی بلگرامی کی ہے (سرو آزاد ص ۲۹۱) ۔

غلام علی خاں راسخ (ص ۸۰) ، خاں نہیں چاہئے ۔

شب جو اس ماہ سے روشن مری آغوش ہوئی
شمع یاں تک ہوئی شرمندہ کہ خاموش ہوئی

بنام واسخ (ص ۸۶) ، غلطی سے ص ۲۶۹ میں بھی چھپ گیا ہے۔ دیوان راغب میں ہے اور دیوان واسخ کے کسی نسخے میں جو میری نظر سے گزرا ہے نہیں ہے۔

میر برہان رنگین (ص ۸۶) ، صحیح مرزا امان بیگ جو تذکرۂ میر حسن میں ہے۔

راغب ولد هدایت علی خاں (ص ۸۹) ، هدایت اللہ خاں صحیح۔

میر سعادت اللہ سعادت (ص ۱۰۸) ، سعادت علی چاهئے۔

میر محسن از فرزندان شیخ نصیر الدین چراغ دهلی (ص ۱۱۱) ، شیخ نصیرالدین چراغ دهلی کی اولاد هی نہ تهی ، میر محسن کہاں سے آ گئے ؟

میر ضیاء الدین ضیا (ص ۱۲۳) ۔ صحیح باضافہ حسین جیسا کہ دیباچۂ دیوان میر حسن میں میر حسن نے لکھا ہے۔

خواجہ برهان الدین عاصی دهلوی (ص ۱۳۳) میر برهان الدین آثمی (ص ۲۳)۔ دونوں ایک هیں ، کسی تذکرے میں عاصی ہے ، کسی میں آثمی ، ان دونوں میں صحیح کون ہے اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ عاصی غلط محض ہے۔

عارف علی خاں عاجز (ص ۱۳۹)۔ صحیح عارف الدین خاں جو تحفتہ الشعرا میں ہے۔

بھکاری داس عزیز (ص ۱۳۹) ۔ صحیح بھکاری لعل جو سفینۂ هندی میں ہے۔

فضائل علیخاں فضائل (ص ۱۶۵) ۔ میر حسن نے بے قید تخلص لکھا ہے ، فضائل تخلص کا کوئی ثبوت موجود نہیں ۔ میں نے اگر اس کے خلاف کبھی کچھ لکھا ہے تو وہ کالعدم سمجھا جائے۔

محمد حسین محزون (ص ۱۸۸ و ص ۶۲) لیکن ص ۱۹۰ میں غلام حسین ۔ اس نام کے سلسلے میں مولف نے اس صفحے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے بعد اس کے صحیح ہونے میں شبہے کی گنجائش نہیں۔

محمد علی خاں مشتاق (ص ۲۰۹) ۔ علی کی جگہ قلی چاهئے جو دوسرے تذکروں میں ہے۔

نعیم اللہ مرزائی (ص ۲۲۱) ۔ ردیف میم میں جو اس پر مشعر کہ

مرزائی تخلص ہے، اگرچہ مولف نے اس کی صراحت نہیں کی ، لیکن ایسے اور شعرا بھی ہیں جن کے ذکر میں تخلص صراحتاً مذکور نہیں مثلاً عنایت علی مجنوں (ص ۲۰۸) ۔

حافظ علی ممتاز (ص ۲۲۳) ۔ صحیح حافظ فضل علی ممتاز (تذکرۂ قائم و میر حسن) ۔

محمد وارث نالاں (ص ۲۳۱) ۔ وارث کے بعد علی کا اضافہ ضروری ہے ۔ دوسروں کے تذکروں کے علاوہ دیوان جوشش کا مادہ تاریخ وفات " سید وارث علی نالاں " ہے ۔

مصطفیٰ خاں...یکرنگ (ص ۲۳۸) ۔ یکرنگ کے ایک مصرع میں مصطفیٰ خاں آیا ہے لیکن یہ ضرورت شعری سے ہے ۔ ان کے استاد آرزو نے تنبیہ‌الغافلین میں غلام مصطفیٰ لکھا ہے ۔ اور یہی ان کے معاصر حاتم کے دیباچۂ دیوان زادہ میں ہے ۔ ' خاں ' خود ان کے مصرع میں ہے ۔

سوز " گویند نازنین جوانیست خوشرو " (ص ۱۰۲) ۔ ۱۱۹۰ھ میں جب یہ تذکرہ مکمل ہوا ہے، سوز کم و بیش ۶۰ سال کے تھے ۔

شجاعت خاں ثابت (ص ۵۱) ۔ صحیح شجاعت اللہ خاں ثابت (تذکرۂ میر حسن) ۔

[۱۱]

بعض شعرا اور اشعار کے متعلق مولف کی ناقدانہ رائیں :

(۱) "میر رضا (عظیم آبادی) اشعار خوب خوب دارد لیکن فقیر ازو باین یک بیت بسیار راضی می شود :

امردوں کی ہوا ہوں حسرت میں
میں تو غلماں ہی لونگا جنت میں" (ص ۸۹)

(۲) صانع بلگرامی "این یک بیت او برابر ھزار بیت است :

پارہ گردد چو کتاں نامۂ عصیاں بر من
بر سر مہر گر آید مہ تاباں نجف " (ص ۱۱۹)

(۳) مرزا ظہور علی ظہور مقیم مرشد آباد " در زبان آوری نظمرش در منصۂ شہود جلوہ گر نشد و در خوشگوی٭ مثلش از عدم بہ ظہور نیامدہ " (ص ۱۲۹)

(۴) فقیر کا شعر فصل ۸ میں نقل ہوچکا ہے، اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ " برابر ہزار بیت است " (ص ۱۵۰) - مولف نے یہ بات ناتواں کے ایک شعر کے بارے میں بھی کہی ہے (فصل ۸)

(۵) یقین " مثل وے قابل و قابل پرست از کتم عدم بعرصۂ ظہور نیامدہ ... منظور نظر ... میرزا مظہر شدہ ... از فیض صحبتش شہباز فکر وے بصید معانی چنان بلند پروازی کردی کہ طائر خیال سامعان بدریافت کہنہ آں در نیم راہ باز ماندی و ہمائے اندیشۂ وے بر قلۂ کوہ سخن بطورے پرفشانی نمودی کہ طبع رسائی سخنوران بامید رسائی در پرتو سایہ‌ش ہر چند دویدے ولے از تیز پروازیش بجائے نہ رسیدی " (ص ۲۴۱)

[۱۲]

مولف نے " تختمہ " میں لکھا ہے " اگر در توصیف شعرا جہت رعایت نام و تخلص وے مبالغہ رفتہ یا در تعریف بعضے بواسطۂ عدم علم بر احوال وے تغافلے رودادہ محل مواخذہ نباشد چہ در آن طبع نو آموز نقد قابلیت برمحک امتحان میزند " ۔

مولف نے تخلص کی رعایت کرتے ہوئے شعرا کے متعلق غیر ذمہ دارانہ باتیں لکھی ہیں ، اور بعض اوقات بغیر رعایت بھی ایسی باتیں اس کے قلم سے نکلی ہیں ۔

(۱) اظہر، میر غلام علی : "دریں فن اظہر من الشمس گشتہ"۔ (ص ۲۲)

(۲) تحسین ، عطا حسین خاں : " در لطیفہ گوئی و حاضر جوابی عدیم المثال است و درگرم اختلاطی و یار باشی مثلش دریں عصر نا ممکن بلکہ محال"۔ (ص ۴۳)

* * *

کربل کتھا کا لسانیاتی تجزیہ

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ*

اردو (۱) کی ابتدا سے متعلق باقاعدہ تحقیق پچھلے تیس چالیس برسوں سے جاری ہے، لیکن یہ مسئلہ ابھی تک پوری طرح حل نہیں ہوا - اس کام میں سب سے بڑی دقت قدیم لسانی نمونوں کے فقدان کی وجہ سے پیش آتی ہے - اتنی بات بار بار دھرائی جاتی ہے کہ اردو کا باقاعدہ آغاز دھلی سے ہوا اور دھلی والوں ھی نے اس " ریختہ " زبان کو اردوے معلیٰ کے درجے تک پہنچایا - لیکن مشکل یہ ہے کہ دھلی لسانی اعتبار سے زبانوں کے سنگم پر واقع ہے - اس کے شمال مشرق میں کھڑی، جنوب مشرق میں برج، شمال مغرب میں پنجابی اور جنوب مغرب میں ھریانی بولی جاتی ہے، بحث طلب امر یہی ہے کہ ان میں سے اردو کی بنیاد کس بولی پر ہے- دھلی میں زیادہ اثر کھڑی ھی کا رہا ہے اور اردوے دھلی بھی صوتیاتی اور صرفی و نحوی لحاظ سے اس سے مشابہت رکھتی ہے - لیکن جب تک خود کھڑی بولی کی قدامت پوری طرح متعین نہ ہو جائے، یہ دعویٰ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا - مسلمانوں کی آمد سے سولھویں سترھویں صدی تک کا زمانہ ھندوستان کی تاریخ میں بڑی اھمیت رکھتا ہے - ھر چیز ایک وضع چھوڑ کے دوسری وضع پر آرھی تھی - اگر کہا جائے کہ اس تبدیلی کا سب سے

---

* ریڈر اردو، دھلی یونی ورسٹی، دھلی

(۱) میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا شکر گزار ہوں، جنھوں نے میری گزارش پر ان صفحات کو پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائی اور کہیں کہیں حواشی کا اضافہ کیا -

زیادہ اثر زبانوں نے قبول کیا تو بے جا نہ ہوگا ۔ مختلف بولیاں اس زمانے میں خام حالت میں تھیں ۔ قدیم سلطنتوں کا سیاسی انتشار ، نئی حکومتوں کا قیام ، فوجوں کا ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر آنا ، باشندوں کی نقل و حرکت ، نئے سیاسی مراکز کا قائم ہونا ، صوفیانہ سلسلوں کا فروغ اور بھگتی تحریک کا ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھا جانا ، ان سب عوامل کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف بولیوں میں اختلاط اور ارتباط کے مواقع بہت بڑھ گئے اور پرانی حد بندیاں ٹوٹنے لگیں ۔ نواح دھلی کی تقریباً سب بولیاں شورسینی پراکرت کی جانشین ہیں ، اس لحاظ سے بھی ان میں کچھ نہ کچھ ہم آہنگی ہونی چاہئے ، اس پر سیاسی اور سماجی تحریکوں کے اثرات مستزاد ۔ چنانچہ آج اردو کی بعض خصوصیات کا رشتہ ایک محقق هریانی سے جوڑتا ہے تو دوسرا کھڑی سے ۔ ایک هریانی کو پنجابی کی شاخ بتاتا ہے تو دوسرا اسے کھڑی کا جنوبی لہجہ کہتا ہے ۔ بیشتر ماہرین نے کھڑی کو اردو کی بنیاد تسلیم کیا ہے ، لیکن بعض حضرات اس کے برعکس خود کھڑی کو اردو سے ماخوذ بتاتے ہیں ۔ اس پیچدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کھڑی بولی کے قدیم نمونے دستیاب نہیں ۔ برج ، هریانی اور پنجابی اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ ان کے قدیم نمونوں کا سراغ لگانے میں کامیابی ہوئی ہے ۔ کھڑی بولی کا سلسلہ یوں تو بابا فرید شکر گنج (متوفی ۱۲۶۹ء - ۶۶۸ھ) اور خواجہ نصیرالدین چراغ دھلی (متوفی ۱۳۵۶ء ۷۵۷ھ) سے ملا یا جا سکتا ہے ، لیکن سیرالاولیا اور خیرالمجالس میں محض چند جملے یا اقوال ہی ملتے ہیں ۔ امیر خسرو (متوفی ۱۳۲۵ء - ۷۲۵ھ) مسلمہ طور پر زبان دھلوی کے پہلے شاعر ہیں ، لیکن ان کا جتنا کلام دستیاب ہوا ہے ، اس کی کوئی سند اب تک حاصل نہیں ہو سکی ۔ نام دیو (متوفی ۱۴۰۸ء) کبیر داس (متوفی ۱۵۱۰ء) اور گرو نانک (متوفی ۱۵۳۹ء) کے ہاں کھڑی بولی کی نشان دہی کی جاسکتی ہے ، لیکن یہ ان کی زبان کا غالب عنصر نہیں ۔ لے دے کے کھڑی بولی کے چند نمونے شیخ بہاء الدین باجن ، متوفی ۱۵۰۶ء - ۹۱۲ھ (" صفت دنیا بزبان دھلوی گفتہ ") چندر بھان برھمن ، متوفی ۱۶۶۲ء - ۱۰۷۳ھ (خدا جانے یہ کس شہر اندر ہمن کو لا کے ڈالا ہے) اور افضل جھنجھانوی (متوفی ۱۶۲۵ء - ۱۰۳۵ھ) کی بکٹ کہانی میں ملتے ہیں ۔ اردو گو متاخرین شعرائے فارسی اور دور اول کے اردو شعرا کا زمانہ اس کے بعد کا ہے ۔ کربل کتھا کی بنیادی اہمیت یہی ہے کہ یہ کھڑی بولی کی پہلی

مستند نثری تصنیف [۱] ہے۔ جن ایک دو نثری رسالوں کی اطلاع ہے، وہ مشکوک ہیں ۔ کربل کتھا سے پہلے کھڑی کے جتنے بھی نمونے دستیاب ہوئے ہیں، وہ نہایت مختصر ہیں یا منظوم ہیں ۔ لسانیاتی تجزیے میں بول چال کی زبان کو جو درجہ حاصل ہے، اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ۔ اس اعتبار سے کربل کتھا کھڑی بولی کے سرمائے میں وقیع درجہ رکھتی ہے۔ دھلی کی قدیم زبان نواح دھلی کی بولیوں سے اس کے تعلقات اور اردو اور کھڑی کے رشتوں پر کام کرنے والوں کے لئے کربل کتھا بہترین ماخذ ہے۔

مولانا حامد حسن قادری نے کربل کتھا کے چند جملوں کی بنا پر یہ حکم لگایا ہے کہ اس میں روزمرہ دکن کا اثر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فضلی کو "دکنی الاصل" قرار دیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ متعدی افعال کی ماضی مطلق میں جمع غائب مذکر کے ساتھ مضارع ' فرمائے، کہے ' رکھے وغیرہ کا استعمال دکنی سے مخصوص نہیں ۔ اس کی بنیادی وجہ حالت فاعلی میں لاحقہ ' نے ' کا عدم استعمال ہے اور یہ بے قاعدگی اس زمانے کی کھڑی اور ہریانی میں بھی پائی جاتی تھی (اس کی مزید تفصیل آگے پیش کی جائے گی) ۔ فضلی نے بار بار وضاحت کردی ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے " زبان ھندی " میں لکھ رہا ہے ۔ اس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ۔ فضلی کو تو یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ اس صنعت کا مخترع ہے یعنی زبان ھندی میں (ترجمہ کرنے میں) اسے اولیت حاصل ہے ۔

" پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب لگ ترجمہ فارسی بہ عبارت ھندی نہیں ہوئی مستمع " ۔ (۲۸) [۲]

کربل کتھا ۳۳-۱۷۳۲ء (۱۱۴۵ھ) میں تصنیف ہوئی اور پندرہ سال بعد ۴۸-۱۷۴۷ء (۱۱۶۱ھ) میں جب مصنف نے اس پر نظر ثانی کی تو اپنے دعوے کو دہراتے ہوئے پھر اس بات پر زور دیا :

"اب کہ نظر ثانی کر بکمیت و کیفیت مضامین و بہندی استطلاحات (کذا) و

۱- زیر نظر مضمون ۱۹۶۱ء میں لکھا گیا تھا جبکہ قصہ مہر افروز و دلبر از عیسوی خاں بہادر مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا، لیکن قصہ مہر افروز و دلبر کی اشاعت سے کربل کتھا کی اولیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اس کتاب کا تعین زمانی حتمی طور پر نہیں ہوسکا ۔

۲- کربل کتھا کے اقتباسات کے ساتھ قوسین میں ہندسوں سے متن کتاب کے صفحات مراد ہیں ۔

استعارات رنگین اصلاح دیا'' ۔ (۳۲)

کربل کتھا کی لسانی اهمیت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کا روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جو فارسی عربی سے نا بلد تھے ۔ قدیم زمانے میں زبان کا معیار صرف ''منتخب روزگار'' یعنی خاص طبقے کے افراد ھی متعین کیا کرتے تھے ، جس کا ایک نتیجہ یہ ھوا کہ آج اردو کے عوامی رشتوں کا سراغ لگانے میں طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ھیں ۔ مقام شکر ہے کہ کربل کتھا کی زبان ان مصنوعی بندشوں سے بے نیاز رھی اور اس میں بوجوہ روز مرہ عوام ھی کو اختیار کیا گیا ۔ فضلی نے خود اس کی وضاحت کر دی ہے :

''بندہ' حقیر ، پر تقصیر خادم روضۂ الشہدا کا کہ سب نکتہ سنجان مناقب شاہ لافتیٰ نے اور سب دقیقہ فہمان مصائب سید الشہدا نے واقعہ شہادت شاہ کربلا کا اوس میں لکھا ہے ، سوناتا تھا لیکن معانی اوس کے نساء و عورات کی سمجھ میں نہ آتے تھے ، اور فقرات پر سوز و گداز اوس کتاب مذکورہ کے بسبب لغات فارسی اون کوں نہ رولاتے تھے ۔ اکثر اوقات بعد کتاب خانی (خوانی) کے سب یہ مذکور کرتے کہ صد حیف و صد هزار افسوس جو هم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے ۔ ایسا کوئی صاحب شعور ھووے کہ کسی طرح من و عن همیں سمجھاوے اور هم سے بے سمجھوں کو رولاوے ۔ مجھ احقر احقر (افقر) کی خاطر میں گذرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا برنگینیعبارت و حسن استعارات هندی قریب الفہم عامہ' مومنین و مومنات کیجے تو بموجب اس کلام بانظام کے کہ من بکا علی الحسین اوتباکا و جبت لہ الجنۃ ' بڑا ثواب باصواب لیجے ۔ کیونکہ اس فایدہ' سبحانی سے اور اس مایدہ' ربانی سے زن و مرد اور پیر و جوان ، خواندہ و ناخواندہ اور خورد وکلاں کو بہرہ' فاضل اور نصیبہ' کامل حاصل ھووے اور هر ایک بے خبر اس درد پر سوز اور اس خبر غم اندوز کوں سن کر اور سمجھ کر رووے'' ۔ (۳۸)

کربل کتھا چونکہ اپنی قسم کی اولین کوشش تھی ۔ اس کی نثر فارسی اور عربی ترکیبوں سے گراں بار نظر آتی ہے ۔ شروع میں قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی بھی کی گئی ہے جو اس زمانے کی فارسی انشا کا عام انداز تھا ۔ لیکن جیسے جیسے فضلی آگے بڑھتے ھیں ، صاف ' سلیس اور رواں نثر لکھتے ھیں ، اور

یہی کربل کتھا کی نثر کا خاص رنگ ہے ۔

ذیل میں کربل کتھا کی لسانیاتی خصوصیات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے :

(الف) صوتی

حرکات و علل :

پنجابی زبان کی خصوصیت ہے کہ اس میں ایسے الفاظ جن میں ثانی حرف علت ہو ، بہ تخفیف حرف علت بولے جاتے ہیں ، مثلاً : ھتھ ، کن ، ٹنگ ۔ برج بھاشا میں چونکہ الفاظ کو سہل بنانے کا رواج رہا ہے ، ایسے الفاظ کو پہلے حرف کے بعد حرف علت کے اضافے سے ادا کیا جاتا ہے ، جیسے ھاتھ ، کان ، ٹانگ ۔ حروف علت کی تخفیف و تکبیر کے لحاظ سے کھڑی بولی پنجابی اور برج کے بین بین ہے ۔ لیکن کربل کتھا میں بعض ایسے الفاظ ، جو بعد میں بہ تخفیف حرف علت رائج ہوگئے ، طویل حرف علت کے ساتھ ملتے ہیں، یہ غالباً اس زمانے کی زبان دہلوی پر برج کا اثر ہے ۔

لاگے (۱۳۰)

کاندھے (۴۳ ' ۴۵)

راکھ (رکھ) (۹۰)

آخری دور کی پراکرتوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بعض مرکب اور مشدد حروف کی ماقبل حرکات کا اشباع ہوجاتا تھا ۔ سنسکرت اصطلاح میں اسے ''گن'' کہتے ہیں ۔ اس سے تلفظ کو نسبتاً سادہ اور سہل بنانے میں مدد ملتی تھی ، مثلاً آگّ سے آگ یا مکّھن سے ماکھن ۔ شمال مغربی بولیوں میں سے پنجابی نے گن کو منہ نہیں لگایا اور مشدد لہجے کو باقی رکھا ۔ کھڑی بولی کے بعض اضلاع مثلاً مظفر نگر ، میرٹھ ، سہارن پور اور انبالہ وغیرہ میں اس لہجے کا اثر ملتا ہے لیکن دہلی میں اور برج کے علاقوں میں مشدد الفاظ کو سہل کر لیا جاتا ہے ۔ کربل کتھا کی زبان بھی اس معاملے میں مٹّی پر ماٹی (۱۰۰) اور ھڈّی پر ھاڑ (ھاڈ) (۱۴۷) کو ترجیح دیتی ہے ۔

ضمہ :

کربل کتھا میں جہاں الفاظ کے پہلے صوتی رکن میں ضمہ ہے ، اسے واؤ میں تبدیل کر دیا گیا ہے ۔ حروف علت کو کھینچ کے ادا

کرنے کے رجحان کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ممکن ہے ضمہ یعنی خفیف لبی مصوتے کا واؤ یعنی طویل لبی مصوتے میں تبدیل ہونا اسی رجحان کی وجہ سے ہو۔ لیکن قرائن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ گمان غالب یہ ہے کہ ضمہ کے بجائے واؤ کا استعمال کسی صوتی خصوصیت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس زمانے میں اردو املا کا عام انداز اعراب باالحروف کا تھا، اور اُس کو اوس اور اُن کو اون لکھتے تھے۔ وسط انیسویں صدی تک ضمائر کے املا میں بجائے اعراب کے حروف علت کا استعمال اسی طریقے پر ملتا ہے۔ [۱] کربل کتھا میں یہ انداز صرف ضمائر میں نہیں بلکہ افعال اور اسما میں بھی بکثرت ملتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

ضمائر :

اوس	(اُس)	(۱)
اونہے	(اُنھیں)	(۸۶)
اون	(اُن)	(۱۰۵)
اونہوں	(اُنھوں)	(۱۱۱)
وو ھی	(وھی)	(۱۰)

۱۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ سید انشا نے اوس پر اعتراض کیا ہے : جب اس کی جگہ اوس لکھتے ہو اِس کو بھی ایس لکھو۔ (دریائے لطافت کے ابتدائی اوراق میں یہ بحث ہے) لیکن اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس اور اُس دو لفظ جو ایک دوسرے کے متقابل تھے، وہ دونوں گونگے ہوگئے۔ اکثر اوقات یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ کسی عبارت کو پڑھنے میں جب تک اس کا پہلے سے مطالعہ نہ کر لیا جائے، پڑھنے والا ٹھوکریں کھاتا ہے اور سننے والے کو الجھن ہونے لگتی ہے۔

سب سے بہتر ہوگا کہ اُس کو ہمیشہ پیش کے ساتھ اور اِس کو ہمیشہ زیر کے ساتھ لکھیے۔ پرانے زمانے میں جن لوگوں نے 'و' سے کام لیا چنداں بے جا نہ تھا۔ انھوں نے اوس پورا لکھا اور کاتب کی محنت بچانے کو "اس" کو بغیر اظہار حرکت لکھا۔

(ع - ص = ڈاکٹر عبد الستار صدیقی)

افعال و اسما :

بورائی	(برائی)	(۵۸)
کوتے	(کتے)	(۷۸)
دوکبھ	(دکھ)	
چوبکے	(چبکے)	(۸۷)
اوجڑا	(اجڑا)	(۱۱۴)
اوداس	(اداس)	(۱۱۸)
کوہی	(کہی)	(۳۰)
گودہ ی	(گدہ ی)	(۱۳۱)
بولائے	(بلائے)	(۵۷)
سونا	(سنا)	(۵۷)
پہونچ	(پہنچ)	(۵۸)
چھوپا	(چھپا)	(۶۰)
چوبھا	(چبھا)	(۶۸)
بو جھائے	(بجھائے)	(۶۸)
اوٹھا	(اٹھا)	(۸۳)
سولائی	(سلائی)	(۸۶)
چوکے	(چکے)	(۹۳)
پوکارا	(پکارا)	(۱۰۲)
چون	(چن)	(۱۵)
اوتریں	(اتریں)	(۳۸)
جھونجلا	(جھنجلا)	(۱۳۰) [۱]

---

۱ - اصل یہ ہے کہ ہم لوگ ایک مدت تک فارسی کتابت کی طرح اردو لکھتے رہے اور رسم الخط کی درستی کی طرف اس لیے توجہ نہیں کی کہ یہ تو ہماری زبان ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہاں مکتوب لفظ کا تلفظ کیوں کر کرنا چاہیے - جب کچھ انگریز اس طرف متوجہ ہوئے مثل گل کرسٹ کے تو بھی ہمارے لکھے پڑھے لوگوں نے پروا نہ کی (ع - ص)

مصوتوں کی اس تبدیلی سے صرف دیسی الفاظ متاثر ہوئے ہیں ، عربی فارسی الفاظ میں ضمہ برقرار ہے : رسول (۱۰۰) خصوص (۹۸) حر (۱۰۱) مصیبت (۱۱۳) شجاع (۱۱۷) جرات (۱۱۷) دشمن (۱۲۷) حکم (۸۵)

مصوتہ زیر کے بارے مجہول میں تبدیل ہونے کی مثالیں بہت کم ہیں:

بہیر (پہر) [۱] (۳۶ ، ۹۰) ایتوار (اتوار)
ابدھر (ادھر) (۶۶ ، ۹۳) دیکھلائے (دکھلائے)

ہکار آوازیں :

اردو میں ہائے مخلوط ، بندشی آوازوں پ ب ، ت د ، ٹ ڈ ، اور ک گ ، اور ایفرکیٹ (Affricate) آوازوں چ ج کے ساتھ ملتی ہے ۔ اردو کی ہکار (Aspirated) آوازیں دس ہیں : پھ بھ ، تھ دھ ، ٹھ ڈھ ، کھ گھ اور چھ جھ [۲] ۔ یہ خالص ہند آریائی اصوات ہیں اور بندشی آوازوں میں مکمل سٹ کی حیثیت سے صرف ہندوستانی زبانوں میں ملتی ہیں ۔ گو ہند آریائی اور ہند ایرانی دونوں کا تعلق ہند یورپی خاندان السنہ سے ہے ، لیکن ہند ایرانی میں ان کا وجود نہیں ۔ اس کے برعکس اردو نے انہیں ہندی کی طرح تمام و کمال محفوظ رکھا ہے ۔ اردو نے اپنا رسم الخط چونکہ فارسی سے لیا اور فارسی میں یہ آوازیں نہیں تھیں ، اس لیے اردو والے بھی ایک مدت تک ان کی اصلیت سے بے خبر رہے ، چنانچہ کربل کتھا میں انہیں ہر جگہ ہ سے لکھا گیا ہے اور اس میں ہائے دو چشمی کا وجود ہی نہیں ۔ کربل کتھا کے طرز املا میں دھر اور دہر ، کھا

---

۱ ۔ یہ دونوں صورتیں قدیم زمانے میں مستعمل تھیں ۔ (ع ۔ ص)

۲ ۔ ہائے مخلوط ل ، م ، ن ، ر ، ڑ اور عوامی بول چال میں ی ، و اور ز آوازوں کے ساتھ بھی ملا کے بولی جاتی ہے ۔ مثلا دولھا ، تمھارا ، کنھیا ، پڑھ ، یہا ، وھاں وغیرہ ۔ اس میں شک نہیں کہ ان الفاظ میں ہ کی آواز مصمتے کے فوراً بعد جڑواں حالت میں آتی ہے اور کسی حد تک پہلی آواز میں ضم ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس حد تک نہیں جیسا کہ ہکار آوازوں پھ ۔ بھ وغیرہ میں ہوتا ہے ۔ وہاں انضمام کامل ہے اور یہاں جزوی ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : '' اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو '' (طبع دوم ا گوپی چند نارنگ ، صفحہ ۳۱ ۔ ۳۶ ۔ بیان ہ ، ح ــ (نارنگ)

اور کہا ، بھر اور بہر ، پھر اور پہر ، اور بھار اور بہار میں کوئی فرق نہیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ محمد شاہی زمانے تک ہکار آوازوں کے لیے ھائے دو چشمی کا رواج نہ ہوا تھا اور اردو والے انہیں دو آوازوں یعنی ب + ہ اور پ + ہ سے مرکب ہی سمجھتے تھے - کربل کتھا میں یہ آوازیں لفظ کے آغاز ، وسط اور آخر ہر حالت میں استعمال ہوتی ہیں اور ہر جگہ انھیں ہائے ہوز ہی سے ظاہر کیا گیا ہے ۔ البتہ آخری حالت میں املا کے قاعدے متعین نہیں تھے ، مثلاً مجھ کو مجہ بھی لکھا ہے اور مجھہ بھی - یعنی آخری حالت میں اکہری ہ اور دوہری ہ دونوں کا استعمال ہوا ہے - ہ کے استعمال میں یہ بے قاعدگی اردو میں اب تک چلی آتی ہے - کربل کتھا میں سوائے مجہ ، تجہ ، بوجہ اور دکہ کے تقریباً وہ تمام الفاظ جن میں ہکار آواز آخری حالت میں آئی ہے ، دوہری ہ سے لکھے گئے ہیں ، یعنی رکھہ ، ساتھہ وغیرہ ۔ دھ اور ڈھ حروف چونکہ بعد کے حرف سے ملا کے نہیں لکھے جاتے ، انہیں دوہری ہ سے لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ، ان میں ہکار عنصر ہ کی شکل میں ملتا ہے ۔

آغاز : بہر (۱۲) کہوے (۱۵) پہنساتا (۲۹) گہوڑا (۳۰) جہالر (۳۰) چہاتی (۵) دہڑ (۵) تہا (۱) ٹہوکر (۳۵)

وسط : اندہیر (۳۵) آنکہوں (۳۵) چکہایا (۱۶) سمجہا (۲۸) بیٹہے (۳۰) ابہی (۹۹) سیدہے (۳) کاندہے (۳) بچہڑا (۵)

آخر : کچہہ (۳۲) رکہہ (۳۴) ساتہہ (۱۶) دیکہہ (۲۵) بیٹہہ (۲۹) اوٹہہ (۳۰) مجہ (۳۱) مجہہ (۳۰) ھاتہہ (۳) بوجہ (۴) دکہ (۳) جیبہہ (۱) بندہ (۹۹)

ھائے زائد کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں :

کلہہ (کل ۲ ، ۵۲ ، ۹۹) آزردہ گی (۵۳) دیدہ ونسے (دیدوں سے ۹۵) سکہینہ (۱۳۷)

مندرجہ ذیل الفاظ میں ہ کی موجودگی کی وجہ سے ما قبل آواز ہکار ہوگئی ہے ۔ نچوڑتے میں چ کی بجائے چھ جدید اردو میں مستعمل نہیں ۔ البتہ مادہ ڈھونڈھ میں آخری حالت میں ڈھ ہے ۔ فرہنگ آصفیہ میں اس کی تصریفی شکلوں میں ڈھ موجود ہے ، لیکن جدید اردو میں ان کا تلفظ سادہ بندشی آواز ہی سے کیا جاتا ہے ۔ یہی معاملہ بھوپیوں کا ہے ۔

نچھوڑنے	(۱۳۲)
ڈھونڈھتا	(۸۷، ۱۲۷)
ڈھونڈھنے	(۷۵، ۸۳)
پھوپیوں	(۱۲۲)
پھوپھیاں	(۱۲۵)

بعض الفاظ میں اس کے بر عکس بھی ہوا ہے، یعنی ہکار آوازوں کو سادہ کر دیا گیا ہے یا آخری حالت میں ہ اڑا دی گئی ہے :

سانج	(سانجھ)	(۱۲۰)
هات	(هاتھ)	(۲)
گرک	(گھرک)	(۱۸۰)
پنکڑیوں	(پنکھڑیوں)	(۱۰۰)
همیش	(همیشه)	(۵۸)

معکوسی آوازیں :

اردو کی معکوسی آوازیں تین ہیں، ٹ ڈ ڑ - یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قدیم ہند یورپی زبان میں ان کا وجود نہ تھا اور ہند آریائی نے انہیں قدیم ہندوستانی لسانی اثرات کے تحت اختیار کیا - فارسی رسم الخط میں چونکہ ان آوازوں کے لیے کوئی علامت نہیں، اردو میں انہیں ظاہر کرنے کے لیے شروع میں کچھ دقت کا سامنا رہا اور طرز املا میں بتدریج تبدیلی ہوتی رہی - کربل کتھا کے قلمی نسخے میں انہیں تین لفظوں سے ظاہر کیا گیا ہے - چھوٹے ط کا اس میں کہیں وجود نہیں - یہ غالباً وسط اٹھارہویں صدی کے بعد کا ارتقا ہے - شروع شروع میں شمالی ہندوستان کی زبانوں میں ڑ کا وجود نہ تھا، بعض ماہرین لسانیات اسے ڈ کا ترقی یافتہ لہجہ قرار دیتے ہیں - لیکن پنجابی زبان میں بالعموم اور ہریانی میں بالخصوص ڈ ہی کو ترجیح حاصل ہے - نوادرالالفاظ میں بھی میر عبد الواسع ہانسوی کے تتبع میں اساڑھ کو اساڈھ (ص۲۲) لکھا گیا ہے - یعنی 'ڈ' کھڑی میں ڑ اور برج بھاشا میں ر میں تبدیل ہوجاتا ہے - کربل کتھا کی زبان چونکہ دہلی کے لسانی سنگم سے تعلق رکھتی ہے، اس میں دونوں اطراف کے اثرات کی تانک جھانک دیکھی جاسکتی ہے :

ڑ : ر — دانت میرے تورے (۴۳)
ٹ : ت — کہانے کے تین کہاتی تھی جب پہلے چتائی تھی تجہے (۱۳۲)
ڑ : ڈ — بوڈھا (۱۶۷) بوڈھیا (۷۶) ھاڑوں (۱۴۶) بڑھاؤں ۔
زائد ۔ مڑوڑی ۔ کنکڑہ (۱۳۶) ڈاڑہ (۱۰۰)

غنائی آوازیں :

کربل کتھا میں غنائی آوازوں کے مطالعے سے اردو کے تشکیلی دور سے متعلق بعض دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اردو میں ناک کی آوازیں تین ہیں ، م ، ن فصلی اور ن وصلی ۔ یہ تینوں مصمتے ہیں، لیکن ناک کی آوازیں مصوتوں سے مل کر بھی ادا کی جاسکتی ہیں ۔ مصمتے کو ادا کرتے ہوئے منہ کا راستہ تقریباً بند کردیا جاتا ہے اور ہوا محض ناک سے نکلتی ہے ۔ لیکن غنائی مصوتہ (نون غنہ) کو ادا کرتے ہوئے آواز پیدا کرنے والی ہوا منہ اور ناک دونوں سے بیک وقت خارج ہوتی ہے ۔ ایسی آوازیں چونکہ معنی کی تفریق میں مدد دیتی ہیں ، اس لیے اہم ہیں ۔ اردو رسم الخط میں نون فصلی ، نون وصلی اور نون غنہ تینوں کے لیے ایک ہی علامت استعمال ہوتی ہے۔ جدید دور میں نون غنہ کو آخری حالت میں نقطے کے بغیر ظاہر کیا جاتا ہے، جب کہ قدیم زمانے میں یہ تخصیص نہ تھی ، چنانچہ کربل کتھا میں نون غنہ کو جگہ جگہ نقطے سے ظاہر کیا گیا ہے ۔ دوسرے یہ کہ غنائی مصوتوں کو ادا کرتے ہوئے چونکہ ہوا کے راستے میں کم سے کم مداخلت کرنا پڑتی ہے ، ایک ایسے رسم الخط میں جہاں حرف و صوت کا رشتہ بہت واضح نہ ہو ، ان کا صحیح احساس نہیں ہوتا ۔ یہی وجہ ہے کہ کربل کتھا کی زبان میں غنائی مصوتوں کے استعمال کی بعض دلچسپ مثالیں سامنے آتی ہیں ۔

کہیں کلمے میں نون غنہ املا کی گرفت میں نہیں آ سکا یعنی حذف ہوگیا ہے ، کہیں اسے بڑھا دیا گیا ہے اور بعض الفاظ میں اس نے اپنی جگہ بدل لی ہے ، یعنی لسانیات کی اصطلاح میں اس کا تبدل (Metathesis) ہو گیا ہے ۔ ذیل کی مثالوں کو دیکھتے ہوئے اتنی بات خاطر نشان رہے کہ اپ بھرنش کے اثرات کی وجہ سے شروع شروع میں اردوے قدیم میں نون غنہ کا استعمال زیادہ ہوتا تھا ' افضل جھنجھانوی کی بکٹ کہانی میں بھی " کو " کو " کوں " لکھا ہے ۔ پنجابی اور ہریانی میں بہ خصوصیت اب تک

ملتی ہے - لیکن جیسے جیسے اردو کو کھڑی بولی کی خراد پر اتارا جانے لگا نون غنہ کا حد سے بڑھا ہوا استعمال رفتہ رفتہ اعتدال پر آ گیا -

انحذاف :

اردو میں ضمائر اور اسمائے اشارہ کے ساتھ جب کلمہ' حصر استعمال ہوتا ہے تو دو صورتیں حاصل ہوتی ہیں ، مثلاً یہ ہی اور یہی - پہلی کو مکمل اور دوسری کو مخفف کہا جاتا ہے - فرق صرف یہ ہے کہ ''سندھی'' کے ذریعے ' ہ ہی' کی ' ہ' حذف ہوجاتی ہے یا صوت ما قبل ہکار ہوجاتی ہے - بعض ضمائر میں آخری جانب میں نون غنہ بھی بڑھا دیا جاتا ہے ، جیسے انھیں ' ہمیں ، تمھیں وغیرہ - جملے میں جب کسی بات پر زیادہ زور دینا ہو تو اب بھی مکمل صورتیں استعمال کی جاتی ہیں ، ورنہ اضافی حالت میں مخفف صورتیں ہی زیادہ رائج ہیں - ان مرکب ضمائر میں آخری حالت کی مصوتی غنائیت اردوے قدیم کی یاد دلاتی ہے - کربل کتھا میں درج ذیل الفاظ مخفف صورت میں مع اضافہ نون غنہ ملتے ہیں :

یونہیں : یوں ہیں ماں بین کر روتی تھی - (۱۱۳)

تونہیں : کوئی کہے اے فلک تونہیں ترس کر ہم پر - (۱۱۸)

وونہیں : ونہیں ندائے الہی ہوئی (۴۳ نیز ۲۹ ، ۳۰ ، ۵۳ ، ۶۹ ، ۵۴ ، ۶۵ ، ۹۴ ، ۹۶ ، ۱۲۴)

تیون ہیں : تیون ہیں بعد مرنے کے نظر کسو کی میرے جنازے پر نہ پڑے - (۵۳)

جدید اردو میں یہ کلمے مخفف صورت میں مع نون غنہ مستعمل نہیں - معمولی حالت میں انہیں کو بہ انحذاف نون غنہ لکھا ہے :

تم انہے مارو - (۱۳۰)

انہے تصدیعہ نہ دے - (۱۳۰)

نہ پھر حسین کوں وہ دیکھے نے حسین انہے - (۱۳۱)

جو کوئی انہے لاوے - (۸۶)

انہے لے کدھر ہی نکل جاؤں - (۱۱۵)

اردو کے اعداد توصیفی میں مصوتی غنائیت خاص عنصر ہے ، لیکن کربل کتھا میں دونو (۸۷) اور تینو (۱۱۷) بہ انحذاف نون غنہ آئے ہیں ۔ البتہ گیارھویں (۱۲۹) اور بارہویں (۱۳۵) میں نون غنہ موجود ہے ۔

حرف ' میں ' کو اکثر و بیشتر ' موں ' لکھا ہے ۔ لیکن ایک مقام پر یہ ' مے ' کی صورت میں بغیر نون غنہ کے ملتا ہے (۴۴) ۔

کربل کتھا میں چونکہ املا کی حد تک نون غنہ اور نون کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا ، جگہ جگہ ' میں نے ' کو 'مینے' لکھا ہے ۔ (۴۰ ، ۲۹ ، ۳۰ ، ۴۴ ، ۴۵ ، ۵۴)

اضافہ :

بعض کلموں میں مصوتی غنائیت کا اضافہ ملتا ہے ۔ اب یہ کلمے اس کے بالعکس مستعمل نہیں :

(آو) کو : کوں (۲۸ ، ۲۹ ، ۱۷ ، ۳۳ ، ۳۸ ، ۴۴ ، ۴۷ ، ۱۳۴ ، ۱۳۵)

(اِے) سے : سوں (۹ ، ۵۲ ، ۶۱)

(") بیچا : بینچا (۹۰ ، ۹۴ ، ۱۰۸ ، ۷۹ ، ۳۸)

(آو) کوچ : کونچ (۹۳ ، ۹۴ ، ۱۸۷ ، ۵۰)

(") تو : توں (۱۷ ، ۳۰ ، ۸۰ ، ۳۹ ، ۴۳)

(ای) پائنتی : پائنتیں (۱۹۱)

کربل کتھا میں گیارہ سے اٹھارہ تک کے اعداد ترتیبی کو بھی نون غنہ کے اضافے سے لکھا گیا ہے (گیارنہ ، بارنہ ، تیرنہ ، چودنہ ...) ۔ لہندا اور مشرقی پنجابی میں یہ اعداد اب بھی نون غنہ کے اضافے کے ساتھ بولے جاتے ہیں جبکہ معیاری اردو میں ان کا غنائی لہجہ حذف کردیا گیا ہے ۔ ان کلموں میں مصوتی غنائیت چونکہ لفظ کے آخری رکن پر حاوی ہے ، اس لیے قدیم طریق املا کی گرفت میں پوری طرح نہیں آئی چنانچہ کہیں اسے ' ہ ' سے پہلے لکھا ہے اور کہیں بعد میں :

گیارہ (۲۲)

بارنہ (۳۱ ، ۳۶ ، ۱۱۰ ، ۱۳۳ ، ۱۵۲ ، ۱۷۲)

تہرنہ (۵۸، ۶۹، ۹۳، ۱۵۳)

چودنہ (۱۰۳)

پندرہ‌نہ (۵۱)

سترنہ (۵۸)

اٹھارنہ (۱۲۴، ۱۳۳، ۱۵۰)

قلب :

دھواں دھنوا (۳۶، ۸۹)

پاؤں پانو (۴۳، ۹۵)

پہنائے پنہائے * (۱۳۳)

دوہرا نون :

اردو میں دوہرے مصمتوں کے لئے عموماً علامت تشدید سے کام چلایا جاتا ہے، لیکن ایسے افعال میں جہاں علامت مصدر سے پہلے نون موجود ہو،

---

* کربل کتھا : آپ زرہ بکتر علی اکبر کون پنہائے (۱۲۳)

پچھلے دنوں اردو رسائل میں یہ بحث جاری رہی کہ پنہانا صحیح ہے یا پہنانا۔ اردو میں دراصل یہ ملتے جلتے تین لفظ ہیں : پنہانا (بروزن فعولن) پہنانا (بروزن مفعولن) اور پن‌ھانا (بروزن مفعولن)۔ فیلن اور شکسپئر دونوں نے پہنانا اور پنہانا کا ذکر کیا ہے - نوراللغات اور سرمایۂ زبان اردو میں پنہانا موجود ہے۔ داغ کا شعر ہے :

آڑی زخموں کی جو قاتل نے پنہائی بدھی
آج مقتل میں شہید آئے ہیں دولہا بن کر

آجکل بعض '' فصحائے عظام '' اس لفظ کو ٹاٹ باہر قرار دیتے ہیں، مگر جب خود انہیں میں سے ایک کے کلام سے اس کی متعدد مثالیں پیش کی گئیں تو انہیں یہ کہتے بنی :

'' یہ اس دور کی غلطیاں ہیں جب میں اس لفظ کی اہمیت سے واقف نہ تھا''

کربل کتھا میں پنہانا کی موجودگی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لفظ دو ڈھائی سو سال پہلے بھی اردو میں مستعمل تھا۔

دوہرا نون لکھا جاتا ہے ، مثلاً جاننا ' سننا ' گننا وغیرہ ۔ کربل کتھا میں ایسے موقعوں پر بھی علامت تشدید استعمال کی گئی ہے:

مجھے قوت ان باتیں سونئے کی نہیں ۔ (۵۳)
یہ مجلس ہے گی تیسری جس میں شہادت اب
شاہ نجف کی ہے جسے سونتا محال ہے (۵۷)

وصلی غنائی مصمتہ : *

اردو میں لبی آواز ب سے نون کا نہیں ' م کا وصل ہوسکتا ہے کیونکہ م اور ن دونوں لبی آوازیں ہیں ۔ اردو رسم الخط سے اکثر یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ ب سے پہلے نون استعمال ہو رہا ہے ' جیسے گنبد ' جنبش ' انبساط وغیرہ کو ہم لکھتے نون ہی سے ہیں ' لیکن بولتے م سے ہیں ۔ کربل کتھا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لفظ تھام کو نون اور ب سے لکھتے تھے : تھانب ۔ بعد میں ب حذف ہوگیا اور صوتی مناسبت کے لحاظ سے نون کو م سے لکھا جانے لگا ۔ لفظ تمبا کو اب 'م' سے لکھا جاتا ہے ' لیکن کربل کتھا کے زمانے میں یہ بھی نون سے مستعمل تھا :

حضرت اوسے تھانبے نہ تھنبا (۱۴۷ نیز ۱۳۲)
آپ ہاتھ لنبا کر اوس کوزہ کوں اوٹھا (۶۹ نیز ۸۸ ' ۸۹ ' ۱۲۵)

---

* وصلی غناوی مصمت [یا '' صامتہ ''] بہتر اور بولنے میں زیادہ آسان ہوگا ۔ ن ساکن یا غنہ کے بعد ب جب ایک لفظ میں واقع ہو تو نون میم کی آواز اختیار کر لیتا ہے اور نہ صرف ہندی بولیوں بلکہ فارسی اور عربی میں بھی ان دونوں آوازوں کے ملنے سے م پیدا ہوتا ہے ۔

فارسی : انباز ، اپناستن ، تنبول ، تنبول (تمولی) ، دنب (دم) دمبال (دنبالہ) دنبل ، دنبہ (ایک قسم بھیڑ کی جس کی دم بہت چوڑی اور موٹی ہوتی ہے) زنبیل ، زنبور ، شنبہ ، سنبوسہ (سموسہ) گنبد ۔

عربی : جنب (اور اس سے جنبیا، ایک طرح کا خنجر جو دکن میں رائج ہے) ، عنبر ، قنبر ، کرنب (کرم کلا) نبی کی جمع انبیا ، انبساط ۔ (ع - ص)

' اردو ' لفظ ' کنبہ ' اس اصول سے مستثنیٰ ہے ۔ (فارنگ)

(ب) صرفی

مصادر:

محمود شیرانی نے اردو کی علامت مصدری " نا " کو پنجابی سے ماخوذ بتایا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مصدری لاحقہ " نا " مشرقی پنجابی، ہریانی، اور کھڑی تینوں بولیوں میں مشترک ہے۔ برج کا معاملہ جدا ہے۔ اس میں مصادر بو، اؤ اور نؤ کے اضافے سے بنائے جاتے ہیں۔ کربل کتھا کی زبان اس لحاظ سے اردوئے قدیم اور کھڑی بولی کے باہمی تعلق کا نیا پہلو پیش کرتی ہے۔ ان افعال میں جن کے مادے حرف صحیح پر ختم ہوتے ہیں، مصدر " نا " ہی کے اضافے سے بنتا ہے، لیکن جن مادوں کے آخر میں حرف علت ہو، ان میں بجائے " نا " کے " ونا " کا اضافہ کیا جاتا تھا، مثلاً جاونا، کھاونا، پیونا، اٹھاونا، بٹھاونا وغیرہ۔ علامت مصدر " ونا " کا تعلق لہندا سے ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں واؤ کے بعد نون معکوسی ہے اور یہاں سادہ نون استعمال ہوتا ہے۔ واؤ کربل کتھا کے افعال کا اہم عنصر ہے اور مضارع اور دوسرے مشتقات فعل میں بھی برقرار رہتا ہے۔

جاونا (۹۷) پیونا (۹۷) پاوئے (۱۰) لاوے (۱۱۰) چھوڑاوے (۱۱۰) دیکھلاویں (۱۱۷) پیوتے (۱۱۷) رووے (۱۲۰) کہاوے (۱۲۱) رولاوے (۱۲۱) آوئے (۱۸۸) جاوے (۳۵) آوے (۳۶) پہنچاویں (۳۷) دھووے (۵۲) اٹھاوس (۲۸) پاوے (۷۷) لوٹاوے (۷۷) دیوے (۱۶) چمکاوے (۱۷) سمجھاوے (۲۸) ڈراوتا (۱۰۶) جیوتا (۱۲۲) جاوتا (۹۳)

'ہونا' مصدر کے مشتقات میں 'ہو' کے بجائے 'ہوے' یا 'ہوئے' ملتا ہے۔ ہوویں کے علاوہ کہیں کہیں ہوئیں کی جھلک بھی نظر آ جاتی ہے اور ہووں کے علاوہ ہوں بھی امدادی فعل کی حیثیت سے آیا ہے:

ہوئے: آج سکینہ میری یتیم ہوئے گی۔ (۱۳۰)

جس کو میں نے ستایا ہوئے یا آزردہ کیا ہوئے۔ (۴۴)

ہووے: صالح اولاد اون کو ہووے عطا۔ (۸)

بدل و جان مشغول ہووے۔ (۳۰)

ایسا کوئی صاحب شعور هووے - (۲۸)

هوویں : سب کے دل ڈر سے موے هوویں - (۳۷)

اس کی مقبول هوویں سب طاعات - (۸)

بیچ قیامت کے وہ بندے محشور هوویں هنستے هوئے - (۳۸)

قلم سب شجر هوویں تو بھی زیاد - (۱۹)

هوئیں : دریا خشک هوئیں گے - (۱۲۹)

هم تو اس پاس جمع هوئیں گے - (۱۶۱)

ایسا مرسل که سارے پیغمبر چاهتے اوس کی امت هوئیں یکسر - (۱)

هوں : میں رحم کر کے دیوں هوں جیتی اناکانی - (۱۸۹)

امر :

اردو میں علامت مصدر حذف کر دینے کے بعد باقی امر رہ جاتا ہے جیسے بیٹھ ، سن - لیکن امر مخاطب واحد کو بنظر ادب جمع بھی بولتے ھیں ، جیسے بیٹھو ، سنو - کربل کتھا کے زمانے میں امر کی اس صورت کو یائے زائد سے بولتے تھے ، مثلاً بیٹھیو ، سنیؤ وغیرہ - بعض ماھرین نے اسے امر دعائیہ کہا ہے اور امر احترامی کی تخصیص 'ے' کے اضافے سے کی ہے ، جیسے بیٹھیے ، سنیے - کربل کتھا میں امر کی یہ تینوں صورتیں یعنی سادہ ، دعائیہ ، اور احترامی ملتی ھیں لیکن حاوی رجحان دعائیہ ھی کا ہے - جن مادوں کے آخر میں یائے معروف ھو ، وھاں احترامی 'و' یا 'ے' کے قبل 'ج' بڑھا دیتے ھیں ، جیسے 'کیجیو ، کیجیے یا دیجیو ، دیجیے - یہ ج دراصل یائے زائد کا بدل ہے - دیئیے میں ی اپنی حالت پر قائم ہے اور دیجیے میں ج سے بدل گئی ہے - مثالیں :

سادہ : لا (۳۰) دو (۱۱۷) چھوڑو (۱۱۷) جانو (۱۱۹)
اوٹھہ (۴۵) لے (۴۵) کھول (۴۷) بول (۴۷)
دے (۴۷)

دعائیہ مع یائے زائد: آئیو (۳۰) بخشیو (۳۴) رکھیو (۵۳) فرمائیو (۵۳) گذریو (۵۵) سونائیو (۵۹) روئیو (۵۹) بینچیو (۷۹) کھولیو (۹۶) نوچیو (۹۶) جائیو (۳۶) کہیو (۳۷)

دعائیہ مع ج : کیجیو (۳۴) ہوجیو (۱۰۰) دیجیو (۱۰۵)

حال مطلق :

اردو میں حال مطلق مادۂ فعل اور امدادی فعل 'ہے' کی مختلف شکلوں کے بعد ' تا ' کے اضافہ سے بنتا ہے ، جیسے جاتا ہے ، کرتا ہے ۔ کربل کتھا میں مادۂ فعل کا یہ کام مضارع سے لیا گیا ہے ، یعنی صیغہ واحد غائب کے لیے امدادی فعل سے پہلے مادۂ فعل کے آخر میں یائے مجہول بڑھا دی جاتی ہے ، جیسے جائے ہے ، کرے ہے ۔ کربل کتھا میں حال مطلق کی یہ صورت عام ہے ۔ مولوی عبدالحق نے قواعد اردو میں اس کے تغیرات یوں بیان کئے ہیں : جاوے ، جاوے ہے ، جائے ہے ، جاوت ہے ، جات ہے اور جاتا ہے ۔ فعل حال مطلق جائے ہے ، کرے ہے وغیرہ کا استعمال راجستھانی اور ہریانی میں بھی ملتا ہے لیکن یہ کھڑی بولی سے مخصوص ہے اور آج بھی دھلی ، بجنور ، مرادآباد وغیرہ اضلاع میں اسی طرح بولا جاتا ہے ۔ یہ انداز جدید نثر میں متروک ہوچکا ہے ، لیکن شعر میں خال خال مروج ہے ۔

رو لوھو کی ز دیدۂ گریاں جاوے ہے ۔ (۳۶)

حضرت پوچھے کہ کون رووے ہے ۔ (۱۳۵)

کلینی پسند ھائے معتبر روایت کرے ہے ۔ (۱۰۷)

علی بن ابراھیم حضرت امام جعفر صادق علیہ‌السلام سے روایت کرے ہے ۔ (۳۷)

کربل کتھا میں 'ہے' کے ساتھ 'گا' بھی حال کے معنی میں استعمال ہوا ہے ، مثلاً :

سبزہ بھی اوگا ہے گا کہیں شور زمیں بیچ - (۶۶)

الوداع اے دوستو ہے گا ہمارا اب سفر - (۹۹)

یے بہ یے سب نے کیا ہے گا ظہور - (۲۲)

کسے ہے گی قدرت جو اوس کی ثنا - (۱۹)

قدیم اردو میں اس کا رواج تھا اور بہ خصوصیت پنجابی اور کھڑی میں مشترک ہے -

حالیہ معطوفہ :

کربل کتھا میں حالیہ معطوفہ کا استعمال بکثرت ہوا ہے - جدید اردو میں اس کے لیے 'کر' اور 'کے' کے استعمال کو ترجیح حاصل ہے ، گو نظم میں اس کے بغیر بھی جائز ہے جیسے ، وہ بات سن چلتا بنا -

کربل کتھا میں حالیہ معطوفہ کا کام بالعموم مادہ' فعل سے لیا گیا ہے- کر اور کے خال خال نظر آجاتے ہیں ، ورنہ عام طور پر انہیں استعمال نہیں کیا گیا :

امت نے اس کے فرزندوں کو بھوک پیاس سے ہلکا ، شربت زھر اور خنجر قہر سے ھلاک کیا - (۴۲)

حضرت فاطمہ نے آواز سلمان کی پہچان ، جواب دیا - (۴۴)

حضرت ہوش میں آ ، پوچھے کہ کیا ہے - (۴۶)

آنکھوں سے آنسو پونچھ ، کہے - (۴۷)

اس اندیشہ عمیق میں سر بہ گریباں تفکر ڈال ، دریائے اندوہ و تحیر میں غوطہ کھایا - (۲۸)

بعض جملوں میں حالیہ معطوفہ کے لیے ' کے ' کے بجائے ' کہ ' بیانیہ فارسی استعمال ہوا ہے جو بظاہر کم سواد کاتب کی نوازش ہے :

فاتحہ ہات اوٹھا کہ با اخلاص - (۲)

مومناں مل کہ بھر کسب نجات - (۶)

کر کہ تر اوس پانی سے اونگلی شتاب - (۲۱)

لیجا کہ جو باپ سے ملاوے - (۹۴)
حال حس کوں کر کہ یاد - (۵۹)

معاون افعال :

کربل کتھا کے زمانے میں افعال معاون کا استعمال ابھی باقاعدہ نہ ہوا تھا - ہے ، ہو ، ہیں ، ہوں اور گا ، گے ، گی امدادی افعال زیادہ تر حذف کر دیے گئے ہیں اور زمانے کے تعین کے لیے صرف حالیہ ناتمام اور مضارع سے مدد لی گئی ہے :

ہے ، ہو ، ہوں : اب وہ تیرے باپ سے بدلا مانگتا - (۴۴)

ایک عرب دروازے پر کھڑا ہے ، بصورت مہیب و بشکل عجیب ، رخصت مانگتا کہ اندر آوے - (۴۶)

حسین نے کہا کہ اے نانا میں بھاگتا نہیں بلکہ تمہیں پکڑنے میں گرم کرتا ، معشوق کہ عاشق سے بھاگتا ہے ، عاشق کوں اپنی اپنی محبت میں تیز کرتا - (۴۳)

جو اکٹھے بیٹھتے ہو ، ہمارا بھی ذکر کرتے یا نہ - (۳۹)

گا ، گے ، گی : قاسم کہا ... تجھے بھی شربت مرگ اسی سے چکھاؤں اور تیرے فرزندوں کنے بھجاؤں - (۱۱۱)

نہ جانوں بعد میرے کپڑے میرے بچوں کے کون دھووے اور .. نہ جانوں بعد میرے ان کے سر کے بالوں کوں کون دھووے - (۵۲)

اگر یزید کوں قبول کرے ، ملک عراق اور تخت و تاج تیرے تصرف میں آوے اور ملکۂ عالم کہلاوے - (۶۶)

حالیہ میں جب ' ہوا ' صفت کے معنی میں آیا ہے تو اسے بھی حذف کر دیا ہے :

ارزق بد بخت چاروں بیٹے موے دیکھا - (۱۱۰)

اے اوزق کہاں روا ہے کہ مرد سپاہی کہلاوے اور
سوار ہوتے گھوڑے کے تنگ کی خبر نہ رکھے۔ (۱۱۱)

ضمائر :

کربل کتھا کے بعض ضمائر سے برج بھاشا کے اثرات کا واضح ثبوت ملتا ہے ۔ یہ کے بجائے یو (۸۰ ، ۸۱ ، ۱۹) وہ کے بجائے وو (۱۶ ' ۸۹ ' ۹۰ ' ۱۰۳ ' ۱۱۱ ' ۱۱۸ ' ۱۲۳) کس کے بجائے کسو (۳۳ ، ۵۰ ، ۹) اور اُس کے بجائے وس (۱۲۰) * استعمال ہوئے ہیں ۔ ضمیر شخصی مخاطب واحد ' تو ' حد سے بڑھے ہوئے غنائی اثرات کے تحت 'توں' ہوگئی ہے (۱۷ ، ۳۰ ، ۸۰ ، ۹۰ ' ۳۹ ' ۴۳) ۔

ضمیر موصولہ جس کے علاوہ تس بھی استعمال ہوئی ہے :

میں اکیلا رہ گیا اور بیری اپنے تس پہ ہائے ۔ (۱۳۲)

تس پہ ہوتا ہے اب مرن تیرا ۔ (۱۱۳)

فاعلی اور غیر فاعلی حالتوں میں ضمیر شخصی اپنا ، اپنی، اپنے کے بجائے اپس کا استعمال ہوا ہے ۔ یہ ضمیر نواح دہلی کی زبان سے تعلق رکھتی ہے اور افضل جھنجھانوی کی بکٹ کہانی میں بھی ملتی ہے :

---

* کربل کتھا میں وس کا استعمال زیادہ نہیں ۔ لیکن صفحہ ۱۲۰ پر اس کی موجودگی (آہ وس ملعون نے وہ ہاتھ بھی گرایا) سے معلوم ہوتا ہےکہ وسط اٹھارویں صدی کی دہلوی اردو میں یہ ضمیر مستعمل تھی ۔ اردو میں یہ غالباً برج بھاشا کے اثر سے آئی ۔ کربل کتھا کے بعد وس کا استعمال اُس مرثیے میں ملتا ہے جسے گلکرائسٹ نے '' گرامر آف ہندوستانی لنگویج '' میں نقل کیا ہے ۔ یہ مرثیہ عبد اللہ مسکین سے منسوب ہے جو محمد شاہ (۱۷۱۹ - ۱۷۴۸ء) کے زمانے میں ہو گزرا ہے ۔ (درگاہ قلی خان سالار جنگ : مرقع دہلی ص ۵۱) ۔ انڈیا آفس لائبریری لندن کے ایک مخطوطے '' منشات شاکر '' سے بلوم ہارٹ نے نمونے کی جو عبارت نقل کی ہے ، وس اس میں بھی موجود ہے (ہندوستانی مخطوطات ، ص ۱۳۶) جان پلیٹس نے بھی اسے قدیم اردو میں مستعمل بتایا ہے (ہندوستانی گرامر ص ۱۱۷) ۔ جدید اردو میں وس کی جگہ اُس نے لے لی ہے ، لیکن دہلی کی عوامی بولی میں یہ ضمیر اب بھی رائج ہے ۔ (ر ۔ ک ۔ اردوے دہلی کی کرخنداری بولی ، گوپی چند نارنگ ، ص ۷۱)

اس کوں کروں کی کہا جو اپس آس گنوائی - (۱۱۵)
آسماں لرزا اپس پر ہو گیا نیلہ تمام - (۱۲۱)
کہہ اپس دو کہہ کے بچن مجھ سے سچے - (۱۲۸)

اعرابی لاحقے :

غنائی آوازوں کی بحث میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ کربل کتھا میں کو کے بجائے کوں اور میں کے ساتھ ساتھ موں اور مے استعمال کیے گئے ہیں - اسی طرح 'سے' کے ساتھ سوں اور سیتی استعمال ہوا ہے - سیتی اور ستی، فائز، حاتم، آبرو اور دیگر متقدمین کے ہاں بھی بار بار ملتے ہیں :

کوں : حاضراں مل کہ اس مطالب کوں - (۹)
اس کوں ظالم نپٹ رکھے بے چین - (۱۲)
جب حضرت جنگ نہروان کوں متوجہ ہوئے - (۵۷)

موں : دیباچہ کتاب کا دل موں خیال ہے - (۱۵)
پھرتی تھی خیمہ موں روتی بے قرار - (۱۲۳)
دل موں کہا - (۲۹)

سیتی : ہوا تب یو طوفان سیتی خلاص - (۱۹)
اے بچے کر اپنے بابا سیتی بات - (۱۲۸)
ہو بے بس اوس گھوڑی عباس سیتی شہ نے کہا - (۱۱۷)

سوں : فاتحہ اب پڑھو دل و جان سوں (۹)
ہر طرف اضطراب سوں رو رو نظر کیے - (۶۱)
ابھی اوس کے ہی ماتم سوں نہ پایا تھا فراغ - (۵۲)

صلات :

بیچ : یہ ظرفی صلہ ہے اور ' اندر ' یا ' میں' کے معنی میں استعمال ہوا ہے - میں، موں، مے وغیرہ لاحقے بغیر کسی علامت کی وساطت کے آتے ہیں، جبکہ بیچ اضافی علامت کی مدد سے جملے میں استعمال ہوا ہے :

علم ہدایت کا اور نشان عنایت کا بیچ صحن عالم قدس
کے بلند کیا - (۱۸)

ایسا بادشاہ ... کہ ... بندہ نوازی بیچ ملک ہندوستان
کے ... قبضہ درایت اوس کے میں آئی - (۲۵)

لگ ، تلک : کربل کتھا میں لگ اور تلک مجروری صلہ 'تک' کے لیے استعمال ہوئے ہیں ۔ مندرجہ ذیل مثالوں میں لگ ظروف اب جب تب کے ساتھ آیا ہے :

اب لگ کہ سن عزیز اوس کے نے ... - (۲۶)
اب لگ یہیں بیٹھیے - (۳۰)
تب لگ کہ رات آئی - (۵۰)
اے اخی کب لگ یہ بے آبی سہیں - (۱۳۰)
جب لگ کہ خواند میرا نہ پیو چوکے - (۱۴۲)
یہاں تلک روئیں - (۵۰)

کنے : * یہ ظرفی صلہ پاس کا ہم معنی ہے اور اسم کی اضافی حالت کے طور پر استعمال ہوا ہے :

تم کوں سونپے حق کنے ہم جاتے ہیں گے اپنے گھر - (۹۹)
بہ خوشی تمام چچا بزرگوار کنے گیا - (۱۰۶)
مینے سونپا خدا کنے دل موں - (۱۴۷)

صفات ضمیری مقداری :

اتنا ، جتنا ، کے قدیم روپ اتّا ، جتّا کربل کتھا میں ملتے ہیں ۔ ان الفاظ میں ن بعد میں اضافہ کیا گیا اور تشدید حذف ہوگئی ۔ جان بیمز کا بیان ہے کہ ن لاحقہ تصغیر ہے جس کے اصلی معنی بعد میں فراموش کر دیے

* یہ بڑا اچھا اور بڑے کام کا لفظ تھا جسے ہمارے شاعروں نے متروک قرار دے کر سخت ظلم کیا ہے ۔ (ع - ص)

گئے ، جبکہ جان پلیٹس نے نون کو دوسرے ت کا بدل بتایا ہے ۔ کربل کتھا کے دیسی الفاظ میں چونکہ اظہار کسرہ کے لیے ی استعمال ہوئی ہے ' اتا ، جتا میں یائے زائد بھی ملتی ہے :

جیتا کہ حضرت تازیانہ مارتے تھے۔ (۹۵ نیز ۸۳ ، ۱۲۷)
اے ہر اپتے دن توں کہاں تھا ۔ (۱۰۱)
اپتے بیگانوں میں کوئی آشنا میرا نہیں۔ (۱۳۲ نیز ۹۳ ، ۱۱۱ ، ۱۱۹ ، ۱۳۲)

— — — —

حرف استفہام ' کتے ' تعداد کے لیے آیا ہے اور غیر منصرف ہے :

اے فرزند اس مہینے سے ' کتے ' دن گذرے ۔ (۵۸)

ظرف زماں 'جب' کے لیے 'جدھاں' بھی استعمال ہوا ہے :

جدھاں کہ کونچ بہ کونچ اوس طرف وو شاہ چلا۔ (۱۸۷)

کربل کتھا میں 'کبھو ' بکثرت استعمال ہوا ہے۔ ظرف زماں 'کب ' اور کلمہ حصر ' ہی' سے مخفف ' کبھی' حاصل ہوتا ہے ۔ برج کے اثر سے قدیم اردو کے کلمات میں 'ہی' کا دوسرا روپ ' ہو ' بھی رائج تھا جس سے مرکب ' کبھو ' بنا :

لپٹ جانا کبھو بچے کوں لے اوٹھنا کبھو ۔ (۱۳۰)
ہائے اب کبھو نہ دیکھوں گی ۔ (۵۰)

وحدت و جمع :

فاعلی حالت میں مذکر و مونث دونوں کی جمع کے لیے زیادہ تر لاحقہ "اں" استعمال کیا گیا ہے :

بیچاریاں اور محروم دو کہیاریاں بے وارث ۔ (۱۳۰)
وہ بھی دو کہیاں ۔ (۱۲۴)
ہائے بابا کیا کریں گیں ہم دو کہیاریاں تیرے بعد
کس کوں کہہ بابا ہو کارس ہم بچاریاں تیرے بعد ۔ (۶۲)

نیز حاضراں (۹ ، ۱۰ ، ۱۳) موسناں (۱۲) قدساں (۳۰) گمراہاں (۸۱)

شتراں، اسپاں، اونٹاں (۱۰۹) - پنجابی اور ہریانی میں یہ طریقہ عام تھا - قدیم اردو میں بھی مذکر مونث دونوں کی جمع ''اں'' سے آتی تھی، فائز اور حاتم کے زمانے تک اس کی مثالیں مل جاتی ہیں :

دو بھواں تیغ جنوبی سی دراز (فائز)

لب پر گلوں کے سہر کرے اِن لباں کا رنگ (حاتم)

کربل کتھا میں عربی لفظوں کی جمع الجمع بھی ملتی ہے، مثلاً مصائبوں اصحابوں، بلغاؤں - اصحاب اور اقربا کو واحد بھی استعمال کیا ہے، مثلاً عجایب وقت دیکھتا ہوں، ... خویش اقربا میرا نہیں -

تذکیر و تانیث :

بعض الفاظ جو اب مونث بولے جاتے ہیں، کربل کتھا میں مذکر استعمال ہوئے ہیں :

اے پدر جان میرا قربان تیرے - (۴۶)

جان* اپنا جان دینے والے کوں سونپا (۱۰۳)

ایک جگہ جان کو مونث بھی لکھا ہے :

کیا گلی میں محبت کی اپنی جان نثار -

بعد تیرے پناہ ہمارا کون ہوے گا - (۴۷)

جوں یہ فریاد و فغاں لڑکی کا گھر سے بلند ہوا - (۹۴)

قتل علی پر کمر باندھا -

ملعون نے قبول کیا اور سوگند کھایا -

غرض میرا بدلے سے نہ تھا -

اسی طرح کنٹھ، راہ، اصل اور پرواز جواب مذکر استعمال ہوتے ہیں، کربل کتھا میں مونث ملتے ہیں -

---

* اودھ کے قصبات میں عورتیں آج بھی جان (بمعنی جسم) بولتی ہیں - جیسے بچے کا سارا جان نیلا ہو رہا ہے یا اُس کے سارے جان میں دانے پڑ گئے ہیں - (ع - ص)

(ج) نحوی

فعل جمع مونث:

اردو میں فعل تذکیر و تانیث اور واحد و جمع میں اپنے فاعل کے مطابق آتا ہے۔ کربل کتھا کی زبان اس سلسلے میں دو خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ ایک یہ کہ مفرد فعل مونث کی جمع '' ن '' سے نہیں '' یاں '' کے اضافے سے بنائی جاتی ہے، دوسرے یہ کہ علامت مستقبل بھی اس اصول کے تحت ' گی ' سے ' گیاں ' ہوجاتی ہے:

اندرسے کتنی عورتیں نکلیاں - (٥٧)

اے کاش مدینہ میں دادا کی قبر پر ہوتیاں تا درد دل اپنا اوس قبر سے کہتیاں - (٦٢)

رو رو بانو کے تئیں دیکھلاتیاں - (١٢٣)

بہنیں بھی تیری بلکتیاں پانی بن - (١٢٥)

خاک سر پر اوڑاتیاں تھیں - (١١٥)

ہم بغیر تیرے دنیا میں کیوں کر بھریں گیاں اور بغیر تیرے دیدار کے کیوں کر زندگی کریں گیاں — ہائے بابا کیا کریں گیاں ہم دو کھیاریاں - (٦٢)

اسی طرح فعل مونث مرکب میں فضلی دونوں جزو کو جمع کر کے لکھتا ہے ، مثلاً چھوڑتی تھیں کے بجائے چھوڑتیں تھیں ، کہتی تھیں کے بجائے کہتیں تھیں ' اڑاتی تھیں کے بجائے اوڑاتیا تھیں وغیرہ -

اعرابی حالتیں :

اضافی حالت : اردو میں حرف اضافت عموماً مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان واقع ہوتا ہے لیکن کربل کتھا میں عربی فارسی کی تقلید میں یہ وضع قائم نہیں رہی اور مضاف و مضاف الیہ ایک ساتھ لائے جاتے ہیں اور حرف اضافت ان کے بعد آتا ہے ۔ یہ صورت حال فارسی عبارات کے لفظی ترجمے سے پیدا ہوئی ہے اور اس کا اثر بعد کے نثری نمونوں میں بھی مل جاتا ہے۔ کربل کتھا میں جہاں توصیفی حالت میں یا فاعل و مفعول کے اظہار کے لیے حرف اضافت

دوبار آیا ہے۔ وہاں دونوں حروف مضاف اور مضاف الیہ کے بعد ایک ساتھ آئے ہیں ، جیسے کے کی ، کی کی ، کا کے وغیرہ ۔

ایسا شکور بے زوال کہ عام ہیں عطیات اوس کے ۔ (۱۶)

آگ عشق اوس کے کی بیچ انگیٹھی سینہ ہر کینہ میں روشن ہوئی (۱۹)
ایسا احد کہ دلیل احدیت اوس کی کی لم یلد ولم یولد ہے (۱۶)

جب لگ خواہین بیچ میدان مملکت لایزال اوس کی کے پانو سکونت سلوک راہ بندگی کا نہ رکھیں ۔ (۱۷)

فارسی اور دیسی لفظوں میں اضافت بھی ملاحظہ ہو :

بحر دوکھ ۔ مانند کھیل ۔
کپڑۂ حریر ۔ سیس فرزند ۔
صحن گھر ۔ سم گھوڑا ۔

اضافی ومجروری : اسی طرح اگر اضافی اور محروری حالت کسی جملے میں ایک ساتھ واقع ہو تو حرف اضافت 'کے' اور حرف جار 'سے' ایک ساتھ آتے ہیں :

بعد از واقف ہونے سب احوال شہادت مآل جگر گوشہ ہائے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سے ۔ (۲۷)

ایک فرزند فرزندان بزرگوار اوس کے سے ... دشت کربلا میں شربت شہادت کا چکھے گا ۔ (۳۶)
آواز اس کی سے ڈرے اور لرزے ۔ (۳۶)

اضافی و فاعلی : جب مشیت بے علت اوس کی نے بیچ تمشیت امور ایجاد و تکون کے تعلق پکڑی ۔ (۱۶)

ابتدائے سن رشد اور تمیز سے تا اب لگ کہ سن عزیز اوس کے نے حدود عشرین سے دو تین منزل تجاوز کیا ہے ۔ (۲۷)
سپاہ اوس کی نے جس طرف منہہ دیکھایا ۔ (۲۵)

اضافی و ظرفی: ایسا بادشاہ ...کہ ... عناں... عدالت بیچ ملک ہندوستان کے ...قبضہ' درایت اوس کے میں آئی - (۲۵)

ہمیشہ ...... تصریح کرنے حکایتوں اخبار حضرت امام حسین علیہ السلام کی میں مائل و راغب رھتا تھا - (۲۷)

مفعولی حالت : مفعولی ثانوی حالت میں جہاں "کے لیے" کے بجائے "کے واسطے" کا استعمال ہوا ہے وہاں ' واسطے ' اسم یا ضمیر سے پہلے آیا ہے ' یعنی بطور لاحقے کے نہیں بلکہ بطور سابقے کے :

واسطے اس خون کے کہ ہمارے تن سے گرا ہے - (۳۷)

بہشت واسطے اس کے ہے - (۴۰)

ظرفی حالت : ظرفی حالت میں دو خاص حروف بیچ اور اوپر استعمال ہوئے ہیں ' جو اب متروک ہو چکے ہیں - یہ بھی لاحقے کی حیثیت سے نہیں بلکہ سابقے کے طور پر آئے ہیں :

جب مشیت بے علت اوس کی نے بیچ تمشیت امور ایجاد و تکون کے تعلق پکڑی - (۱۶)

جب لگ خواقین بیچ میدان مملکت لایزال ... (۱۷)

اوپر ضمیر ارباب فضل اور اصحاب دانش کے مبین اور مبرھن ہوجیو - (۳۱)

ذیل کے جملے میں اوپر کے تقریباً تمام نکات کی مثالیں مل جائیں گی :

حمد بے غایت اور ثنائے بے نہایت شائستہ و سزاوار اوس کبریائے واجب الوجود کوں کہ بزرگی صفات کمال اوس کی کی درک افہام سے مبرا ہے، اور ... کمال صفات جلال اوس کے کا احاطہ اوہام سے معرا ، عقل عقلاؤں کی درک کرنے حقیقت ذات اور صفات اوس کی سے بیچ مضیق عجز و قصور کے اور فہم بلغاؤں کے پاونے بہید بلاغت اور فصاحت اعجاز کلام مجید اوس کے سے بیچ مقام حیرت و فتور کے ' ذات پاک اوس کی بیچ ہر جہت کے بہ حقیقت موجود ہے ' اور حقیقت ہر موجود کی بیچ پرتو نور وجود اوس کے کے نابود - (۱۰)

حذف حروف :

اضافی کی : جہان روشن اوس آنکھوں آگے اندھیر ھوا - (١١٠)

مفعولی کو : یہ کہہ جان جان آفرین سونپا - (١٢٨)

مفعولی ثانوی کے : ایک فاتحہ مخفی اس کام با نظام لیے بھی پڑھا - (٢٩)
حق تعالیٰ بہشت میں مکان نیک اوس لیے برپا کرے - (٣٩)

سببی سے :

سببی حالت میں 'سے' کے حذف سے اسم میں " وں " کا اضافہ ھوجاتا ھے - یہ خصوصیت کھڑی اور پنجابی میں مشترک ھے :

ھم نے کسوں کوں پیاسوں مت تپا - (١٠٨)

پیاسوں آوتی ھے مجھ آنکھوں میں اندھیاری - (١١٨)

یہ انداز بیان جدید اردو میں بھی ملتا ھے - میں نے اسے آنکھوں دیکھا - وہ بھوکوں مر گیا -

فاعلی نے :

اردو میں قاعدہ ھے کہ اکثر فاعلی حالت میں فعل متعدی کے ماضی مطلق ' تمام ' احتمالی اور حال قریب کے ساتھ علامت فاعلی 'نے' استعمال ھوتی ھے - کربل کتھا میں 'نے' کا وجود تو ملتا ھے ' لیکن اس کا استعمال خاصا بے قاعدہ ھے اور اکثر و بیشتر اسے حذف کردیا گیا ھے - شمالی ھند کی جن بولیوں سے اردوے قدیم کا خمیر اٹھا تھا ' ان میں علامت فاعلی 'نے' پنجابی اور کھڑی بولی سے مخصوص ھے* - پوربی ھندی اوربرج بھاشا میں اس کا وجود نہیں - ھریانی اور گجرتی میں 'نے' مفعولی اور فاعلی دونوں حالتوں میں آتا ھے مگر اردو میں یہ فاعلی حالت سے مخصوص ھے - کربل کتھا میں 'نے' کے استعمال میں جو بے ضابطگی ملتی ھے ' اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ھے

---

* 'نے' کے بارے میں میرا خیال ھے کہ پنجابی لفظ " نو " اصل تھی جس نے اردو میں داخل ھو کر ایک نیا مسئلہ کھڑا کردیا - (ع - ض)

کہ خود کھڑی بولی میں وسط اٹھارھویں صدی تک ' نے ' نے علامت فاعلی کی شکل میں جڑ نہیں پکڑی تھی -

ماضی مطلق میں ' نے ' کے استعمال سے اصل فعل لازم ہی کے طریقے پر آتا ہے ، یعنی مادہ فعل پر اضافہ الف کی شکل میں ، جیسے اس نے کہا ' انھوں نے فرمایا ' لیکن کربل کتھا میں جہاں جہاں ' نے ' استعمال نہیں ہوا ' مادہ فعل پر اضافہ الف کے بجائے اضافہ '' ے '' یعنی مضارع سے کام چلایا گیا ہے ' جیسے وہ فرمائے ، وہ کہے ، وغیرہ - چنانچہ پہلی حالت میں وحدت و جمع اور تذکیر و تانیث کا فعل پر کوئی اثر نہیں ہوتا جب کہ دوسری حالت میں مندرجہ ذیل صورتیں حاصل ہوتی ہیں :

غائب	واحد	جمع
مذکر	وہ فرمایا	وہ فرمائے
مونث	وہ فرمائی	وہ فرمائیں

یعنی ' نے ' کے حذف سے واحد ' جمع ' مذکر و مونث کی صورتیں مختلف ہوگئیں - کربل کتھا میں یہ سب استعمال ہوئی ہیں ' لیکن زیادہ تر جمع مذکر ہی ملتی ہے جو بنیادی طور پر مضارع سے مختلف نہیں :

جمع مذکر : پھر فرمائے اوس آگے - (۳)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرمائے - (۳۷)

جوں نظر حضرت کی مجھ پر پڑی ، فرمائے - (۴۰)

پاس اپنے بٹھلا فرمائے - (۴۰)

حضرت امیر دروازہ مسجد کوفہ میں پہونچ ، گھوڑے سے اتر ، قدم مسجد میں رکھے اور نماز ادا کر منبر پر سدھارے اور ایک خطبہ الٰہی اور نعت رسالت پناہی ادا فرما ، حاضروں کو عذاب الٰہی سے ڈرائے اور ثواب جاودانی سے امیدوار کیے پھر منبر کے داھنی طرف دیکھے ، حضرت امام حسن کوں دیکھ پوچھے - (۵۸)

حضرت نگاہ دوڑا دیکھے - (۱۲۸)

سلام کیے - (۵۴)

پھر پیشانی دونوں کی چوم رخصت کیے اور فرمائے - (۴۵)

واحد مونث : تب حضرت فاطمہ فرمائی - (۴۳)

جوں دولہن وہ آواز جاں نواز سونی ، خیمہ سے باہر دوڑ کہی - (١٠٨)

فاطمہ کہی - (٥٣)

کچھہ جواب نہ سونی ، پھر رو کر کہی - (٥٣)

جمع مونث : زینب کہیں - (١٣٢)

شہر بانو اوٹھیں اور ایک خلعت قیمتی شیریں کو پنہائیں- (١٦٥)

سکینہ کہیں - (١٣٢)

حضرت فاطمہ یہ خبر وحشت اثر سن رونے لگیں اور کہیں-(۴٦)

استعمال نے : شاہزادوں نے کہا اے اسما کبھو دیکھا ہے توں نے کہ بغیر ماں کہانا کہائے ہیں - (٥٣)

جوں حضرت فاطمہ نے یہ بات سونی - (۴۴)

حضرت نے فرمایا - (۴٥ ، ۴٦ ، ٣٩ ، ۴٣)

کربل کتھا میں استعمال ' نے ' کی مثالیں کم ہیں اور عام طور پر اسے حذف کردیا گیا ہے ۔ حذف نے کا یہ انداز قدیم اردو اور دکنی زبان میں مشترک تھا ۔ حامد حسن قادری نے کربل کتھا کی اس لسانی خصوصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فضلی کو ''دکنی الاصل'' قرار دیا ہے (داستان تاریخ اردو ' ص ٥٠) - اوپر کی بحث سے واضح کیا جا چکا ہے کہ متعدی افعال کی ماضی مطلق میں جمع مذکر کے لیے مضارع کا استعمال دکنی سے مخصوص نہیں ' یہ نتیجہ ہے محض علامت فاعلی ' نے ' کے استعمال میں بے قاعدگی کا جو دھلوی اردو میں بھی میر و سودا کے زمانے یعنی شروع انیسویں صدی تک پائی جاتی تھی - حاتم کی ایک غزل کی ردیف ہے ' ہیں ہم ' اور قوافی کئے ' دیے ' پیے ہیں ۔ فائز کہتے ہیں : ایک دیکھی میں بھنگیرن دلربا ۔ میر کا مصرع ہے : گل کو محبوب میں قیاس کیا ۔ چنانچہ کربل کتھا میں حذف ' نے ' کی بنا پر یہ قیاس کرنا کہ فضلی دکنی الاصل تھے یا ان کا بچپن دکن میں گزرا تھا، خلاف واقعہ ہے ۔

یہی معاملہ مراثی میں متحرک حروف کو ساکن کر لینے ، نون کو تقطیع میں حذف کر دینے ، ہائے ہوز کو دبا دینے اور مشدد حروف کو

مہمل کر لینے کا ہے ۔ ان امور میں دکنی کی تخصیص نہیں ۔ فضلی کا زمانہ شمالی ہند میں اردو شاعری کے دور اول کا ہے اور اس وقت شاعری میں یہ عجز زیادہ قابل اعتراض نہیں سمجھے جاتے تھے ۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ فضلی نے مراثی لکھے ہیں اور ''بکڑا شاعر'' یوں بھی ان پابندیوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا ۔

ضمائر :

بعض حالتوں میں ضمائر کی منصرف صورتوں میرے ، ہمارے ، تمہارے وغیرہ کے بجائے مجھ ، تجھ ، اور ہم استعمال ہوئے ہیں :

تجھ جود سے عرش و فرش آئے بوجود ۔ (١٥)

تجھ لطف اگر مدد نہ کرتا یارب ۔ (١٥)

مردوں سے جو کوئی کہ پہلے حوض کوثر پر مجھ پاس پہونچے ، توں ہووے گا ۔ (٣٥)

مسند جنت بنی ہے ہم لیے ۔ (٦٠)

مجھ لئے مرے گا ۔ (١٠٦)

ہم ساتھہ محشور ہو ۔ (٣٩)

کربل کتھا میں اضافی حالت میں ضمیر چونکہ مضاف کے بعد آتی ہے ، اس لیے جمعیت سے متاثر ہو کر لاحقہ '' وں '' یا '' یں '' اختیار کرتی ہے ۔

دریغ ان مونہوں تمہاروں سے کہ گرد غریبی سے بھریں گے اور افسوس ان بالوں تمہاروں سے کہ غبار یتیمی سے آلودہ ہوویں گے ۔ (٣٧)

باتیں میریں گر نہیں سونیں سن لو پھر پچھتاوگی ۔ (١٣٧)

پس قائم رکھو حکم ہماروں کوں ۔ (٣٩)

نعمتوں اپنیوں کو تمہارے اوپر تمام کیا ۔ (٣٢)

واو عاطفہ :

کربل کتھا میں عربی فارسی اور دیسی الفاظ کے درمیان واو عاطفہ بھی خوب خوب استعمال کی گئی ہے ۔ چند مثالیں دیکھئے :

بے جدو ماں - غم و دوکھ - کور و گڑھا - بہ جان و بہ تن -

کبھیں کبھیں جملوں اور مصرعوں کے دو اجزا کو واو عاطفہ سے جوڑا ہے مثلاً ' بعد آن حر و اس کا بھائی شہید - لایا ہے وو ران تلے و بیچ ہاتھہ -

ترتیب الفاظ :

کربل کتھا کے جملوں میں الفاظ کی ترتیب عام ہندوستانی ترتیب سے قدرے مختلف ہے اور بہت کچھ عربی فارسی کا انداز لیے ہوئے ہے - ہندوستانی میں اسم یا ضمیر جملے کے شروع میں اور فعل ہمیشہ آخر میں آتا ہے - لیکن کربل کتھا میں اکثر فعل جملے کے وسط میں اور اسم یا ضمیر اس کے بعد لائی جاتی ہے - عربی فارسی کی تقلید میں مضاف، مضاف الیہ اور جار مجرور کی ہندوستانی ترتیب بھی الٹ گئی ہے، جس کی مثالیں اعرابی حالتوں کے ذیل میں اوپر پیش کی جاچکی ہیں - شمالی ہند میں یہ انداز بیان مرزا رفیع سودا، میر محمد حسین عطا خاں تحسین ' شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر دہلوی وغیرہ کی نثر میں بھی ملتا ہے - دکنی اردو چونکہ عربی فارسی کے حد سے بڑھے ہوئے اثرات سے نسبتہً آزاد تھی اس میں بخلاف شمالی ہندوستان کی نثر کے یہ ترتیب نہیں ملتی، بلکہ وہاں فعل اکثر جملے کے آخر ہی میں آتا ہے - ہندوستانی میں عام قاعدہ ہے کہ پہلے مبتدا، پھر خبر اور بعد میں فعل ربط ' اور متعدی افعال کی صورت میں اول فاعل اس کے بعد مفعول اور اس کے بعد فعل خبر ہوتا ہے - کربل کتھا کے جملوں میں یہ ترتیب اکثر قائم نہیں رہتی، کبھی خبر پہلے اور مبتدا بعد میں اور کبھی خبر بعد میں اور فعل ربط پہلے آتا ہے - اسی طرح فعل متعدی کا مفعول بھی اس کے متصل قبل نہیں، مابعد بھی آسکتا ہے - نیز صفت اور تمیز بھی موصوف، اسم صفت یا فعل سے پہلے نہیں بلکہ بعد میں لائی جاتی ہے :

پیش ازیں کوئی اس صفت کا نہیں ہوا مخترع اور اب لگ ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نہیں ہوئی مستمع - (٣٨)

کس سن ہجری میں تصنیف یہ کتاب ہوئی - (٣١)

ادب چوکھٹ ہماری کا بھلا لایا - (٣٩)

خواب میں دیکھا مینے - (۴۰)
روز عاشورا حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت موں گیا میں - (۴۰)
المسمیٰ بفضل علی و المتخلص بہ فضلی .... کہ خوشہ چیں سب سخن فہموں کے کہلیان کا ہے - (۲۶)
یا الہی مجھ سے کیا واقع ہوئی خطا - (۳۵)
تجھسے بہی اوس درد کا شریک کیا ہم نے - (۳۵)
ایسی خبروں، خوشی افزا سے بوجھہ غم کا دل سے تیرے نہیں اوٹھتا - (۴۸)

الفاظ و املا :

زیر نظر کتاب کا متن نسخۂ اشپرنگر کی مدد سے تیار کیا گیا ہے - اس کی بعض خصوصیات املا کی حروف علت اور غنائی ، معکوسی اور ہکار آوازوں کے ذیل میں اشارے کیے جا چکے ہیں ' یعنی یہ کہ ہ اور ہائے مخلوط میں امتیاز نہیں کیا گیا - نون اور نون غنہ میں آخری حالت میں بھی کوئی فرق نہیں - ٹ ڈ ڑ معکوسی آوازوں کو تین نقطوں سے ظاہر کیا گیا ہے - کہیں کہیں ت اور ٹ میں فرق نہیں - دیسی الفاظ میں کسرہ کے لیے یائے معروف اور ضمہ اور فتحہ کے لئے بالترتیب واؤ اور الف کا استعمال کیا گیا ہے یعنی اعراب بالحروف ظاہر کیے ہیں -

کاتب کم سواد ہے - اس نے الفاظ کو کہیں توڑ کر علاحدہ علاحدہ (ڈھو نڈھ تا - بیٹ ی - بہن تا) اور کہیں بلاضرورت ملا کر لکھا ہے [آھمارے (آہ مارے) ظلمکی (ظلم کی)] - 'کے ' کے بجائے 'کہ' بھی لکھا ہوا ملتا ہے - مرکزوں اور نقطوں میں بھی کفایت شعاری سے کام لیا ہے - اس زمانے کے رواج کے مطابق غنائی مسموع اور غیر مسموع آوازوں یعنی ک اور گ میں ، اور یائے معروف و مجہول میں امتیاز نہیں کیا - اس کے علاوہ بعض دیسی الفاظ میں صفیری آواز س کو ث سے ظاہر کیا ہے - ذیل میں کربل کتھا سے بعض ایسے لفظ درج کیے جاتے ہیں جو موجودہ مروج املا سے مختلف انداز میں لکھے گئے ہیں :

اثی ۸۰ ، ۱۱۹ (اسی) ثات ۶ ، ۹ ، ۸۵ ، ۹۳ (سات)

سٹیں ۱۱۳ (سمیں) ڈھارث ۱۳۰ (ڈھارس) خواوند ۸۶ ، ۸۸ (خاوند) خانہ دان ۶۱ (خاندان) توباہ ۱۷۳ (توبہ) مردانہ گی ۱۲۰ (مردانگی) سکھینہ ۱۱۹ (سکینہ) دعوا ۱۰۸ (دعویٰ) پیٹ تا ۱۱۲ (پیٹتا) پیٹ تی ۱۱۳ (پیٹتی) کوملہا ۱۱۲ (کملا) ہیہاتھہ ۴ (ہیہات) وسلچہ ۱۶۳ (وصلچہ) معن ۲۹ (معاً) خانی ۲۸ (خوانی)

غریب الفاظ :

تڑپھنا - ۷۰ ، ۹۱ ، ۹۵ ، ۱۱۲ ، ۱۲۰ ، ۱۲۸ ، (تڑپنا)

کھوکرا - ۱۸۰ (کھوکھلا)

چھنالی - ۸۸ ، ۸۹ ، ۱۰۲ ، ۱۶۲ (چھنی لی)

اندھلا - ۶۷ (اندھا)

ہلکم : میں خرابوں میں خراب ہوتا پھروں ہوں ہلکم (۸۷)
[ہلکم : تہلکہ ، ہلچل ، اودھم (فرہنگ آصفیہ جلد ۴ ص ۴۲۷)]

ابرن : اب رنڈاپا ملے ہے دولہن کوں
نوچتی ہے وہ اپنے ابرن کوں (۱۱۳)
[ابرن : زیور]

پتہن : دیکھ قاسم توں اوس کی پتہن کوں
یاد کرتی ہر ایک سخن تیرا (۱۱۳)
[پتہن : بے قراری ، اضطراب] -

اوکنا : اوکتا قے کرتا رہا - (۶۷)
[ڈالنا - قے کرنا ، استفراغ کرنا ، زمین دیکھنا ، جی برا کرنا - آصفیہ ، جلد اول ، ص ۲۱۸]

پلچنا : اید ہر قاسم کی ماں لاش سے پلچی اور مونہہ سے مونہہ مل کھتی تھی - (۱۱۳)
[کتھنا ، لپٹنا ، چمٹنا - آصفیہ اول ص ۱۱۴]

الچھوں : بچہ کوں پانی تھی دو کہیا اے بچے
ہائے کن اچھوں کن مرادوں سے (۱۱۴)

تل اوپر کرنا : تمام لشکر کوں تل اوپر کر پراگندہ کیا - (۱۰۲)

لشکر کوں تل اوپر کر پھرا - (۱۲۶)　　[تلے اوپر کرنا]

کاھلا : اسما نے کہا ماں کا جیو کاھلا ہے - (۵۳) [کاھلا شاید کاھل سے ہے ' بمعنی بیمار]

نجھانا : میرا شفیق پدر مر گیا نجھاتی قبر - (۵۱)
سبھوں نے جو نجھا کر دیکھا - (۱۶۷)
اس سر کوں تنو سے نکال نجھا کر دیکھی - (۱۵۴)
جب خوب نجھا کر دیکھا تو سر امام حسین ہے - (۱۵۸)
نجھاتی ہوں وہ مچمچاتی جوانی - (۱۵۰)
جو تیری لوتھہ مچمچی کوں نجھا - (۱۱۳)
[نجھانا: غور سے دیکھنا ' تکنا (پلیٹس ۱۱۲۵)]

مچمچاتی : اوس بھتیجے نوجوان کی مچمچاتی لاش جب ... - (۱۱۲)
میرے بنے کی مچمچی لاش دیکھائی - (۱۱۴)
[مچمچانا : مستی کے جوش میں آنا ' گرمانا ' آصفیہ جلد ۴ ص ۳۰۰]

بھونڈ پیری : اے لوگو میں بھونڈ پیری تھی کیا جو میرے آتے دولہا موا تھی مجھ قدم ہی کی یہ بورائی - (۱۱۴)
[(واو لکھا جاتا ہے پڑھا نہیں جاتا) - لکھنؤ - منحوس ' سبز قدم (نوراللغات ج اول ص ۷۰۳)]

ھتھواسنا : ڈھال ھتھواسے کر پھر اوس ... پر حملہ کیا - (۱۱۰)
[تلوار سونتنا ' قبضے پر ھاتھ ڈالنا - آصفیہ جلد ۴ (ص ۷۰۰)]

ھڑکنا : دودھ بن اس شیر خوار ے کا ھوڑکنا دیکھیے - (۱۳۰)
[بچوں کا کسی چیز کو یاد کرنا ' کسی چیز کی جدائی میں بچوں کا مغموم اور افسردہ ہونا - آصفیہ ' ج ۴ ' ص ۷۱۴]

گھگیانا : مظلوموں نے گھگیا کر کہا (۸۹)
[(الف) گھگی بندھ جانا - خوف یا ڈر کے مارے سکتہ کا عالم ہونا -

(ب) گڑگڑانا ۔ عاجزی کرنا ۔ منت سماجت کرنا ۔
(آصفیہ ' جلد چہارم ص ۱۳۳)]

ڈاک لگنا : تمام رات ڈاک سے بے قرار رہے ۔ (۶۷)
درد پیٹ کا امام کوں شروع ہوا ' زمین پر لوٹنے لگے اور ڈاک نے غلبہ کیا ۔ (۷۰)
[متواتر قے ہونا ' آصفیہ ' جلد دوم ' ص ۳۱۸

کیا پیوں میں ہجر میں ساقی کہ لگ جانے کی ڈاک
بس گلو میرا بھی شیشہ کا گلو ہوجانے گا
ناسخ
(سرمایہ زبان اردو ' جلال لکھنوی)

معاون الشعرا میں پہلا مصرع یوں ہے :
ع کیا پیوں میں ہجر ساقی میں کہ لگ جانے کی ڈاک
لیکن اصل شعر یوں ہے :

کیا پیوں مے ہجر ساقی میں کہ لگ جاوے کی ڈاک
بس گلو میرا بھی شیشے کا گلو ہوجانے گا
(دیوان ناسخ دوم ' ص ۳۲ ' طبع کانپور ۱۹۰۷ء)]

تیر نہ تیزی : تیر نہ تیزی کی بیسویں تاریخ کہ وہ دن حضرت کے چہلم کا تھا (۱۹۱ ' ۲۹ ' ۱۷) [تیرہ تیزی : ماہ صفر جس کی تیرھویں تاریخ بری مانی جاتی ہے]

ھٹ پٹانا : پڑے گا چین تبھی جب کہ باپ کی گودی
مجھے ملے کی میرا جیو ھٹ پٹاتا ہے (۱۸۶)

سار : توں سار پیاسے کی کیا جانے ہے کنار فرات (۱۱۹) [سار : قدر ، قیمت ، منزلت ۔ آصفیہ ۳ ص ۶]

انا کانی دینا : میں رحم کر کے دیوں ہوں جیتی انا کانی
یہ پر آتے نہ میرا غضب ھی بہاتا ہے (۱۸۹)

[اغماض کرنا ' جان کر انجان بننا ' سنی ان سنی کرنا ' ٹال جانا :

دل میں کیا ہے کیا نہیں ہر کان سے غیروں کا ذکر
سن کے اس نے اے ظفر کچھ آنا کانی دے تو دی
[(آصفیہ ، جلد اول ، ص ۱۰۰)] ۔

نال : اس مجلس نویں میں شہادت پڑھوں ہوں میں
عباس علی محمد انس کی کہ نال ہے (۱۱۶)

[پنجابی ، نال بمعنی ساتھ : آصفیہ ۴ ، ص ۵۳۴]

خرفت ہونا : مرد پیر ہے اور خرفت ہوا ہے ۔ (۱۰۴)

[خرف : (ع) صفت ۔ وہ شخص جو پیرانہ سالی سے بدحواس ہو گیا ہو ۔ مہمل ، بے ہودہ ۔ (فقرہ) یہ خرف گفتگو مجھے پسند نہیں ۔ (نوراللغات ، ج دوم ، ص ۳۸۹)]

کلکلانا : ام کلثوم نے کلکلا کہا ۔ (۱۶۲)

[بد مزاج اور ترش رو ہونا ، آصفیہ ، جلد سوم ، ص ۵۴۳]

الما : لوہو کے المے میں مونہہ اپنا چھو پایا ۔ (۱۶۲)
[آلما : طاقچہ]

اونٹنا : ایک اصغر طرف اونٹے تہا جگر (۱۲۳) [جوش کھانا ، غصہ میں جلنا ۔ آصفیہ اول ، ص ۲۳۴]

ابانی : اب آئی ہوں گی عقل و سدہ سے ابانی ۔ (۱۵۲)
[اپانی : سیانی کی ضد]

کہکنا : .. کہ دوڑے کہک شامی سب ایک باری ۔ (۱۵۲)

[کہکنا : تیز آواز سے بولنا ، نہایت تپاک اور گرم جوشی سے کلام کرنا ۔ آصفیہ ۴ ، ص ۱۳۳]

بوھارنا : پلکوں سے تج کوں بوھارے جا بہ جا
تیری اب جاروب مجہ مژگاں ہے (۱۲۳)

[بہارنا: جھاڑنا ، جھاڑو دینا ، صاف کرنا ۔ آصفیہ ۱ ، ص ۳۲۰]

چیتا ہونا : دشمنوں کے ہوئے ہیں اب چیتے
شیر نر باپ کے کہاں گیا تو (۱۲۷)
[چیتا : فہم ' عقل ' خیال - آصفیہ ۲ ، ص ۱۳۹]

کاول ٹلنا : ہاں ماں جایا ہمارا ہم سے کل
بچھڑے کا کیوں کر یہ کاول جاوے ٹل (۹۸)
[آفت و بلا رفع ہونا ' مصیبت دور ہونا :

ہمیں غش آ گیا تھا وہ بدن دیکھ
تری کاول ٹلی ہے جان ڈر سے
آصفیہ ۳ ، ص ۵۳۵]

اینچ : کربل کتھا میں یہ لفظ کھینچ کے معنی میں ۳۸ بار استعمال ہوا ہے - فرہنگ آصفیہ میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے : " کھینچنا ' کشش کرنا ' گھسیٹنا ، تاننا ' کسنا ' اپنے ذمہ لینا ' ضامن ہونا ' اوٹنا " (جلد اول ص ۲۳۲) - دو مرکب الفاظ ' اینچا تانا : " ایک طرح کا بھینگا " اور اینچا تانی : " کشا کش ' لڑائی جھگڑا " میں بھی یہ جزو اول کے طور پر آتا ہے - جدید اردو میں اینچنا یعنی کھینچنا مستعمل نہیں ' گو علاوہ جامع مسجد دھلی کی عوامی بولی میں یہ ابھی تک اس معنی میں بولا جاتا ہے اور کھڑی بولی کے بعض اضلاع میں ' کھینچنا اینچنا ' یعنی بطور تابع مہمل استعمال ہوتا ہے - کربل کتھا سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

جواھر الفاظ جوں کر پیچ رشتہ بیان کے اینچے - (۱۰)
پاہوں میری زیارت سے نہ اینچیو - (۵۳)
سلام مجھ دل جلے کا اور غم و دوکھہ اینچے ہووے کا عرض کیجیو - (۵۴)
آگ دشمنی اس کی نے شعلہ اینچا - (۵۸)
آہ درد ناک اپنے جگر جلے سے اینچے - (۱۳۶)
یحییٰ ذوق محبت سے شمشیر اینچا - (۱۶۳)

کربل کتھا میں مندرجہ ذیل ہندی الفاظ بھی ملتے ہیں جو اب اردو میں متروک ہو چکے ہیں :

جیو ' ۵۳ (جی) بہتر (۹۷) سٹ ' ۸ (پھونک) چنگے : '' جو ہیں بیمار چنگے هوویں سب'' (۸) نپٹ ' ۱۲ (بہت ' پوری طرح سے) تج (۴) سیس (۵) نین (۲) سوندنا (۳۶) بسرام (۱۲) جگ (۲۲) نت (۲۷) لوتھہ ' ۱۰۱ (لاش) رن (۱۲۱) جیبھہ (۱۱۸) جبہ (۱۲۳) ندان ' ۱۱۷ (بعد میں ' پیچھے) رن سینگی ۹۹ (جنگ کا نقارہ) اندھیار ' ۱۱۷ (اندھیرا) انجھو ۱۱۸ (آنسو) گھنیرا ' ۱۲۰ (بہت ' گھنا) بھوئیں ' ۱۲۰ (زمین) دوھاگن ۱۰۵ (ضد سہاگن) سوھاتی ' ۱۱۳ (راس آئی) ۔

بنجامن شلز

نیر اقبال

۶ مئی ۱۴۹۸ء کو واسکوڈی گاما کالی کٹ کے ساحل پر لنگر انداز هوا ـ اس کے فوراً بعد هی هندستان میں اهل یورپ کی آمد کا عظیم سلسله شروع هوا ـ ان آنے والوں میں وه تجار بھی تھے جو یورپی کاخ و ایوان کو هندوستان کی اساطیری دولت سے جگمگا دینا چاهتے تھے ـ وه دلاور بھی تھے جو هندوستانی زمینوں پر فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑ کر اپنی همت و شجاعت کی زندهٔ جاوید یادگاریں چھوڑ جانا چاهتے تھے اور وه مذهبی دیوانے بھی تھے جن کے پیش نظر اپنے ذاتی فائدے نہیں تھے اور جو لاکھوں دکھ اٹھا کر ''کفر'' کے اندھیروں میں گھری هوئی افروشیائی دنیا کو عیسائیت کے نور سے منور کرنا چاهتے تھے ـ موخرالذکر لوگوں نے براه راست عوام سے تعلق قائم کیا ـ ان لوگوں نے هندوستان کے حالات کا مطالعه کرنے کے بعد اپنے لائحه عمل کو خاص طور پر دو باتیں مد نظر رکھتے هوئے طے کیا ـ اول تو ان تمام نیچی ذاتوں کو عمل کا مرکز قرار دیا جن کو هندستانی تہذیب کے اعلیٰ طبقے نے برادری باهر کر دیا تھا ـ دوسرے ان کے دلوں تک براه راست پہنچنے کے لیے ان کی بولیوں سے واقفیت بہم پہنچانا شروع کی ـ یقیناً یه بولیاں اعلیٰ کلاسکی درباری اور ادبی زبانوں سے الگ عامیانه ، بازاری اور خام رهی هوں گی ـ یہی وجه هے که ان مشنریوں کی مرتب کی هوئی قواعد اور لغات اور ان کے کئے هوئے بائیبل کے تراجم زبان کی خامیوں کی بنا پر کچھ عرصه بعد هی وقت کے هاتھوں رد هوتے چلے گئے ـ ابتدا میں ان لوگوں کا دائرهٔ عمل بیشتر دکن تک محدود رها اور ان لوگوں نے ابتدائی دو صدیوں کے اندر تمام دکنی ورناکیولر زبانوں میں قواعد لغات اور تراجم کا وافر ذخیره فراهم کر دیا ـ اس وقت دکن کا بیشتر حصه ایسی حکومتوں کے زیر نگیں تھا جن

کی درباری سرکاری زبان اردو تھی لیکن حیرت کا مقام ہے کہ سترھویں صدی کی ابتدا تک اہل یورپ کے اس زبان سے واقفیت کے کوئی شواھد نہیں ملتے - غالباً اس کی یہ وجہ ھو کہ دکن میں اس کی حیثیت وھی رھی ہے جو شمالی ہندستان میں فارسی کی تھی - یعنی یہ خالص درباری سرکاری زبان کی افادیت رکھتی ھو اور اسی لیے براہ راست عوام سے تعلق رکھنے والے مشنریوں نے اس کو در خور اعتنا ھی نہ سمجھا ھو - بہر حال وجہ کچھ بھی ھو سترھویں صدی کے اوائل سے اہل یورپ کی ھندستانی زبان سے انفرادی واقفیت کے شواھد فراھم ھوتے ھیں - سترھویں صدی کے اواخر میں جان جوشوا کیٹلر نے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کے فائدے کے پیش نظر ھندستانی زبان کے قواعد و لغت ترتیب دیے - اور بائبل کے بنیادی دس احکامات کا ھندستانی زبان میں ترجمہ کیا -

کیٹلر نے جس زبان کا مطالعہ کیا وہ شمالی ھند کی بول چال کی زبان تھی - دکنی اردو کو سب سے پہلے تالیف و ترجمہ کے لیے پروٹسٹینٹ مشنری بنجامن شلز نے منتخب کیا - اس نے ھندستانی کی ایک قواعد تالیف کی اور پوری بائبل اور بہت سی دعاؤں کو ھندستانی میں منتقل کیا - اس کی تالیف کی ھوئی قواعد ھندستانی کی دوسری اور دکنی اردو کی پہلی قواعد کہی جا سکتی ہے -

عیسائی مشنوں کی تاریخوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ھے کہ افروشیائی ممالک میں جانے والے مشنری بیشتر بے حد ذھین اور یورپ کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل ھوتے تھے اور ان کو مروجہ علوم اور کلاسیکی زبانوں پر زبردست دسترس حاصل ھوتی تھی - وہ ممالک مقصود میں پہنچنے کے بعد وھاں کے علوم و فنون اور زبانوں سے واقفیت بہم پہنچانے کی کوشش کرتے تھے - ان لوگوں میں سے چند ایک نے تو ان ممالک کے علوم و فنون اور ترویج عیسائیت کی تاریخ میں ناقابل تسخیر مرتبہ حاصل کر لیا ھے - شلز بعض وجوہ کی بنا پر علوم و فنون کے میدان میں اتنا بلند مقام حاصل نہیں کر سکا لیکن پھر بھی پروٹیسٹینٹ مشنوں کی تاریخ میں وہ خاصہ اہم ھے -

ان مشنریوں نے اگرچہ علم و ادب کی تاریخ میں بہت اہم کردار ادا کیا ھے لیکن ان لوگوں میں سے ماسوا چند ایک کے باقی تمام لوگوں کے سوانحی حالات مرتب کرنے کی طرف بہت کم دھیان دیا گیا ھے - اگر ان تمام اہم

مشنریوں کے سوانحی حالات مرتب کئے جائیں تو ان سے ایک طرف تو بیشتر یورپی ممالک کی افروشیائی ممالک سے متعلق سیاسی اور مذہبی حکمت عملی اور دوسری طرف متعلقہ افروشیائی ممالک کے تہذیبی اور سماجی حالات کا بے حد تفصیلی مطالعہ کرنے کا موقع ملے گا ۔

شلز بھی اسی مبینہ بے توجہی کا شکار ہے ۔ ہندوستان میں دورہ کرنے والے پروٹیسٹینٹ مشنوں کی تاریخوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا بیشتر حصہ اس کے قیام ہندستان سے متعلق ہے ۔ وہ کہاں اور کب پیدا ہوا ، اس کی ابتدائی زندگی کیسے گزری ، کس طرح اس کو ہندوستان سے دل چسپی ہوئی ، ان باتوں کی قرار واقعی وضاحت کہیں بھی نہیں ملتی ۔ اس طرح ہندستان سے واپسی کے بعد کی زندگی بھی نیم تاریکی میں ہے ۔

قومیت :

سترھویں اور اٹھارویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں ڈینش ایسٹ انڈیا کمپنی اور ڈینش حکومت نے اپنے قرب وجوار کے ملکوں کے سینکڑوں نوجوانوں کو ملازمت دے کر اس طرح اپنے اندر ضم کر لیا کہ اکثر و بیشتر ان کی ملکی خصوصیات کھو گئیں ' حتیٰ کہ ان کے نام کے آبائی تلفظ کے بجائے ڈینش تلفظ رواج پا گئے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی قومیت کا تعین ایک دشوار مسئلہ بن گیا ہے ۔ شلز کے سلسلے میں بھی کچھ ایسا ہی اختلاف رائے ہے ۔ بک لینڈ نے اپنے " تذکرے " میں اس کی قومیت ڈینش لکھی ہے اور مقام پیدائش سونن برگ ۔ لیکن پروٹیسٹینٹ مشنوں کی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جرمن تھا ۔ حالانکہ ان تاریخوں میں اس کی ابتدائی زندگی کے کوئی مستند حالات نہیں ملتے اور نہ اس کی جرمن قومیت کے بارے میں کوئی مدلل اور ٹھوس ثبوت ملتے ہیں ، لیکن پھر بھی بعض ایسے شواھد فراہم ہوئے ہیں کہ اس کا جرمن ہونا ہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے ۔ بیرلن اس کی بارے میں کہتا ہے :

" دن کے بوجھ اور تپش کے بعد وہ اپنے حجرۂ تنہائی میں پناہ لیتا اور ایک خوش گوار جرمن دعا کے ذریعے اپنے دل کو تقویت بخشتا اور اپنے کو خدا کی راہ میں تر و تازہ کرلیتا " ۔

اس کے بعد وہ شلز کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے :

"گاؤں میں پہنچ کر وہ گلی میں رک جاتا اور ایک دعا پڑھنا شروع کردیتا چالیس گلوں سے ابھر تی ہوئی ایک جرمن دھن جلدی ہی بہت سے آدمیوں کو متوجہ کرلیتی" -

اس سے اندازہ ہو تا ہے کہ جرمن زبان ہی اس کی مادری زبان تھی اور جرمن دھنیں اس کی اپنی فطری دھنیں تھیں - ٹرانکوبار پروٹیسٹنٹ مشن کی تاریخ میں اس کو جرمن کہتا ہے اور سونن برگ کا باشندہ بتاتا ہے -

ہندستان میں ورود:

شلز ۱۶ ستمبر ۱۷۱۹ء کو ٹرانکوبار کے ساحل پر لنگر انداز ہوا - چند ماہ پیشتر اہم پروٹیسٹنٹ پادری زنگن بالگ کی وفات ہوچکی تھی اور دوسرا اہم پروٹسٹینٹ پادری گرونڈلر ٹرانکوبار مشن کا صدر تھا اس کی صحت بہت خراب ہوچکی تھی - یہ دونوں پادری ہندوستان کے اندر پروٹیسٹنٹ مذہب کی تبلیغی تحریک کے بانیوں میں سے تھے -

لوتھیرین چرچز کو غیر عیسائی ممالک میں عیسائیت کی تبلیغ کا خیال بہت دیر میں آیا ، تقریباً سترھویں صدی کے اواخر میں - اس وقت تک تبلیغ عیسائیت کا تمام بار رومن کیتھولک مشن ہی اٹھاتے رہے تھے - ہندستان میں سب سے پہلا لوتھیرین مشن ڈنمارک کے بادشاہ فریڈرک چہارم نے ڈینش ہالے مشن کے نام سے بھیجا ، اس میں دو جرمن مشنری بورتھیلمیو زنگن بالگ اور ہنری پلشو تھے - یہ کوپن ہیگن سے ۲۹ نومبر ۱۷۰۵ء کو روانہ ہوئے اور ٹرانکوبار کے ڈینش علاقے میں ۹ جولائی ۱۷۰۶ء کو لنگرانداز ہوئے - ان لوگوں نے آتے ہی ہندستانی زبانوں میں بائیبل کے ترجمے کی طرف توجہ دی اور اسکول قائم کئے ، کچھ عرصے بعد ہی گرونڈلر بھی آ کر ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو گیا -

۱۷۱۹ء میں جب زنگن بالگ نے وفات پائی ہے ، اس وقت تک پورا عہدنامہ جدید اور عہد نامہ قدیم کا بڑا حصہ کتاب رتھ تک تامل میں منتقل ہو چکا تھا - ان لوگوں نے ایک تامل لغت بھی تالیف کی تھی ، اسکول کھولے تھے اور تبلیغ کے کام کی تربیت مقامی نوعیسائیوں کو دینے کے لیے ایک مشن سیمنری قائم کی تھی -

شلز جس وقت ہندستان پہنچا ہے وہ سند یافتہ پادری نہیں تھا -

۳۱ جنوری ۱۷۲۰ء کو گرونڈلر نے اس کو یہ سند عطا کی اور ۹ ۱ مارچ ۱۷۲۰ء میں اس کا بھی انتقال ہو گیا - اس وقت ٹرانکوبار مشن میں صرف تین نوجوان ناتجربہ کار مشنری تھے ، شلز ، دال اور کسٹ مین کر - یہ تینوں ساتھ آئے تھے اور ابھی ان لوگوں کو ہندوستان آئے صرف چند ہی ماہ ہوئے تھے - لوگوں کا خیال تھا کہ اب مشن کا کام منتشر ہو جائے گا لیکن شلز کی قابلیت نے نہ صرف اس کو برباد ہونے سے روک لیا بلکہ مزید ترقی کی راہ پر گامزن کیا - اس سلسلے میں اس کو زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ، سب سے پہلی مشکل تو یہ تھی کہ وہ تنہا سندیافتہ پادری تھا - اس کے کندھوں پر مشن کے تمام کاموں کی ذمہ داری تھی ، اس کو نہ صرف تامل لوگوں کی خبرگیری کرنی پڑتی تھی بلکہ پرتگالیوں کے مذہبی راہنما کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے تھے - حالانکہ اس کو نہ تامل زبان پر عبور حاصل تھا اور نہ پرتگالی پر ، اس کے ساتھیوں کی معلومات اس سے بھی کم تھیں - شلز کو ساتھیوں سے ناموافقت بھی ملی - اس کے ساتھ کے دونوں مشنریوں میں سے کسٹ مین کر ہمیشہ بیمار رہتا تھا ، ۱۷۲۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا ، اس سے شلز کو اپنے کاموں میں بہت کم مدد ملی - دوسرا مشنری دال کچھ جھگڑالو طبعیت کا آدمی تھا اس کی وجہ سے شلز کو بہت سی پریشانیاں اٹھانی پڑیں - رومن کیتھولک مشنری ان لوگوں سے دشمنوں کا سا برتاؤ کرتے تھے ، وہ ہندستان میں اپنی تقدیم کا فائدہ اٹھا کر ان کو سخت عاجز کرتے تھے - ان سے ان لوگوں کو زبردست نقصان پہنچے اور ان لوگوں نے ان کے ذریعے جسمانی طور پر بھی خوب تکلیفیں اٹھائیں -

شلز بے حد قابل آدمی تھا ، اس نے ان مشکلات پر جلد ہی قابو پانے کی کوشش کی - نئی زبانیں تحصیل کرنے کی وہ لاثانی صلاحیت رکھتا تھا - صرف ایک ہی ماہ میں اس نے تامل پر قدرت حاصل درلی اس کے بعد ہی اس نے پرتگالی زبان میں مہارت بہم پہنچائی اور پرتگالی اور تامل میں خطبے پڑھنے شروع کئے - اس زمانے میں اس کو مختلف دعائیں تامل میں منتقل کرنے کا خیال آیا اور اس نے بہت سی دعاؤں کا اس زبان میں ترجمہ کر بھی ڈالا - اس کے بعد ایک برھمن کی مدد سے زنگن بالگ اور گرونڈلر کے چھوڑے ہوئے توریت کے باقی حصے کو بھی تامل میں منتقل کر دیا -

مدراس:

مئی ۱۷۲۶ء تک شلز ٹرانکوبار میں رہا ، اس کے بعد مدراس چلا گیا ۔ وہ مدراس کیوں گیا ، اس سلسلے میں اختلاف رائے ہے ۔

برلین کے خیال کے مطابق اس کو زنگن بالک کی طرح چھوٹی سی ڈینش کالونی کی حدود کے آگے بھی تعلیمات خداوندی پھیلانے کی خواہش تھی ، اس لیے وہ مدراس گیا ۔

لاہ مین کہتا ہے کہ اقتدار عالی کی خواہش کے مطابق وہ مدراس گیا ، ہو سکتا ہے کہ مشنری دال کے ساتھ اتنے اختلافات بڑھ گئے ہوں کہ اس کو ٹرانکوبار چھوڑنا پڑا ہو ۔

وہ میکسا جیسیمہ کے اگلے دن مدراس کے لئے روانہ ہوا ، کڈلور تک اس نے جہاز سے سفر کیا ، خشکی کا راستہ تنجور کے علاقے سے گزرتا تھا ۔ اس زمانے میں تنجور کے حکمران اجنبی مسافروں تک سے تحفظ کی ضمانت کے لیے بھاری بھاری محصول راہداری وصول کرتے تھے ، ان کا یہ عمل سخت تکلیف دہ تھا ۔ شلز کڈلور سے چیلم برم گیا اور پھر وہاں سے واپس آ گیا ۔ کڈلور میں اس نے تبلیغ دین کی اور وہاں کے اسکولوں کا معائنہ کیا ، ۸ مئی ۱۷۲۶ء کو اس نے مدراس میں ورود کیا لیکن اس زمانے میں اس نے مدراس میں زیادہ دن قیام نہیں کیا بلکہ شمال میں پولی کٹ تک کے علاقے میں سفر کیا ، یہ شہر تامل علاقے کی شمالی سرحد پر تھا اس کے بعد وہ ساحل چھوڑ کر ملک کے اندر مغرب میں بڑھتا گیا اور بائبل کی تعلیم پھیلاتا گیا ۔

معلوم ہوتا ہے کہ شلز مضبوط جسم کا تندرست و توانا آدمی تھا کیونکہ اس نے یہ تمام سفر پیدل ہی کیا تھا ، اس کے ساتھ صرف ایک دیسی ہمراہی ہوتا تھا جو انتہائی ضروری اشیا اور گھاس کی ایک چٹائی لیے رہتا تھا ۔ شلز ہندستانیوں سے مانگ کر کھانا کھا لیتا تھا ۔ یہ کھانا عموماً چاول اور شوربا ہوتا تھا اور اس میں بے حد لال مرچیں ہوتی تھیں ۔ کھانے کے تمام ظروف صرف پتوں کے ایک دونے اور ایک چمچے پر مشتمل ہوتے تھے ۔ گاؤں کے لوگ پتوں کو جوڑ کر پتل بنا دیتے اور اس پر کڑھی چاول ڈال دیتے ۔ چمچا وہ ہر وقت جیب میں رکھتا تھا ۔ رات کو کسی جھونپڑی کے اندر یا اس کے قریب چٹائی بچھاتا اور سو جاتا ۔ وہ سال کا سب سے

گرم موسم تھا ، کبھی کبھی دھوپ میں چلتے چلتے اس کے سر میں درد ہو جاتا تو اس کو کسی درخت کی پناہ لینی پڑتی - اس طرح اس نے مہینوں سفر کیا ، دیسوں کے اسکول دیکھے اور سینکڑوں دیہاتوں میں تبلیغ دین مسیح کی - آخر کار جولائی میں وہ ننگے پیر خراب و خستہ حالت میں مدراس واپس پہنچا لیکن چودہ دن میں ہی وہ پھر اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے کے قابل ہو گیا -

مدراس میں سب سے پہلا مشن اسٹیشن اسی نے قائم کیا - یہ مشن پہلے ڈینش انداز کا تھا ، ۱۷۲۸ء میں اس کا انتظام انگلینڈ کی ایس پی سی کے* نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور شلز کو اس کا پہلا مشنری صدر مقرر کیا -

شلز نے مدراس میں مالاباری بچوں کے لئے اسکول قائم کیا - ویسٹ کوٹ کی لکھی ہوئی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اسکول کا اشتہار ۵ ستمبر ۱۷۲۶ء کو بلیک ٹاؤن کے چاروں دروازوں پر چپکایا گیا تھا - اس کی یہ تجویز عام آدمیوں میں بہت مقبول ہوئی ، ۹ دن بعد ہی اس اسکول کی ابتدا ہو گئی ، اس میں سب سے پہلے ۱۲ بچوں نے داخلہ لیا -

بیرلین سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نہ صرف بچوں نے داخلہ لیا بلکہ بالغوں نے بھی اس میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا ' یہاں تک کہ شلز کو ان کے واسطے الگ وقت مقرر کرنا پڑا -

شلز نے مدراس میں مشن کے کاموں کے لیے ایک مکان کرائے پر لیا ، بعد میں ایک مکان خرید لیا ، اس مکان کی خرید ۲ جولائی ۱۷۲۹ء کو ہوئی - شلز نے مدراس کے کس حصہ میں مکان خریدا تھا ، اس کا تعین مشکل ہے - ٹیلر کا خیال ہے کہ شلز کا مکان جون پویرا میں تھا اور اس زمانے میں اس سے ایک باغ بھی ملحق تھا - ویسٹ کوٹ کا بھی یہی خیال ہے کہ مکان جون پویرا کے باغ کے ایک حصہ میں تھا کیونکہ یہ جگہ وھائٹ ٹاؤن سے بھی دور نہ تھی اور گاؤں کے درمیان میں تھی -

مدراس میں ہی شلز نے تیلیگو اور ہندستانی زبانیں سیکھیں - ان مشنریوں میں بہت سی انسانی کمزوریاں بھی تھیں ، اکثر و بیشتر ان میں جھگڑے بھی ہو جایا کرتے تھے ، کبھی ان جھگڑوں کی بنیاد ذاتی پرخاش ہوتی تھی اور کبھی

---

* Society of Promoting Christian knowledge.

طریقہ کار کا اختلاف۔ ۱۷۳۲ء میں ایک مشینری گیسٹر مدراس آیا، یہ انگلش طرز تبلیغ کا حامی تھا ۔ اس میں اور ڈینش طرز تبلیغ کے حامیوں میں زبردست اختلافات ہو گئے ، یہاں تک کہ شلز اپنی ادبی مصروفیات کے سہارے گوشہ‌نشین ہو گیا ۔ ۱۷۳۷ء میں گیسٹر اور سر ٹوربس دونوں کولڈر چلے گئے ، اس کے بعد شلز دوبارہ اپنے تبلیغی کاموں میں مصروف ہوگیا ۔

واپسی :

۱۷۴۲ء یا ۱۷۴۳ء میں شلز اپنے وطن واپس چلا گیا ۔ اس کی واپسی کے اسباب تحقیق طلب ہیں ، عموماً تاریخوں میں یہی درج ہے کہ اس کو خرابی' صحت کی وجہ سے ہندوستان چھوڑنا پڑا لیکن بعض اشارے ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس کے پیچھے اور عوامل بھی کام کر رہے تھے ۔ بڑی وجہ یورپی ملکوں میں مشن کے انتظامیہ کی سیاست معلوم ہوتی ہے ۔

ویسٹ کوٹ اس سلسلے میں رقم طراز ہے :

"معلوم ہوتا ہے حکام عالی اس بات پر متفق نہیں تھے کہ شلز کی واپسی کے واقعہ کو قابل افسوس سمجھیں یا نہ سمجھیں ۔ ان سالوں میں جب کہ وہ مدراس میں اکیلا تھا اور اس کے ساتھی کڈلور جا چکے تھے ، گزشتہ سالوں سے زیادہ ترقی ہوئی لیکن یورپ میں مشن کے حکام عالی اس کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے ۔ پھر بھی آخر میں یہ بات کہنی غیر معقول نہ ہوگی کہ اس نے اپنی گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے اپنی ذمہ داری پر ہندستان چھوڑا" ۔

ٹیلر اس سلسلے میں کہتا ہے :

"کئی سال پہلے جب میں شلز کے ہندستان سے واپس آنے کے اسباب کی تلاش کر رہا تھا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ واپس بلایا گیا تھا ۔ لیکن یہ بات لازمی طور پر غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایسا صرف اسی صورت میں سمجھا جا سکتا تھا جب جرمنی میں اس کا عمل زیادہ افادی ہوتا" ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہالے میں فرنک کے ادارے کے عالی حکام بھی اس سے خوش نہیں تھے ۔

ایسا بھی ممکن ہے کہ ڈینش اور انگلش طریقہ' تبلیغ کے اختلافات بھی

شلز کی واپسی پر اثر انداز ہوئے ہوں کیونکہ ہندوستان میں مشنری کاموں میں 'ایس پی سی کے' کے عمل دخل کے بعد یہ اختلافات بہت بڑھ گئے تھے -

۱۷۳۲ء میں گسٹیر لنڈن سے انگلش مشنری کے طور پر بھیجا گیا ، اس نے ہندستانی مشنوں میں انگلش طریقہ تبلیغ کو رواج دیا - شلز ڈینش طریقہ تبلیغ کا حامی تھا - گسٹیر اور شلز کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہوا ، لازمی طور پر گیسٹر کی پشت پناہی 'ایس پی سی کے' کے اعلیٰ حکام کر رہے ہوں گے- شلز جو طبعاً خود سر بھی تھا ؛ اس برتاؤ کو برداشت نہ کرسکا ہوگا اور ہندستان سے چلا گیا ہوگا - اسی مسئلے پر گسٹیر کا فبریکس سے بھی زبردست جھگڑا ہوا ، یہ ایک اور قابل مشنری تھا جو ڈینش ہالے مشن سے متعلق تھا-

ہالے میں :

ہندستان سے جانے کے بعد اس نے عام طور پر کیسے زندگی گزاری ، اس سلسلے میں ہم کو کوئی معلومات نہیں فراہم ہوتیں - سوائے اس کے کہ وہ ہالے میں یونیورسٹی سے متعلق تھا اور وہاں تالیف و ترجمہ کا کام انجام دے رہا تھا -

بیرلین سے معلوم ہوتا ہے کہ ہالے میں اس کا قیام ویسن ہاس میں رہا اور وہ کام کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا -

ٹیلر سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے ہالے سے ڈیوڈسیمیو شائع کروائی تھی جس میں جون ارنٹ کی تصنیف اسپیکیولم کا کناڑی ترجمہ جو خود شلز نے کیا تھا ، بھی شامل تھا - ٹیلر اس ترجمے کے بارے میں کہتا ہے کہ اس کی زبان ناہموار تھی اور خامیوں سے مملو تھی -

جب شوارز ۱۷۴۶ء میں ہالے کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے گیا ہے تو شلز وہاں موجود تھا اور انجیل کے ایک نئے ایڈیشن کی طباعت کی تیاری میں مصروف تھا - اس نے شوارز کو تامل زبان سیکھنے کی ترغیب دی تاکہ وہ شلز کو اس کی طباعت کے کام میں مدد دے سکے - شوارز بعد میں بہت بڑا پروٹیسٹنٹ مشنری ہوا - لاہ مین نے اس کا تذکرہ واجہ گرو کے نام سے کیا ہے -

کردار :

شلز زبردست صلاحیتوں کا مالک تھا ، اس میں جسمانی طاقت کی بھی افراط تھی اور ذہنی قوتوں کی بھی - ہندستان میں ورود کے وقت وہ غیر سند یافتہ تھا اس کے ساتھ دو مشنری اور بھی تھے اور دونوں غیر سند یافتہ تھے - گرونڈلر کی قیافہ شناس نگاھوں نے چند روز میں ھی اس کی صلاحیتوں کو پرکھ لیا اور آمد کے صرف چھ ماہ بعد ھی اس کو سند عطا کر دی - گرونڈلر کے بعد شلز کے کاندھوں پر ھی مشن کے کاموں کا سب بوجھ آپڑا - اس وقت تک شلز کو نہ تو یہاں کی زبانیں ھی اچھی طرح آتی تھیں اور نہ اس کو رسم و رواج کا ھی اچھی طرح علم تھا - تمام خیرخواہ اور بدخواہ مشن کے مستقبل کی طرف سے مایوس ھوگئے لیکن شلز نے ھمت نہیں ھاری اور پھر اس کے مخالفین کو بھی اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ یہ شلز کی ھی شخصیت تھی کہ پروٹسٹنٹ مشن کا کام ھندستان میں زندہ رھا -

وہ مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا اور اس میں اپنے کام کی بے پناہ لگن تھی - جس کام کو ھاتھ میں لیتا تھا اس کو پایہ' تکمیل تک پہنچاتا تھا - اس نے جس مستعدی کے ساتھ ھندستانی زبانوں پر عبور حاصل کیا وہ حیرت انگیز ھے ، اسی طرح اس نے جس استقلال کے ساتھ ترجموں کا کام پایہ' تکمیل تک پہنچایا وہ بھی کم قابل ستائش نہیں ھے ، اس کی قوت ارادی اور لگن کا نمونہ اس کا دکھنی ریاستوں کا دورہ بھی ھے - یقینی طور پر وہ مضبوط جسم کا مالک بھی رھا ھوگا - ورنہ اتنی جسمانی سختیاں جھیل کر اتنی آسانی سے وہ چودہ دن میں صحت یاب نہ ھو جاتا -

لیکن وہ خودسر طبیعت کا آدمی معلوم ھوتا ھے - ھو سکتا ھے اپنی صلاحیتوں کا اس کو شعوری احساس بھی ھو اور ھالے کے پروٹیسٹینٹ مشن کے ادارے کے سرپرست نوجوان فرینک کے غیر ھمدردانہ رویہ نے اس کو تنگ دل بنا دیا ھو - بہر حال وہ غیر سند یافتہ پادریوں کو کاگ کہنا بھی پسند نہیں کرتا تھا -

غالباً اس میں مصلحت پسندی نہیں تھی ، نہ وہ مخالفوں سے سمجھوتہ کرنا جانتا تھا - اس سے بہتر اس کو یہ معلوم ھوتا تھا کہ وہ خاموشی کے ساتھ میدان چھوڑ جائے - ٹرانکیبار میں ایک طرف دال نے بہت زیادہ مخالفت شروع کردی اور شلز کی بہت سی شکایتیں یورپ بھیجیں اور دوسری طرف والٹر نے اس کے ترجمے میں سے بہت سی

غلطیاں نکالیں تو غالباً اسی وجہ سے وہ ٹرانکوبار کا مشن انہیں لوگوں کے سپرد کر کے مدراس چلا گیا۔ ۱۷۴۲ء میں جب گسٹیر نے اس کی سخت مخالفت شروع کر دی تو وہ گوشہ نشین ہو گیا اور صرف ادبی خدمات میں ہی مصروف رہا۔ اسی طرح غالباً واپسی کا مسئلہ بھی ہوگا ، جب اختلافات زیادہ بڑھ گئے ہوں گے تو اس نے ہندستان سے واپس جانے میں ہی عافیت سمجھی ہوگی ۔ لیکن اس کی یہ فرار پسندی اور خود سری اس کی قابلیت اور زبان دانی کی لاثانی صلاحیتوں پر پردہ نہیں ڈال سکتی ۔

اس کے کردار کے اچھے رخ بھی تھے ۔ لاہ میں کہتا ہے کہ فرینک باوجود تمام خامیوں کے اس کو پسند کرتا تھا ۔ اس کی رحم دلی ، مستعدی اور ایمانداری اس کے حق میں دلالت کرتی تھیں ۔

ٹیلر اس کے بارے میں کہتا ہے اس کے پاس محکم معلومات تھیں اور اس میں رحم دلی اور جوش بھی تھا ۔

بیرلن کا خیال ہے ” بنجا من شلز ہمارے سب سے زیادہ محنتی اور باصلاحیت مشنریوں میں ایک تھا ، وہ بہت پرہیزگار اور بے لوث بھی تھا ۔“

شیرنگ کی رائے تو اس کے بارے میں بہت ہی اچھی ہے :

” اس کی محنتیں ، اس کے عزائم ، اس کی وسیع معلومات ، اس کی رحم دلی اور کام کے واسطے اپنی ذات کا مکمل وقف ایسی چیزیں ہیں جن پر صرف گزرتے ہوئے اشارے نہیں کئے جاسکتے ۔ ہندوستان میں پروٹسٹنٹ مشنوں کی تاریخ کے سب سے سخت دور میں اس نے تعجب خیز عقلمندی کا ثبوت دیا اور پوری مہم میں وہ رہنما کا کام سر انجام دیتا رہا “ ۔

بہ حیثیت مشنری کے اہمیت اور طریق کار :

دو وجہوں سے شلز بحیثیت مشنری کے خاصہ اہم سمجھا جاسکتا ہے ۔ اس نے ٹرانکوبار مشن کا کام اس وقت سنبھالا جب مشن کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور نہ صرف س کو قائم رکھا بلکہ اس کو ترقی دی ۔

دوسرے اس نے مدراس مشن کی بنیاد رکھی ۔ تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے ذریعے ہندستانی مشن کے کاموں میں ' ایس پی سی کے ' کا عمل دخل ہوا ۔

شلز نے جو بڑا اہم کام ہندستان میں انجام دیا وہ بچوں اور بالغوں کے اسکولوں کا قیام تھا۔

ٹرانکوبار مشن کے کارکن زیادہ تر یہ کوشش کرتے تھے کہ مشن کے کاموں کے لیے دیسی عیسائیوں کو تیار کریں۔ شلز نے بھی اس اصول کو اپنایا۔ اس کے اسکولوں میں دیسی ماسٹر ہی ہوتے تھے۔

اس نے ایک مدرسۂ نسواں بھی قائم کیا تھا جس میں ۱۷۳۸ء میں اٹھارہ طالبات تعلیم پاتی تھیں اور غالباً ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا ہی قدم تھا۔

ٹرانکوبار میں اس کا طریق کار کیا تھا، اس سلسلے میں بیرلین سے خاصی معلومات ملتی ہیں :

" ہر اتوار کی صبح کو تامل اور بنگالی میں وعظ کہتا تھا اور شام کو تامل میں سوال و جواب کے ذریعہ عیسائیت کی تعلیم دیتا تھا۔"

بیرلن آگے کہتا ہے :

" اس دوران میں جب شلز اپنے گلہ کے درمیان اس لگن اور نفس کشی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہاتھا وہ کافروں کو بھی بھولا نہ تھا، ہفتہ میں ایک دن ان کے واسطے مخصوص تھا، اس دن وہ اپنے اسکول کے تمام بچوں کے ساتھ جن کی تعداد چالیس تھی، باہر جاتا اور کسی گاؤں میں پہنچ کر کسی گلی میں رک جاتا اور ایک دعا کی دھن گانا شروع کردیتا۔ چالیس گلوں سے ابھری ہوئی ایک جرمن دھن جلد ہی لوگوں کو اکٹھا کر لیتی تھی اور جیسے آخری آواز ڈوبتی شلز اپنا سر ننگا کر لیتا اور خدا کے حضور ان کافروں کے واسطے دعا کرتا، اس کے بعد ان لوگوں سے خطاب کرتا۔ خطبہ کے بعد کافروں کے اور شلز اور اس کے مددگاروں کے درمیان حالات اور موقع کے لحاظ سے کبھی طویل اور کبھی مختصر مناظرہ ہوتا اور اس کے بعد یہ نور کے داعی آگے بڑھ جاتے اور کسی دوسرے گاؤں میں داخل ہوتے۔ اس طرح سے شلز چھ سال تک تیس ہزار آبادی کے علاقوں میں گاؤں گاؤں گھومتا رہا۔ شاید ہی کوئی متنفس بچا ہو جس کو اس کی آواز سننے کا موقع نہ ملا ہو۔ اس کے تبلیغی کام کے نتائج تقریباً سابقہ معیار کے مطابق ہی رہے۔ فرنگن بالگ اور گرونڈلر نے ۱۴ سال میں

۲۰۳ تامل اور پرتگالیوں کو بپتسمہ دیا تھا اور اپنے گروہ میں شامل کیا تھا ، یعنی اوسطاً ایک سال بیں تینتیس آدمی اور شلز نے ٹرانکوبار کے چھ سالوں میں ۱۷۳ تامل اور پرتگالیوں کو اپنے گروہ میں شامل کیا یعنی اوسطاً ایک سال میں انتیس اور اس کام میں وہ اکیلا ہی تھا کیونکہ دال زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا ۔"

اس زمانے میں عیسائی برادری دو طرح کی پریشانیوں میں مبتلا تھی ، ایک تو سماوی آفتیں تھیں مثلاً اس علاقے میں زبردست آتش زدگی ہوئی اور باد و باراں کا مہیب طوفان آیا ۔ دوسرے یورپ میں یہاں کے مشنریوں کے کاموں کو بڑے غلط انداز میں پیش کیا جارہا تھا ، اس کا رد عمل یہ ہوا کہ وہاں بہت سے لوگوں کو مشن پر اعتبار نہیں رہا ۔ لیکن فرائض منصبی کی ادائی میں خلوص و مستعدی کا انعام مل کر رہا اور باوجود ہندوستان میں رہنے والے یورپی باشندوں کی سخت مخالفت کے یورپ میں ہندستانی مشن پر اعتماد مضبوط ہوتا گیا ۔

۱۷۲۶ء میں شلز مدراس چلا گیا ، وہاں اس نے سب سے پہلا کام مالاباری بچوں کے لیے ایک اسکول قائم کرنے کا کیا۔ یہ اسکول بڑی جلدی ہی قبولیت عامہ کا شرف پا گیا اور نہ صرف بچے بلکہ بالغ بھی اس سے ہدایت پانے کے لئے آنے لگے ۔ وہ صبح ایک گھنٹہ بچوں کے اسکول میں پڑھاتا اور ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک اپنے گھر کے وراندے میں بیٹھا رہتا اور ان تمام لوگوں سے باتیں کرتا جو اس سے ملاقات کے متمنی ہوتے ۔ اس طرح انجیل سے بہت تھوڑے عرصے میں ہی بہت لوگ واقف ہو گئے ۔

مدراس میں اس کو زیادہ تر ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا جو صرف تیلیگو جانتے تھے ، اس لیے اس نے تیلیگو بھی سیکھی ۔

بہت سے بدمعاش صرف اس لیے عیسائی ہوجاتے کہ ان کو مشن سے کھانا ملتا اور بہت سے صرف بپتسمہ والے کپڑے کے لیے بپتسمہ کرا لیتے ایسے لوگوں کا نہ یہ پتا ملتا کہ کہاں سے آئے ہیں اور نہ یہ کہ کب کہاں چلے جائیں گے ۔ اس لیے شلز نے یہ قانون بنایا کہ تمام امیدوار پہلے اپنی قیام گاہ اور اپنا ذریعۂ معاش لکھوائیں ، یہ قاعدہ اتنا مقبول ہوا کہ نئے مشن اسٹیشنوں میں اب تک رائج ہے۔

۱۷۲۸ء سے ۱۷۳۰ء تک دو سالوں میں ۲۰۰ آدمیوں نے پروٹسٹنٹ مذہب قبول کر لیا ۔ حالانکہ اس دور میں رومن کیتھولک عیسائیوں نے لوگوں کو اس کی طرف سے بدگمان کرنے کی پوری کوشش کی ۔

۱۷۳۱ء کے اواخر کے قریب شلز کو ارک بشپ اوف کینٹربری کا خط ملا ، اس کے ساتھ ھی ۲۰۰ پگوڈا کا ایک عطیہ بھی تھا جو موجودہ دور کے تقریباً ۲۰۰۰ روپیہ کے برابر ھوگا ۔ اس پیسے سے شلز نے اپنے کچھ قرض ادا کر دیے اور ملکی بچوں کے لئے ایک دوسرا اسکول کھولا ۔ ۱۷۳۳ء میں اسکول کا صرفہ تقریباً ۱۰۷۰ پگوڈا تک پہنچ گیا ۔

کیسٹر کے ٹرنکولور روانہ ھونے کے بعد شلز نے ۱۷۳۷ء سے ۱۷۴۲ء تک پھر ایک سو آدمیوں کو عیسائی بنایا ۔

زبان دان :

شلز جس وقت هندستان آیا ہے وہ یورپ کی کئی اهم زبانوں سے واقف تھا ۔ اس کے علاوہ وہ عبرانی بھی جانتا تھا ۔ هندستان آنے کے بعد اس نے تامل ، تیلیگو اور پرتگالی سے واقفیت بہم پہنچائی ۔ اس نے سب سے پہلے دعا " Love, that are to me a model " کو لاطینی سے تامل میں منتقل کیا ، اس کے بعد کچھ اور دعاؤں کا ترجمہ کیا ۔ یہ تمام ترجمے کسی بھی صورت سے مکمل نہیں کہے جاتے لیکن یہ ایک ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی تھے ، لوگ ان کے گانے میں خوشی محسوس کرتے تھے ۔

زنگن بالگ نے انجیل کو تامل میں منتقل کر دیا تھا ، توریت کو کتاب رتھ تک ھی منتقل کر سکا تھا کہ اس کا انتقال ھو گیا ۔ شلز نے توریت کی تمام باقی کتابوں کو تامل زبان میں منتقل کرد یا ۔ یہ ترجمہ اس نے ایک برھمن کی مدد سے پورا کیا تھا ۔ اس کے ساتھیوں نے اس پر نظر ثانی کی ، یہ ۱۷۲۵ء میں اختتام کو پہنچا اور ۱۷۲۷ء میں طبع ھوا ۔ اس ترجمے کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ قدیم ترین ایڈیشن با محاورہ زبان میں نہیں تھا ۔ ممکن ہے اس کی وجہ اس کتاب کی خصوصیت ھو جس کا ترجمہ کیا گیا تھا ۔

هالے میں اس نے جون آرنٹ کی تصنیف Speculum کا تامل میں ترجمہ کیا اور اس کو طبع کرایا ۔

اس نے بائبل کے کچھ حصے اور بہت سے مذهبی رسالے مدراس پہنچنے

کے کچھ عرصے بعد ہی تیلگو اور ہندستانی میں منتقل کر دیے تھے - ٹیلر کا خیال ہے کہ یہ تمام ترجمے لازمی طور پر ناپختہ اور خام ہوں گے کیونکہ اتنے کم عرصہ میں اتنی مصروفیت کے ساتھ چار چار زبانوں پر کوئی بھی عبور حاصل نہیں کرسکتا -

ٹیلر کا خیال ہے کہ ۱۷۳۲ء میں اس نے پوری بائیبل کو ہندستانی میں منتقل کر لیا تھا - یہ کام اس نے ہندستانیوں کی مدد سے کیا ہوگا - کہا جاتا ہے کہ میڈیم بائبل کے تامل ترجمہ کو بنایا گیا تھا اور تمام مشکل اور نازک حصوں کے سلسلے میں شلز نے ہدایت دی تھی ، لیکن پھر بھی یہ کام ناپختہ ہی تھا کیونکہ ایک بار شائع ہو کر دوبارہ کبھی شائع نہیں ہوا د

Auxiliary Bible Society کی پندرھویں رپورٹ میں جو ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی تھی ، اس کتاب کے بارے میں تعجب کا اظہار کیا گیا ہے کہ ایسی ناقص اور ناقابل تفہیم کتاب پریس میں بھیجی ہی کیسے جا سکی - جبکہ ویلبریچٹ Weilbrecht کا خیال ہے کہ اس نے عہد نامہ جدید کا ترجمہ ۱۷۳۹ء میں شروع کیا تھا اور ۱۷۴۱ء میں ختم کیا تھا -

شلز نے کس طرح سے زبانوں میں مہارت پیدا کی اور کس طرح ترجمے کا کام کیا ، لاہ مین اس کی ایک دلچسپ تفصیل ایک Daily Register سے فراہم کرتا ہے - یہ رجسٹر ۱۷۱۹ء سے ۱۷۲۵ء تک شائع ہوا تھا - ان پانچ سالوں میں تقریباً بیس کتابیں شائع ہوئی تھیں ، یہ پرتگالی، ڈینش اور تامل میں تھیں - پہلے ان سے کچھ دعاؤں کے ترجمے کئے تھے ، جب ۴۸ دعائیں تامل میں منتقل ہو گئیں تو اس نے ان کو چھپوا دیا - ۱۷۲۱ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا ، لیکن یہ تمام دعائیں تہواروں وغیرہ کی سروس کے لئے ناکافی ہوتی تھیں - مئی ۱۷۲۲ء کی ایک شام کو وہ ایک حمد گا رہا تھا ، گاتے گاتے افسوس ہوا کہ اسکول کے بچوں کی زبان میں یہ حمد نہیں ہے ، ترجمہ کرنے کی خواہش اس قدر غالب ہوئی کہ اس نے دو بجے رات تک جاگ کر پوری حمد کا ترجمہ کر دیا - شلز کی ڈائری سے پتہ چلتا ہے کہ کام کتنی تیزی سے ہوا ، چند دنوں میں دو حمدیں تیار ہوگئیں اور جیسے ہی چار پانچ دعاؤں کا ترجمہ مکمل ہوا ، شلز نے ان کو کاغذ کی آدھی تختی پر چھاپ دیا تاکہ بچے ان کو یاد کر لیں - ۱۷۲۳ء کی ابتدا میں ہی ۱۱۲ دعاؤں کا ترجمہ ہوگیا - جب ایک سو ساٹھ دعائیں ہوگئیں تو مجموعہ کلاں کے نام سے ۱۷۲۳ء میں ہی انھیں شائع بھی کردیا گیا -

جیسے ہی دعاؤں کے ترجمے کا کام ختم ہوا Passion کی تاریخ کا کام بھی شروع کر دیا گیا اور ختم کر لیا گیا اور پھر صعود مسیح کی کہانی اور قیامت کی کہانی کا ترجمہ ہو گیا اور صرف ۹ دن میں کتاب طبع ہو کر لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی۔ عام طور پر کام کا انداز یہ ہوتا کہ اس کے ایک طرف کاتب بیٹھا ہوتا ؛ سامنے عبرانی کا متن اور مختلف زبانوں کے ترجمے رکھے ہوتے اور دوسری تمام ضروری چیزیں ہوتیں ، وہ ترجمے بولتا جاتا اور کاتب لکھتا جاتا ۔

مجموعی طور پر اس نے کتنا کام کیا اس کی مکمل تفصیل نہیں ملتی ۔ اس نے پرتگالی ، ڈینش ، تامل ، تیلیگو ، ہندستانی اور لاطینی زبانوں میں تصنیف و تالیف کا کام کیا تھا ۔ اس کے بیشتر کام کی نوعیت مذہبی تھی مثلاً مذہبی صحیفوں کے اور دعاؤں کے ترجمے ، مشہور مشنریوں کے خطبات کی تالیف اور اہم سروسوں مثلاً گرونڈلر کی وفات کے موقع پر ہونے والی سروس کے حالات وغیرہ ۔ لیکن اس نے ہندستانی اور تیلیگو زبان کے قواعد بھی ترتیب دیے ۔ ہندستانی زبان کی قواعد نسخ رسم الخط میں ہے ، عبارتیں لاطینی میں ہیں ۔ حال میں اس نے تامل ، تیلیگو اور ہندستانی زبان کی کتابوں کے لئے ٹائپ کے ضروری حروف بھی تیار کرائے تھے ۔ کم سے کم ہندستانی کی حد تک اسی کے اس کام کو اولیت حاصل ہے ۔

اس کے تمام تراجم انتہائی ناقص تھے ۔ ان میں بیجا طوالت تھی ، اس نے ترجمے کا کام زبانوں پر بغیر پوری طور سے عبور پائے ہوئے شروع کردیا تھا اور پھر وہ بہت ہی تیز کام کرتا تھا ۔ اس لئے یہ تمام تراجم ناپائیدار ثابت ہوئے اور اس کے فوراً بعد ہی ختم ہوگئے ۔

در حقیقت وہ ضرورت سے زیادہ عملی آدمی تھا ۔ ہندستانی زبانوں میں مہارت حاصل کرنا اس کو صرف اپنے فائدے کا کام معلوم ہوا اور نسبتاً زیادہ فائدے کی بات یہی معلوم ہوئی کہ ابھرتے ہوئے چرچ کو ہر زبان میں مکمل بائبل پیش کردی جائے ۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس کے دماغ میں ترجمے کا سودا تھا تو بیجا نہ ہوگا ۔

شلز کی ہندستانی زبان کی قواعد :

شلز کی قواعد ۱۷۴۵ء میں منظر عام پر آئی ۔ یہ لاطینی میں لکھی گئی تھی ، زبان نہ کلاسیکی ہے اور نہ ادبی ۔ زبان میں ناہمواری اور

ناپختگی ہے ۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ لاطینی زبان پر پورے طور سے قادر نہیں تھا ۔

قواعد میں سب سے پہلے مرتب کا دیباچہ ہے پھر مصنف کا ۔ شلز اپنے دیباچے میں لکھتا ہے کہ تیرہ سال پہلے تیلیگو کی قواعد لکھی تھی ، اس قواعد کے لکھنے کا وہی مقصد تھا جو اب اس موجودہ قواعد کی تصنیف کا ہے ۔ یہ زبان ھندستانی مغل اعظم کی سلطنت میں بول چال کی عام زبان ہے ، اس سلطنت کا بیشترحصہ ''کافرانہ خیالات'' رکھنےوالی رعیت پر مشتمل ہے ، اس لئے عہدنامہ جدید وغیرہ اس زبان میں منتقل بھی کر دیا گیا ہے ۔ میں نے اپنا فرض سمجھا کہ اس زبان سے واقفیت بہم پہنچاؤں تاکہ آنے والے مشنریوں کی مدد کر سکوں اور ان کو اس زبان کے سیکھنے کا آسان راستہ دکھا سکوں ۔

قواعد کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلا باب حروف تہجی سے متعلق ہے ، دوسرا اسما سے متعلق ہے ۔ تیسرا ضمائرکی، چوتھا افعال امدادی (سادہ اور مرکب) کی ، پانچواں حروف (یعنی جر ، تمیز ، فجائیہ ، عطف) کی اور چھٹا باب نحو کی وضاحت کرتا ہے ۔

پہلے باب میں نسخ حروف تہجی کی وضاحت کی گئی ہے ۔ دیوناگری حرف بھی دے دئے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے وہ ان کی شکلیں اچھی طرح نہیں جانتا ۔ وہ ھندوستانی حرف کے تلفظ کی وضاحت کرتا ہے ، مثلاً ب اور پ کے تلفظ کے فرق کو ممیز کرنے کی متعدد مثالیں دی ھیں ۔ پھر اس سلسلے میں وہ الفاظ کی ایک لمبی فہرست دیتا ہے ۔ اس تقابل سے اس کے Transcription کے طریقےپر روشنی پڑتی ہے ۔ اس فہرست سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ہندستانی زبان پر پوری قدرت حاصل نہیں تھی ، کوز اور متنفس آوازیں اس کے لئے قطعی طور پر ناقابل شناخت تھیں ۔

اسما کی تصریف :		بودی (بڈھی)		Vetula

حالت فاعلی	بودی	بودیاں
حالت اضافی	بودی کا	بودیاں کا
حالت مفعولی	بودی کوں	بودیاں کوں
حالت ندائی	ای بودی	اے بودیاں

حالت مکانی } طوری وغیرہ }	بودی می بودی سوں	بودیاں می بودیاں سوں
	بودی می سوں	بودیاں می سوں

مذکر سے مونث :

چاکر	چاکری	دوستدار	دوستدارنی

واحد سے جمع :

دیو	دیواں	ہاپکو	ہاپکوواں
پانو	پانواں	انبھائی	انبھایاں

صفات کا استعمال :

نوا مرد	نوی عورت	اچھا مرد	اچھی عورت
سارے آدمیاں		باقی کی عورتاں	

صفت سے حالیہ معطوفہ بنانے کے دو طریقے :

(۱) دوڑتا سو گھوڑا	(۲) نیکی کرنے ہارہ
چور سو بیلی	ظلم کرنے ہارہ
اوڑتی سو چوڑی	محنت کرنے ہارہ
سوتے سو بھائی	جھوٹ بولنے ہارہ

ضمائر میں اس کو تعظیمی درجوں کا احساس ہے :

واحد حاضر عمومی توں واحد حاضر تعظیمی تم جمع حاضر تومے

واحد متکلم مھیں ہم جمع متکلم ہمیں

اون ، اہن ، اونو ، انینو ، اس ، اوس ، کین ، کینئو ، کوئی ، کس

اور ایکس وغیرہ کے مختلف ضمائر ہیں -

افعال کے باب میں حالیہ معطوفہ کی وضاحت کرتا ہے :

ٹارھینے کا	(فعل رھ،)	
رھکو	(" ")	حالیہ موجودہ
رھنیکا	(" ")	حالیہ استقبالی

لکو	اونی دی لکو مهیں سنہا ۔
	اون آئے لکو ھمیں سمجھے ۔
لگ	اون آئے لگ مهیں جهاں رهوں گا ۔
سرکا	همیں گنایاں هیں کئے سرکا همنا کونچ نگہبانی کریں گے او۔
	ناہا کسمند میرے نزدیک هیں آئے سرکا ۔
	اوں کہدی میں هین گرنے سرکا دیکھو
	بچے جھوٹ هیں بولے سرکا مناع کرو
تو	اونو پیسے نہیں دیئے تو کرنے کا کیا ۔
	اونو کھانا نہیں پکانے تو بھوک سود رهنا ۔

افعال کے بعد پانچویں باب میں حرف کا بیان ہے ۔ کہتا ہے تیلیگو، تامل اور هندستانی میں حروف اسما کے بعد آتے هیں :

فردوس میں رهنا خوب ہے ۔

تمیز زمانی	اج ۔ آج کوں ۔ کال ۔ پرسو ۔ اترسو ۔ ایتلی ۔ ایتالکوں ۔ همیسا ۔ بیگی ۔ کربھی ۔ شیتابھی ۔ فجر ۔ دوپهار ۔
مکانی	بھار ۔ یہاں ۔ وهاں ۔ درمیانی ۔ وهانچ ۔ ورے ۔ پرے ۔ ایلاڑ ۔ پیلاڑ ۔
صفاتی	دیغل ۔ تھوڑا تو بھی ۔ تتر بتر ۔ اوک ۔ اپکیلاچ ۔

حروف فجائیه کی پانچ قسمیں هیں :

Exclamantis (۱)	اے اللہ ۔ اے خاوند
Demonstrantis (۲)	ایدی آدمیاں سارے بھی خراب والے هوئے ۔
Impecemtis (۳)	گناہ گاراں هیں سو تمنا کوں هیں ۔
Indignautis (۴)	ناپاک ہےسو ہاتیکو واں چھیجا او ۔
Approbantis (۵)	اے نیکیو والے بھلا خوشوقتی سوں رهو سب خوب ہے ۔

حروف عطف:

بھی: میرا باپ قوت مند بھی دولت مند بھی ہے -

کا ، کو: اون اے کھکو بھی قرض بھیرے کھکو بھی ہمیں جانتے ہیں -

واسطے - نہیں تو - اے ناھو کو - پن - تو - توبھی - انکے - پچھے - کی - ہوئیتو -

پن: اے سراب خور پیتا ہے پن اور کوچ بھی کرتا نہیں -

نحو: ہندستانی نحو کے تیرہ موٹے موٹے اصول گنائے ہیں اس کا خیال ہے کہ ہندستانی نحو مشکل ہے:

(۱) صفات موصوف سے تعداد اور جنس میں مطابقت کرتی ہیں -

(۲) صفات کی تفضیل 'سوں' سے بھی بنتی ہے: توں میرے سوں بھی برا ہے -

(۳) ضمائر میں تاکید کے واسطے ''چ'' استعمال ہوتاہے: الھاچ، بھنیچ ، ہمنچ ، اونوچ وغیرہ -

(۴) مفعول بالواسطہ اور مفعول بلاواسطہ میں کوئی فرق نہیں ہے -

ضمیمہ میں عبارت کے نمونے ہیں - ''اعتباریکا دعا الیچ'':

باپ ہیں سو ایک الہ کی اوپر اعتبار کرتا ہوں اور اپنی قدرت سوں آسمان کوں بھی زمین کوں بھی پیدا کئے ہیں- اون کا ایک فرزند ہیں سو ہماترا خاوندا یشوعا مسیحا کے اوپر اعنقد لاتا ہوں - اور روح قدس سوں حمل کرنا ہو کو ان مہائی مریم کے پیٹ سے تولد ہوکو ....

کتاب کے آخر میں دو فرہنگیں بھی ہیں جن میں سے ایک چوالیس الفاظ پر اور ایک باسٹھ الفاظ پر مشتمل ہے -

اواخر سترھویں اور اٹھارویں صدی میں مرتب ہونے والی قواعدیں سوائے گلکرسٹ کی قواعد کے ، فن قواعد نویسی میں بے حد ناقص ہیں - یہ زبان کی ارتقائی کڑیوں کی تلاش میں بھی بہت زیادہ دور تک ساتھ نہیں دیتیں - ان قواعدوں کے مولفین زبان کے مزاج سے نا آشنا تھے ، زبان کی مبادیات سے بھی ان کی واقفیت ناپختہ تھی- اس لیے ان میں افعال، اسماء،

ضمائر وغیرہ کی تصریف اور نحو کے اصولوں کی وضاحت غلط بنیادوں پر کی گئی ہے۔

بحیثیت مجموعی تلفظ کے اعتبار سے بھی یہ قواعدیں عربی زبان کی صحیح ترجمانی نہیں کرتیں ۔ اول تو قواعد نویسوں کے کان ہندستانی آوازوں کا صحیح طور پر ادراک کرنے کے ناقابل تھے دوسرے ان کے Transcription کے طریقے غیر سائنسی تھے۔ ان دونوں خامیوں کی وجہ سے ان قواعدوں میں زبان کا جو ہیولا پایا جاتا ہے وہ زبان کے اصلی ہونے سے رسمی سا تعلق رکھتا ہے۔

گریرسن نے ان قواعدوں کو پرکھنے کے لئے ایک کسوٹی مقرر کی ہے: (۱) یہ قواعد نویس " نے " کے استعمال کو سمجھتے تھے یا نہیں (۲) ضمائر شخصی کی جمع جانتے تھے یا نہیں ۔ کٹلر کو " نے " کا استعمال نہیں معلوم تھا لیکن ضمائر شخصی کا اس نے صحیح تجزیہ کیا ہے ۔

شلز کی قواعد دکنی زبان کی قواعد ہے، یہ قواعد نسخ رسم الخط اور لاطینی میں تحریر کی گئی ہے۔ Transcription کا ذریعہ جانا پہچانا ہونے کی وجہ سے تفہیم میں دشواری نہیں ہوتی۔ حالاں کہ وہ خود Transcription کے اس ذریعے پر پوری قوت نہیں رکھتا اور آوازوں کو غلط صورتوں میں ظاہر کرتا ہے، مثلاً بودی ، بڈھی کے ایے ۔ گریرسن کی کسوٹی کے مطابق یہ اپنے پیش رو سے پیچھے ہے ۔ 'نے' کے وجود سے یہ بھی واقف نہیں ہے ۔ متکلم اور حاضر کی گردانیں بھی درست نہیں ہیں ۔

شلز کی قواعد بنیادی طور پر یونانی رومی طریقہ پر مرتب کی گئی ہے، ہندستانی پر لاطینی گردانوں کا اطلاق کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ ہندستانی اسم کی حالتوں کا تجزیہ خاص طور پر خاصہ غلط ہے۔ یہ قواعد صرف توضیحی ہی نہیں بلکہ Priscriptive بھی ہے۔ یہ بھی غالباً یونانی رومی طریق مطالعہ کی دین تھی کہ قواعد نویس کی نگاہ ضمائر کے تعظیمی درجوں پر بھی پڑی ۔

———

اس مقالے کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

1. Benjaminus Schulzius - : (شلز کی قواعد ہندوستانی)
Grammaticae Hindostanicae, 1745.

2. The Rev. A. Westcott, M. A.: Our Oldest Indian Mission, 1897.

3. H. U. Weilbrecht: The History of Urdu Scripture Versions, 1900.

4. Rev. W. Taylor: A Memoir of the First Century of the Earliest Protestant Mission At Madras, 1827.

5. Rev. M. A. Sherring: The History of Protestant Missions in India, 1884.

6. History of Christianity in India with Its Prospects. A Sketch Compiled from Sherring, Smith, Badley and Reports. 1895.

7. Rev. E. R. Baierlein: The Land of the Tamulians and Its Missions. 1875.

8. David O. Aven: India Ancient and Modern, Geographical, Historical, Political, Social and Religious with a perticular account of the State and Prospects of Christianity. 1856.

9. Lehmann, E. Erno: It began at Tranquebar.

10. Buckland, C. E.: A Dictionary of Indian Biography.

* *

اردو، ہندی و ہندوستانی

ڈاکٹر شوکت سبزواری*

— ۱ —

بر صغیر پاک ہند میں آج گوناگوں زبانیں بولی جا رہی ہیں اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آج سے سات سو آٹھ سو برس پہلے بھی ان زبانوں کا یہی حال تھا۔ قریب قریب اتنا ہی تنوع ، رنگا رنگی یا اختلاف اس وقت بھی تھا جتنا آج ہے۔ بر صغیر کی زبانوں میں یہ اختلاف دسویں صدی عیسوی کے بعد نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ اس سے پہلے ان میں اس درجے کا اختلاف نہ تھا۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ دسویں صدی سے پہلے ان زبانوں میں کس درجے کا اختلاف تھا ، صرف یہ عرض کرنا ہے کہ بر صغیر کی آریائی زبانوں میں یہ اختلاف گزشتہ آٹھ سو برس سے ایک غیر منقطع روایت کے طور پر چلا آرہا ہے اور یہ ایک واضح تاریخی حقیقت ہے جس کے لیے کسی لسانی ثبوت کی ضرورت نہیں۔

ویسے تو بر صغیر کی مختلف زبانوں میں سے ہر زبان کو ہندی کہا جا سکتا ہے ، اس لیے کہ وہ اس وسیع خطۂ ارض کی پیداوار ہے جس کا نام ہند تھا۔ یا یوں کہیے کہ وہ ہند کے کسی نہ کسی حصے میں بولی جا رہی ہے۔ لیکن مطلقاً ہندی کا نام بر صغیر کی گوناگوں زبانوں میں سے صرف اس زبان پر سجتا ہے جو ملک گیر ہو اور بر صغیر کے گوشے گوشے میں بولی یا سمجھی جاتی ہو۔ گزشتہ آٹھ سو برس کے زمانے میں مطلقاً بلا قید مقام ہندی (یا ہندوی) کا لفظ ملک کی کسی علاقائی بولی کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ ہندی سے کوئی مقامی زبان مراد نہیں لی گئی اور یہ ممکن بھی نہ تھا کہ ہندی کا اطلاق ، جس کے معنی ہیں ملک ہند کی زبان ، کسی خاص محدود علاقے کی زبان پر کیا جاتا۔ ملک گیر اور عام زبان کو البتہ اس طویل زمانے میں ہندی ، ہندوی یا ہندوستانی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

---

* مدیر اول ، ترقی اردو بورڈ ، کراچی

ابو ریحان البیرونی (متوفی ۱۰۲۵ء) زبان ہند کی دو قسمیں بتاتے ہیں - خواص کی زبان جو کسی قدر پیچیدہ ہے ، اس میں صرف و اشتقاق کے اصول اور بیان و بدیع کے لطائف کار فرما دیکھے گئے ہیں ، دوسرے عوام کی زبان - خواص کی زبان سے ، البیرونی کی مراد پنڈتوں کی سنسکرت ہے ، عوام کی زبان انھوں نے مغربی اپ بھرنش کو کہا ہے - سنسکوت تو علمی زبان کی حیثیت سے ملک پر راج کرتی ہی رہی ہے ، اپ بھرنش بھی اس زمانے میں ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک بولی یا سمجھی جاتی تھی -

گیارھویں صدی کے بعد بھی سنسکرت اپنے بلند مقام کے باعث زبان ہند یا ہندی کے نام سے یاد کی جاتی رہی اور یہ سلسلہ اکبر کے عہد تک چلا - امیر خسرو دہلوی (متوفی ۱۳۲۵ء) کی مراد ذیل کے ابیات میں زبان ہند سے سنسکرت ہے :

زبان ہند ہم تازی مثال است　　که آمیزش درانجا کم بحال است
گر آئین عرب نحو است و گر صرف　　ازان آئین دریں کم نیست یک حرف*

عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں کہ مہابھارت کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا - مہا بھارت براہ راست سنسکرت سے فارسی میں منتقل ہوئی تھی اس لیے یہاں بھی ہندی سے سنسکرت ہی مراد لی جائے گی -

مغربی اپ بھرنش البیرونی کے بعد کہیں لہندا اور پنجابی کے روپ میں جلوہ گر ہوئی ، کہیں سندھی اور کھڑی بولی کے روپ میں - ان میں سے کھڑی بولی (اردو) خاص حالات و عوامل کی بنا پر ، جنھیں ہم اس موضوع کی سیر حاصل کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں ، بہت تھوڑے عرصے میں پھیل کر ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی اور مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک اسی کا سکہ چلنے لگا - یہ بھی ایک مانی ہوئی حقیقت ہے جس سے سرسری گزر کر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ بر صغیر میں مسلمانوں کی پیہم فتوحات کے بعد ہی کھڑی بولی نے (جسے آج ہم اردو کہتے ہیں) ملک کی عام عوامی زبان کا درجہ حاصل کر لیا تھا - اس لیے سنسکرت کے بعد اردو کو ہندی ، ہندوی یا ہندوستانی کے نام سے یاد کیا گیا -

---

* دول رانی خضر خاں ، ص ۴۲ -

سنسکرت ملک کی عام تعلیمی زبان تھی ، اردو عام بول چال کی زبان قرار پائی ۔ سنسکرت خواص اہل ہند کی زبان تھی اردو عوام اہل ہند کی زبان ٹھہری ۔ مغربی اپ بھرنش کی جانشینی اردو کے حصے میں آئی تو اپ بھرنش کی طرح اردو بھی ہندی یا ہندوی کہلائی ۔ اردو کا قدیم ترین نام ، جیسا کہ مولانا شیرانی مرحوم فرماتے ہیں ، ہندی یا ہندوی ہے(۱) ۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اس کے موید ہیں :

"اردو کا نام ہندی (قدیم تر ہندوی) ہندوستانی اور اردو کے مقابلے میں زیادہ قدیم ہے ۔" (۲)

—۲—

آئیے اب اس حقیقت کا ادب و تاریخ کے گمشدہ اوراق میں کھوج لگائیں ۔ خواجہ مسعود سعد سلمان (متوفی ۱۱۲۹ء) کی بابت امیر خسرو اور محمد عوفی دونوں یہ لکھتے ہیں کہ تین دیوان ان کی یادگار ہیں ۔ ان میں سے ایک ہندوی زبان میں ہے ۔ مسعود سعد کا دیوان دستیاب ہوتا تو بتایا جا سکتا کہ وہ کس زبان میں تھا ۔ شہنشاہ بابر (۱۰۳۰ - ۱۳۸۳ء) نے البتہ اپنی سرگزشت حیات میں ذیل کے شعر کو ہندی کے عنوان سے درج کیا ہے جس کا پہلا مصرع پورا اور دوسرے مصرعے کا تین چوتھائی حصہ اردو میں ہے :

مج کا (کو) نہ ہوا کچ (کچھ) ہوس مانک و موتی
فقرا حالنا بس ، بل کسدر پانی و روتی (روٹی)

شاہ میران جی شمس العشاق (متوفی ۱۴۹۶ء) کا تعلق اسی دور سے ہے ۔ وہ اپنے اردو کلام کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں :

ہیں عربی بول کیرے	اور فارسی بھوتیرے
ہندی بولوں سب	اس ارتوں کے سبب

اس کے بعد فرماتے ہیں :

یو دیکھت ہندی بول	بن معنی ہیں نپ تول (۳)

۱- پنجاب میں اردو ، ص ۲۳ ۔
۲- انڈو آرین اینڈ ہندی ، ص ۱۵۱ ۔
۳- شہادۃ الحقیقۃ ، بحوالہ قدیم اردو ، ص ۱۹ ۔

آج سے تقریباً پانچ سو سال پہلے اس زبان کو، جسے آج ہم اردو کہتے ہیں، عموماً ہندی کے نام سے یاد نہ کیا جاتا تو میران جی اپنی زبان کو کبھی ہندی نہ کہتے ۔ اردو کو ہندی کے نام سے یاد کرنے کا سلسلہ آج تک جاری ہے ۔ شاہ برہان الدین جانم (متوفی ١٥٨٢ء) ارشاد نامے میں اپنی زبان کے بارے میں فرماتے ہیں :

عیب نہ راکھیے ہندی بول معنی تو چک ڈیکھ دھنڈول

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے :

ہندی بولوں کیا بکھان ہے گر پرساد تھا منج گیان (١)

گزشتہ پانچ سو سال کے عرصے میں شاعروں، عالموں اور انشا پردازوں کا موجودہ اردو کے کسی نہ کسی روپ کو ہندی کے نام سے یاد کرنا ایک تاریخی تسلسل ہے ۔ یہ تاریخی تسلسل ہمیں بتاتا ہے کہ اردو کا قدیم نام ہندی یا ہندوی تھا ۔ پندرھویں اور سولھویں صدی کی شہادتیں تو آپ کے سامنے گزر چکیں، اب سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی چند واضح اور ناقابل تردید شہادتیں ملاحظہ فرمائیں ۔

عبدل بیجاپور کا مشہور شاعر ہے جس نے ١٦٠٣ء میں ابراھیم نامہ دکھنی اردو میں نظم کیا ۔ وہ اپنی زبان کو ہندوی اور دھلوی کے نام سے یاد کرتا ہے :

زبان ہندوی مجھ سوں ہور دھلوی
نہ جانوں عرب ہور عجم مثنوی (٢)

وجہی نے سب رس (١٦٣٥ء) میں ایک جگہ اپنی زبان کو ہندی بتایا ہے :

"آج لگ کوئی اس جہان میں ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر یوں نہیں بولیا ۔" (٣) ۔

١۔ بحوالہ قدیم اردو، ص ٣٧ ۔
٢۔ بحوالہ دکن میں اردو، ص ١٠٠ ۔
٣۔ سب رس، ص ١١ ۔

دوسری جگہ اسی زبان کو زبان ہندوستان کے نام سے یاد کیا ہے :

" آغاز داستان بہ زبان ہندوستان "

سترھویں صدی کی یہ دو شہادتیں ہیں اور دونوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اردو کو ہندی ، ہندوی ، ہندوستانی یا زبان ہندوستان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ۔

اٹھارھویں صدی کی شہادتوں میں سے قدیم تر شہادت بحری کی ہے ۔ اس نے من لگن (۱۷۰۰ء) میں صراحت کی ہے :

ہندی جو زبانچ ہے ہماری　　کہنے نہ لگے ہمن کو بھاری　(۱)

اس کے بعد مشہور زٹل گو جعفر زٹلی (متوفی ۱۷۱۳ء) کا نام آتا ہے جنھوں نے اپنی فارسی آمیز اردو کو ہندی بتایا ہے :

اگرچہ سبھی کوڑا و کرکٹ است　　بہندی درندی زبان لٹ پٹ است

۱۷۲۳ء میں فضلی نے دہ مجلس کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا تو لکھا : (۲)

یہ ترجمہ فارسی کا ہندی　　از فہم و ذکائے ہوشمندی

ناواقفوں کا یوں واقف ہونا　　اورھوے کے واقف اوس پہ رونا

اس کو بھی بشرح اوتباکا　　ہوتا ہے ثواب اوس بکا کا

مشہور محقق اور ادیب سراج الدین علی خاں آرزو نے ۱۷۴۳ء میں مولانا عبدالواسع ہانسوی کی کتاب غرائب اللغات پر اصلاحی نظر ڈالی تو اس کا تعارف ان الفاظ میں فرمایا : (۳)

"یکے از فضلائے روزگار و علمائے نامدار ہندوستان جنت نشان کتابے از فن لغت تالیف نمودہ مسمی بغرائب اللغات و لغات ہندی کہ فارسی و ترکی آن زبان زد اہل دیار کمتر بود با معانی آن مرقوم نمودہ " ۔

۱- من لگن ، ص ۲۱ ۔

۲- کربل کتھا ، ص ۳۵ ۔

۳- نوادر الالفاظ ، ص ۳ ۔

اس زمانے میں 'اردو' بول چال کی زبان کے درجے سے ترقی پا کر شعر و سخن کی بارگاہ تک رسائی حاصل کر چکی تھی اور فارسی (عربی) کے سیر حاصل سرمائے سے بیش از بیش استفادے کے بعد ریختہ اور اردو کے نام سے یاد کی جانے لگی تھی ۔ مولانا شاہ عبدالقادر نے ۱۷۹۱ء میں قرآن شریف کو اردو میں منتقل فرمایا تو اردو کی ادبی معیاری شکل یعنی ریختہ کی جگہ عام بول چال کی زبان 'ھندی متعارف' اختیار کی تاکہ ہر شخص اس کو سمجھ سکے اور بآسانی اس سے استفادہ کرے :

'' اس زبان میں ریختہ نہیں بولی بلکہ ھندی متعارف تا عوام کو بے تکلف دریافت ھو ''۔

اٹھارھویں صدی کی شہادتیں بے شمار ھیں ۔ میں صرف دو اور پیش کروں گا ۔ ایک خواجہ میر درد کے نامور برادر میر اثر کی ۔ انہوں نے خواب و خیال (۱۷۷۶ء) میں اردو کو ھندوی کے نام سے یاد کیا ھے: *

فارسی سو ھیں ھندوی سو ھیں　　　باقی اشعار مثنوی سو ھیں

دوسرے غلام ھمدانی مصحفی کی جو اردو کے مشہور شاعر ھیں ، وہ تذکرہ ھندی گویاں (۱۷۹۴ء) کے مقدمے میں فرماتے ھیں :

'' این فقیر حقیر غلام ھمدانی مصحفی تخلص از تصنیف دیوان فارسی و ھندی و تالیف تذکرۂ فارسی فراغت حاصل کردہ۔''

(تذکرہ ھندی ، ص ۳)

دیوان ھندی سے مصحفی کی مراد ان کا اردو دیوان ھے۔

تاریخی تسلسل کے لیے انیسویں صدی کے آغاز کی دو شہادتیں غالباً کافی ھوں گی ۔ مجموعۂ نغز اردو شعرا کا تذکرہ ھے جو ۱۸۰۶ء میں فارسی زبان میں لکھا گیا ۔ تذکرہ نگار سراج الدین علی خان آرزو کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ھیں :

'' اگر شعراے ھندی زبان را عیال خان آرزو گویند سزا است ''۔

(مجموعہ نغز ، جلد ۱ ، ص ۲۴)

---

* خواب و خیال ، ص ۹ ۔

شعرائے ہندی زبان سے دور اول کے اردو شعرا مراد ہیں ۔

دستور الفصاحت (۱۸۳۳ء) کے مولف حکیم احد علی یکتا لکھنوی اپنی قابل قدر کتاب کے مقدمے میں فرماتے ہیں :

" باید دانست کہ زبان ہندی منسوب باہل ہند است " ۔

ملک ہند کی وسعت و پہنائی کے بیان اور اس میں بولی جانے والی گوناگوں علاقائی زبانوں کی تفصیل و تشریح کے بعد ارشاد ہوا ہے :

" دریں رسالہ کہ صرف و نحو زبان ہندی درآن بیان نمودہ می شود نہ مراد مولف تحقیق زبانہائے کثیرہ مذکورہ است بلکہ مقصود و مطلوب ازاں دریافتن صحت الفاظ خاص و معلومات تراکیب معینہ کلامیے است کہ مختص و موضوع بمحاورہ اردوے معلّی باشد " ۔ (مقدمہ ، ص ۳)

صاحب دستور الفصاحت " محاورۂ اردوئے معلی " کو زبان ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں ، کیوں ؟ اس لیے کہ اردوے معلی ملک ہند کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک بولی جاتی تھی اور اس حیثیت سے گویا وہ تمام اہل ہند کی عام اور مشترک زبان تھی ۔ قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ میں نے بھی ابتدائی تمہیدی سطور میں یہی عرض کیا تھا ۔

— ۳ —

ان مختلف شہادتوں اور ان کے تاریخی تسلسل کے بعد غالباً کسی مزید ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور یہ امر قریب طے پا جاتا ہے کہ مسلمان اہل علم گزشتہ چھ سو سال کی مدت میں جہاں کہیں مطلقاً زبان ہند یا ہندی (ہندوی) یا ہندوستانی کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد اردو ہوتی ہے (یا اس کی قدیم شکل) ۔ لیکن مزید وضاحت اور رفع اشتباہ کے لیے اس کی تائید میں دو ایک جلی اور روشن قرینے اور بیان کر دئے جائیں تو بے جا نہ ہوگا ۔

ابتدائی سطور میں عرض کیا گیا تھا کہ برصغیر کی ہر زبان کو جو پاک ہند کی پیداوار ہے ، ہندی کہا جاسکتا ہے لیکن مطلقاً بلا قید مقام نہیں ، قید مقام و مکان کے ساتھ یعنی اس خطے یا علاقے کی طرف نسبت کر کے جہاں کی وہ زبان ہے ۔ خان آرزو کی لغت ' نوادر الالفاظ ' سے میرے اس خیال کی

تائید ہوتی ہے ۔ نوادر میں اردو کے علاوہ اگر کسی خاص علاقے کی زبان کا ذکر آیا ہے تو اس علاقے کی طرف نسبت کر کے اسے ہندی کہا گیا ہے ۔ جیسے ہندی راجپوتی (راجستھانی) ہندی کشمیری ، ہندی پنجاب یا زبان مردم پنجاب وغیرہ وغیرہ ۔ ہندی کا لفظ اردو کے لیے مختص ہو چکا تھا ، اس لیے نوادر میں ملک کی کسی دوسری زبان کے لیے تنہا ہندی استعمال نہیں ہوا ۔ سنسکرت تک کو آرزو نے ہندی نہیں کہا ۔ '' کتابی '' کی طرف نسبت کر کے 'ہندی کتابی ' (علمی و تحریری ہندی) کہا ہے ۔ '' ابھر '' کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

'' ایں مشترک است در فارسی و ہندی کتابی ''

حکیم احمد علی یکتا کی بابت عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ عام ہندی (اردو) کے علاوہ ملک میں بولی جانے والی بہت سی علاقائی زبانوں کا ذکر کرتے ہیں جن کا ایک مقام ہے اور اپنی جگہ وہ سب عظمت اور اہمیت رکھتی ہیں ۔ لیکن کسی ایک علاقے میں محدود ہونے کی وجہ سے انہیں ہندی نہیں کہا گیا ، ہر ایک کو اپنے اپنے علاقے ، صوبے یا قوم اور فرقے کی طرف منسوب کر کے اس علاقے ، صوبے یا قوم کی بھاکا (زبان) کہا جاتا ہے ۔

''پس زبان مردمان بنگالہ را بنگالی و اہل پنجاب را پنجابی و سکنہ' دکھن را دکھنی و علی ہذا القیاس '' ۔

انیسویں صدی کے لگ بھگ ملک کی عام زبان (اردو) کو ریختہ اور اردوے معلی کے ناموں سے یاد کیا جانے لگا تھا لیکن ہندی (ہندوستانی) اس کا زیادہ عام اور مشہور نام تھا جو خصوصیت کے ساتھ اس کی عام روزانہ بول چال میں استعمال ہونے والی شکل پر اطلاق کیا جاتا تھا ۔ مولانا اوحد الدین بلگرامی عموماً اپنے لغت نفائس (۱۸۳۷ء) میں اردو کو ہندی اور ہندوستانی کی طرف مضاف کر کے اردوے ہندی ، اور اردوے ہندوستانی کے نام سے یاد کرتے ہیں ، ملاحظہ فرمائیں :

'' و زبان اردوے ہندوستانی کہ مرکب از فارسی و عربی و ہندی و برخے از ترکی است '' ۔

لفظ ' چہرہ ' کے تحت ارشاد ہوا ہے :

'' چہرہ بالکسر لغت فارسی است در اردوئے ہندی مستعمل '' ۔

" اردوے ہندی " اور " اردوے ہندوستانی" میں اردو کی ہندی و ہندوستانی کی طرف اضافت توضیح کے لیے ہے۔ مولانا بلگرامی اردو کی ہندی کی طرف اضافت کر کے گویا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اردو سے مراد ہندی ہے جو صدیوں سے ہندی یا ہندوی اور کبھی ہندوستانی کے نام سے یاد کی جاتی رہی ہے۔

اس نام کی روشنی میں اردو اور بر صغیر کی دوسری اہم اور عظیم المرتبت علاقائی زبانوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ سب زبانیں ہندوستان زا ہیں، اس حیثیت سے سب ہند کی ہیں اور ہندی ہیں - لیکن لفظ ہندی چونکہ اردو کے لیے مخصوص ہو چکا تھا اس لیے جب توضیح کی ضرورت پیش آئی تو اردو کو ہندی کی طرف مضاف کر کے "اردوے ہندی" کہا گیا اور جب ملک کی کوئی دوسری زبان مراد لی گئی تو خود ہندی کی اس علاقے کی طرف اضافت کی گئی جس علاقے کی وہ زبان تھی - جیسے ہندیٔ پنجاب، ہندیٔ راجھستان وغیرہ - یہ طریقۂ اظہار اپنی جگہ ثبوت ہے اس امر کا کہ " ہندی " مطلقاً اردو کے ساتھ مخصوص ہے اور اردو، صرف اردو کا نام ہے -

بر صغیر کے بعض فارسی فرہنگ نویسوں نے فارسی الفاظ کی شرح میں ان کے ہندی مترادفات ' زبان ہند ' کے نام سے درج کیے ہیں - ان ہندی مترادفات کے تفصیلی مطالعے سے دریافت ہوا کہ یہ اردو الفاظ ہیں جو اپنی قدیم یا جدید شکل میں درج ہوئے ہیں - " اردو کا قدیم سرمایۂ الفاظ " کے عنوان سے ایک طویل مقالہ زیر تحریر ہے جو انشاء اللہ مجلہ " اردو " میں شائع ہو گا -

* * *

بادہ کہن

شاہ مبارک آبرو*

کہو پیارے نہوں ہم کس طرح اب تم سیں آزردا
ہوئے ہو جان اوروں کے ہمن کوں چھوڑ کر مردا

نہ ملنے سیں تمہارے جو کہ ہم پر غم گذرتا ہے
سہے جو اور کوی پیارے تو جانو اس کا دل گردا

خوشی ہو جا ہمارے جیو کوں تو آ ملو ہم سیں
کہ تیرے دیکھنے بن دل مرا رہتا ہے افسردا

ہمن سب لوگ کہتے ہیں کہ تجھ کوں پیار کرتا نئیں
نئیں تو آشنا کوں یوں کوئی رکھتا ہے غم خوردا

تعجب ہے کہ تم سا آدمی ہو کر بھلا مانس
رکھے یوں بے گناہ اک آدمی کے دل کو آزردا

---

* یہ غزل دیوان شاہ مبارک آبرو مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن میں نہیں ہے ، دیوان آبرو (قلمی) مملوکہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں شامل ہے۔

قدیم فارسی فرہنگوں میں پیش از آریائی کلمات

ڈاکٹر محمد باقر*

ڈاکٹر نذیر احمد (مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) نے ''قدیم فارسی فرہنگوں میں اردو عناصر '' کا عنوان قائم کر کے ان کلمات سے بحث شروع کی ہے جن کو وہ مضمون کے متن میں ہندی یا ہندوستانی سے منسوب کرتے ہیں - اس مضمون کی پہلی قسط (مطبوعہ '' اردو '' جنوری ۱۹۶۸ء) میں یہ عرض کرچکا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کو چونکہ پیش از آریائی زبانوں سے دلچسپی نہیں ہے اس لیے وہ ان الفاظ کے مفاہیم سے انصاف نہیں کر سکے جو آج سے چھ سو سال ادھر متداول تھے ، اور ان فرہنگوں میں درج ہوئے ہیں - ان کی یہ کوشش قابل ستائش ہے کہ انہوں نے بعض مدت دراز سے ناپید فارسی فرہنگوں کو تلاش کیا ہے - مثلاً انہوں نے جولائی ۱۹۶۷ء کے اردو کے شمارے میں '' زفان گویا '' کے ایک نادر خطی نسخے کو عوام سے روشناس کرایا ہے ، لیکن اسی مضمون میں انہوں نے اس قدیم لغت سے جو ڈھائی سو الفاظ کے معانی نقل کئے ہیں ان میں سے بیشتر ناخوانا اور بے معنی ہیں - ضرورت اس امر کی تھی کہ وہ ان الفاظ کو نقل کرنے اور لغت نویس کے درج کئے ہوئے معنی بیان کرنے کے بعد عبارت کی کوئی ایسی شکل بناتے کہ قاری کے ذہن میں ان الفاظ کا کوئی مفہوم تو واضح ہوتا - لیکن کیا انہوں نے یہ ہے کہ صحیح اور غلط الفاظ کے مجموعے کو نقل کر کے خود بھی حیران ہوئے ہیں اور قاری کو بھی گومگو کی حالت میں چھوڑ گئے ہیں - ایک مثال واضح ہو :

---

* پرنسپل اورینٹل کالج ، پنجاب یونی ورسٹی ، لاہور -

" چغوک : قبرہ یعنی مانورک بہندوی مترہ گویند - یہی ہندی مترادف ادات اور موید میں موجود ہے - بظاہر موید میں منترہ غلط ہے - مترہ صحیح ہوگا مگر اس چڑیا کے ہندوستانی نام کی حقیقت سے ہم ناواقف ہیں - فرہنگ قواس کے ذیل میں اس کی بحث آچکی ہے " (اردو ، جولائی ۱۹۶۷ء ، ص ۱۰۱) -

اس عبارت سے چغوک یا قبرہ یا مترہ یا منترہ کی حقیقت واضح نہیں ہوتی - عرض یہ ہے کہ اگر آپ صرف فرہنگ آنند راج سے رجوع کریں تو آپ پر چغوک ، قبرہ (قّ بہ) اور مانورک (نّ) کے معانی تو واضح ہو جاتے ہیں ، یعنی یہ لفظ سرخاب اور ابابیل کے لیے استعمال ہوتا ہے - لیکن غلط خوانی سے معانی کے الفاظ کو مترہ اور منترہ پڑھ کے جس طرح پرندے کی حقیقت سے ناواقفیت کا اظہار کیا گیا ہے اسی طرح اصل مفہوم تک پہنچنا ناممکن ہے - کیونکہ لفظ سیدھا سادھا سا "چڑہ" (چ ِ) تھا جس کی آج کل کی رائج شکل " چڑا " ہے - مدار کے مولف نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے ، وہ یہ ہے :

" چغوک (فارسی) بفتح جیم پارسی و واو ، در ابراهیمیست بجیم عربی نیز ، همان چکاوک و قبیل جانوری است که بزبان هند چرا گویند " *

ڈاکٹر صاحب "چڑا " کی پنجابی وضع " چڑہ " سے مانوس نہیں ہیں ، ورنہ وہ چغوک کے معنی مترہ اور منترہ وغیرہ نہ پڑھتے ، جو بے معنی الفاظ ہیں -

یہ تو خیر ایک مثال تھی - اب میں سابقہ مضمون کو جاری رکھتے ہوئے ، اس مضمون میں زفان گویا کے ان الفاظ کو زیر بحث لاتا ہوں جن کی شکل یا تو پیش از آریائی یا پنجابی ہے اور جسے میں نے سابقہ مضمون میں "ہتد ہیندوئی" کا نام دیا ہے - ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ کو بھی غلط خوانی کی وجہ سے مبہم ، بے معنی اور مہمل بنا دیا ہے -

" آھار : پت جامہ کہ جولاھان کنند ، ہندوی بان گویند ، و آن

---

* مدار الافاضل مولفہ شیخ اللہ داد فیضی سرہندی (جلد دوم) مرتبہ ڈکٹر محمد باقر ، ص ۵۰ -

چیزی باشد کہ در جامہ مالند تا رنگ و صیقل دہد "۔ (زفان گویا بنقل از مقالہ ڈاکٹر نذیر احمد) ۔

"ادات میں بعینہ یہی معنی مع ہندوستانی مترادف کے درج ہے۔ مدار میں بھی ادات اور زفان کی طرح ' بان ' ہی ہے ۔ مگر موید الفضلا میں ہے : پت مالیدہ ۰۰۰۰۰۰ اول کار جولاہگانست آنرا ہند مانڈی گویند ، و دوم کار گازران است و آنرا ہند کلپ و کھرپ گویند ۔ واضح ہے کہ موید میں مدار سے زیادہ جدید شکل ہے۔ بظاہر مدار نے قدیم فرہنگوں سے ہو بہو نقل کرلیا ہے۔ ممکن ہے کہ قدیم قرائت "باں" ماں = مانڑ کی تصحیف ہو۔ جس سے مانڑی بنا ہے جو موید میں مانڈی ہے۔"　　(تبصرہ از ڈاکٹر نذیر احمد) ۔

اس طویل بیان کی جزئیات پر کیا بحث کی جائے ۔ مختصر طور پر یہ عرض ہے کہ آھار کا پیش از آریائی یا پنجابی مترادف " پان " ہے جسے اردو میں آج کل کلف کہتے ہیں ۔ اور یہ ادعا بھی درست نہیں ہے کہ مدار نے بھی اسے " بان " کہا ہے۔ مولف مدار کا بیان اور سند ملاحظہ ہو :

" اھار (فارسی) ، معروف ، اہل ہند آں‌را پان گویند و نیز بمعنی غذای نمک چنانچہ آشام و جز آن ، شاہنامہ :

بیا تا بکشتی پیادہ شویم　　بخون خواہی آھار دادہ شویم

درفشیدن شیغ الماس گون　　سنانہای آھار دارہ بخون " *

" سونش : آہن ریزہ و جز آن و برادہ ہم آنرا گویند ، ہندوی لہچن" (زفان گویا) ۔

" ادات میں بھی ہندوستانی متبادل لفظ موجود ہے ۔ بظاہر اس لفظ کا پہلا جز ' لہ ' لوھا کا مخفف ہے " ۔ (تبصرہ از ڈاکٹر نذیر احمد)

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے یہاں جس قیاس سے کام لیا ہے اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ لوہے کے برادے کے لیے پنجابی لفظ "لوہ چون" یا " لوہے چون " معروف ہے۔ لیکن اردو میں بھی تو اس کی بہت قریب کی

۱۔ مدارالافاضل ، مولفہ شیخ اللہ داد فیضی سرہندی (جلد اول) مرتبہ دکتر محمد باقر ص ، ۱۳۸ ۔

شکلیں لہچون ، لوہ چون ، لوہ چور اور لوہ چورن موجود ہیں (۱) -

" سماروغ : ...... خلق آنرا چتر مار خوانند و گروہی کھیرہ نیز خوانندش و ہندی ' سانپکا ' " (زفان گویا) -

" ادات میں چتر مار ہے اور موید میں چتر مار اور کھوہ ہے - چتر مار تو صاف ہے ، بقیہ دو کی قرأت مشتبہ ہے" - (تبصرہ) -

یہاں بھی اہل ہند کی زبان کے قدیم الفاظ کو پڑھا نہیں جا سکا - سماروغ کے معنی چترمار کی تائید مدار سے بھی ہوتی ہے (۲) لیکن چتر مار یا سماروغ کو پنجابی میں کھنبہ (۳) یا کھنب اور آج کل کی ہندی میں کھمبی (۴) کہتے ہیں جسے آپ کبھی کھیرہ پڑھتے ہیں اور کبھی کھوہ -

" شکنج : " علتی است بہندوی بدہ گویند " (زفان) -

" یہی ہندوستانی لفظ ادات اور موید دونوں میں موجود ہے - ' بدھا ' عامیانہ لفظ ہے - مگر معنی میں ذرا فرق ہے - چوٹ کی وجہ سے بدن پر اگر لکیر کی طرح ابھر آتا ہے تو اسے بدھا کہتے ہیں " (تبصرہ) -

یہ قیاس درست نہیں ہے - مدار میں لکھا ہے :

شکنج :- بکسر ، نوعی از علت دمیدگی آنکہ ہند بدہ (ب‍ ‍ د ‍ ہ) گویند - و بفتحتین ، گرہ ابرو و چین روی و اندام آنکہ ہندش جھری گویند و در تبنحتری فرق نکردہ و گفتہ بکسر ہر دو معنی مذکور و در حل لغات است شکن و تاب - (۵)

فرہنگ موید الفضلا نے یہی بیان لفظ بلفظ دہرایا ہے - اور یہ

۱- دیکھئے - Platts.

۲- مدارالافاضل مولفہ شیخ اللہ داد فیض سرہندی ، مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر (جلد دوم) -

۳- مایا سنگھ -

۴- Platts.

۵- مدار ، جلد دوم -

صحیح ہے کہ پنجابی میں اس گلٹی * (Bubo) کو بدہ کہتے ہیں جو بیماری کی شکل میں جسم کے کسی حصے پر ابھر آتی ہے ۔

" فراشتک : مرغکی است سیاہ و سپید .... بتازی آنرا خطاف و بہندی چمچرک گویند " (زفان) ۔

" ادات میں یہی معنی بدون ہندی مترادف کے درج ہے ۔ مگر موید میں ہندی مترادف چمرک ہے ۔ ممکن ہے موید کی قرأت درست ہو " (تبصرہ) ۔

یہ کلمہ بھی پنجابی ہونے کی وجہ سے صحیح شکل میں گرفت میں نہ آ سکا ۔ پنجابی میں چام چڑک یا چمچڑک (چ َڑ ِ) چمگادڑ کو کہتے ہیں ۔

" کلند : میتین یعنی سبل ، میتین == کلند و سبل را نیز میتین گویند " (زفان) ۔

" ادات اور موید میں کلند کو آلت گل کاران وغیرہ بتایا ہے ۔ لیکن میتین کے ہندی متبادل کو سابل لکھا ہے ۔ ظاہر ہے سابل اور سبل کی صحیح قرأت کے متعلق فیصلہ دشوار ہے ۔ البتہ زفان میں زوبین کا ہندی مترادف سبل ہی بتایا گیا ہے " (تبصرہ) ۔

سبل (س َ ب ْ ل) پیش از آریائی زبان کا لفظ ہے ۔ جو پنجابی * میں اب بھی مستعمل ہے ۔ اسے چور مٹی کی دیوار میں سیندھ لگانے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور معمار عمارت بنانے کے لئے ۔ ویسے سنسکرت میں اس کی شکل ساولا (و ِ) اور ہندی میں سبل (س َ ب ْ ل) یا سابل (ب َ) ملتی ہے ۔

" نہاز : گوسپند کہ پیشرو گلہ بود و گویند گوسپند نر کہ بہندوی ' بوکر ' گویند " (زفان) ۔

" یہ ہندوستانی لفظ کسی قدیم فرہنگ میں نظر نہیں آیا " (تبصرہ) یہ پنجابی کا لفظ " بوبکرا " ہے اور ابھی تک مستعمل ہے ۔

---

* مایا سنگھ ۔

چوب بارہ : مالہ کہ برکشت مالند و گویند گونہ، دیگر است از ساز بزرگری کہ بھلن گویند - (زفان)

" یہ ہندی لفظ اس لغت کے ذیل کسی فرہنگ میں نظر نہیں آیا " - (تبصرہ)

مالہ پنجابی میں اب بھی مستعمل ہے اور اس کی تشریح میں سابقہ مضمون میں کر چکا ہوں -

سکوہاک : گیاہی است کہ بہندوی گوکھرو گویند -" (زفان)

" موید میں بغیر حوالہ بعینہ آیا ہے " (تبصرہ) -

گوکھڑو ایک قسم کے پودے کا پنجابی نام ہے جسے پنجابی میں بھکھڑہ بھی کہتے ہیں - انگریزی میں اصطلاحی نام Tribulusalatus ہے -

شاہ ترہ : ترہ، معروف است او را ترہ میرہ (موید : ترہ مرہ) گویند و بہندوی پاپرہ - (زفان)

" موید الفضلا میں زفان گویا کے حوالے سے مطالب ہیں - مگر ہندی لفظ غیر حاضر ہے - مزید اس کے حوالے سے کچھ اور مطالب درج ہیں جو ہمارے نسخے میں موجود نہیں - بحر الفضایل میں شاہ ترہ کا ہندی متبادل لفظ دونہ ہے - بہر حال زفان گویا میں مندرج ہندی لفظ کی تصدیق و تصحیح نہ ہو سکی " (تبصرہ) -

شاہ ترہ کے لئے پنجابی میں تارا میرا (جسے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے ترہ میرہ اور ترہ مرہ پڑھا ہے) اور پاپڑہ دونوں لفظ متداول ہیں اور اس کی ہندی کی شکل پاپڑا ہے - اصطلاحی نام Gardenia latifolia * ہے -

" اصابع اللصوص : گیاہی است اتنکن گویند ، بہندوی جور انگلی " - (زفان)

" مدار میں ہے : نام گیاہی است کہ ہندش اتسن گویند و چور انگلی و در بعضی کتب طب است تخم اسکندہ - بظاہر مدار میں پہلا ہندی لفظ صحیح نہیں ، یہ اتنکن کی تصحیف ہے " (تبصرہ) -

---

* Platts.

پنجابی میں اصابع اللصوص کو اتسن ہی کہتے ہیں - مدار میں صحیح لفظ درج ہوا ہے -

" حرسف - داروئی است کہ بہندوی کنکر گویند " - (زفان)

" موید میں حرشف کے ذیل میں زفان گویا کی پوری عبارت مع حوالے کے نقل کردی مگر کنکر کی اصل معلوم نہ ہوسکی " - (تبصرہ)

پہلی بات تو یہ ہے کہ لفظ ' حرشف ' ہے - حرسف نہیں - مدار * نے بھی حرشف (حَ شَ) کے معنی کنکر دئیے ہیں - واژہ نامۂ گیاہی میں اسے (ہاتھی چک) کے مترادف قرار دیا ہے - پنجابی میں اسے کنکر ہی کہتے ہیں - ویسے کنکر انھی معنوں میں فارسی میں بھی رائج ہے -

شیخ بسحق اطعمہ :

کنکر چو برآورد سر از خاک زمیں گفت

خرما نتواں خورد ازیں خار کہ کشتیم

" خصی الثعلب - نباتی است کہ شاخ موبع و برگ گرد متفرق دارد ، بہندوی ' سیر باوہ ' گویند " (زفان) -

" موید میں بغیر حوالہ یہی عبارت مع ہندی متبادل کے درج ہے - مگر اس لفظ کی اصل ہیئت سے ہم ناواقف ہیں " - (تبصرہ)

اس کی شکل " خصیۂ الثعلب " (خُ ی ثَ لَ) ہے - ویسے خصی‌الثعلب کی ترکیب درست ہے لیکن صحیح نام یہی ہے جو اوپر درج ہوا ہے اور تمام فرہنگوں (آنندراج ، مدار وغیرہ) میں یہی درج ہے -

یہ دراصل ثعلب مصری ہے جسے پنجابی میں سیرباوہ کہتے ہیں - خصیۂ الثعلب کی وجہ تسمیہ غیاث اللغات کے مولف کی زبان سے سنئیے :

" دوای مذکور بیخی است بشکل خایۂ روباہ ، چون در نواحی مصر پیدا می شود بمصر منسوب کنند - ظاہراً فقط ثعلب مصری یا ثعلب گفتنن درست نباشد ، مگر آنکہ گوئیم چون لفظ خصیہ مکروہ است لہذا اگر فقط بلفظ ثعلب موسوم کنند جائز است " -

---

* مدار ، جلد دوم ، ص ۸۲ -

اس کے استعمال کی بات بہار عجم اور منتخب اللغات سے ملاحظہ فرمائیے :

" ثعلب : روباہ و فارسیان بمعنی خصیہ- الثعلب کہ نام بیخی است دوای استعمال کنند ۔ ثعلب فروش : کسیکہ بیخ مذکور را جوش دادہ در بازارہا بفروشد و این مخصوص ایران است در ہندوستان نیست " ۔

اب فرہنگ روستائی یا دائرۃ المعارف فلاحتی سے اس کی تفصیل دیکھئے :

" ثعلب ۔ (Orchis) ثعلب نباتی است از خانوادۂ ارشیدہ (Orchidees) دارای گلہای خوشہ ای و برگہای پہن ۔ ریشۂ ثعلب دو غدہ دارد یکی تو خالی کہ گیاہ ثعلب از آن روئیدہ و دیگر توپر کہ مایۂ جوانۂ سال آیندہ است ۔ ادویۂ معروف یعنی ثعلب (Salep) مادہ ایست خوراکی کہ از خشکانیدن و آرد نمودن غدہ ہای ریشۂ گیاہ ثعلب بدست میاید ۔ مرکز ثعلب ایران لرستان ، آذر بایجان و کردستان است ۔ عموماً محصول ثعلب در تیر و مرداد برداشت میشود ۔ ثعلب را بدین ترتیب تہیہ می کنند کہ ابتداً غدہ ہای ریشہ را جدا کردہ پس ازانکہ آنہا را پاک کردند در آب گرم خیس میکنند ۔ ہمینکہ خیس خورد پوست غدہہائی در آمدہ را خشکانیدہ بنخ میکشند ۔ این غدہ ہای قہوہ ای رنگ و بہ درشتی فندق است ۔ گاہی درشت تر ازان ہم دیدہ میشود یعنی باندازۂ گردو ۔ در ایران دو گونہ ثعلب دیدہ میشود ، یکی ثعلب دانہ درشت معروف بہ ثعلب پنجہ ای و دیگری ثعلب دانہ ریز معروف بہ ثعلب گردہ است " * ۔

ثعلب کے استعمالات کا ذکر بھی دکتر تقی بہرامی کی زبان سے سنئیے :

" ثعلب در تہیہ ی بستنی وغیرہ مصرف میشود جوشانیدہ شیری و آبی آنرا ہم میسازند ۔ در کشور ہای خارجہ ثعلب را در پارچہ بافی ابریشم و دوا ہای کودکان و تنقلات بکار میبرند ۔ سابقاً

---

* فرہنگ روستائی تالیف دکتر تقی بہرامی ، جلد دوم ، ص ۳۱۱ ۔

ثعلب ایران بیشتر به هندوستان و بین النهرین صادر میشده و در سالهای اخیر ۵۰ — ۹۰ در صد آن بهندوستان رفته لیکن در سال ۱۳۱۴ — ۱۳۱۵ مقداری زیادی هم به انگلستان فرستاده شده''۔ (۱)

اس سلسلے میں آخری تائید مدار کی ملاحظ ہو :

خصیۃ الثعلب : گیاهی است که شاخ مربع و برگ گرد دارد و بزبان هند سیر باوه گویند '' ۔ (۲)

'' قسط ۔ داروئی است که کوتھ گویند '' ۔ (زفان)

'' سوید میں متبادل لفظ ، پھکر مول ، ہے ۔ دونوں لفظوں کی حقیقت معلوم نہ ہو سکی '' ۔ (تبصرہ)

' قسط ' عود ہندی کو کہتے ہیں ۔ اسے پنجابی میں '' کوٹھ '' یا '' کٹھ '' (کٹّ) کہتے ہیں ۔ یہ ایک قسم کی کڑوی خوشبو دار دوا ہے جو اب بھی پنجاب کے دیہات میں بخار کے علاج کے لیے استعمال ہوتی ہے ۔ اسے اس کے ذائقے کے اعتبار سے قسط تلخ بھی کہا جاتا ہے ۔ یہ یورپ میں بھی پہلے بخار کے علاج کے لیے استعمال ہوتی تھی اور اسے پنجابی میں بعض علاقوں میں پھکرمول بھی کہا جاتا ہے ۔ انگریزی میں اصطلاحی نام ہے (۳) : Aneklandia, Costus اور Compositae

'' آنک ۔ مس و روی گداخته و سرب که بهندی سکا و سیسه گویند ۔ '' (زفان)

'' سیسہ تو عام ہے مگر ' سکا ' کی حقیقت واضح نہ ہو سکی ''۔ (تبصرہ)

پنجابی میں ' سکا ' (سِکّہ) سیسے کو ہی کہتے ہیں ۔

حلذون کے پنجابی معنی سنکھ اور طنبور کے معنی کنگرہ کے متعلق میں پہلے مضمون میں بحث کر چکا ہوں ۔ پہلا لفظ سنگھ نہیں بلکہ سنکھ ہے ۔

۱۔ فرہنگ روستائی ۔

۲۔ مدارالافاضل مولفہ شیخ اللہ داد فیضی سرہندی مرتبہ دکتر محمد باقر ، (جلد دوم ، ص ۱۴۹) ۔

۳۔ مایا سنگھ ۔

اب یہاں پھر ان چند الفاظ کی فہرست پیش کی جارہی ہے جن کا حلیہ پنجابی ہے اور جو فارسی کے متبادل الفاظ کی شکل میں فرہنگ زفان گویا میں درج ہوئے ہیں :

فارسی	پنجابی
بازنیج	پینگھ
پکوک	چھج (چھاج)
پاخه	کچھو (کچھوا)
روین	منجیٹھ (مجیٹھه)
شمه	ملائی (بالائی)
گشنیز	دھنیه (دھنیا)
بادبیزن	پکھه (پنکھا)
یوغ	جوتره (جوا)
نان خواه	جواین (اجوائن)
اجمود	جوائن (اجوائن)

عربی تنقید کے بنیادی رجحانات

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی*

عربی تنقید ایک وسیع موضوع ہے اور قدیم بھی۔ عربی زبان میں تنقیدی مظاہر کا آغاز عہد جاھلیت سے ھوتا ھے۔ جاھلیت میں جو تنقیدی رجحان ملتا ھے وہ باوجود محدود اور شخصی پیمانوں پر مشتمل ھونے کے اپنے اندر عظمت کا پہلو بھی رکھتا ھے۔ جاھلیت میں ادبی تنقید کے میدان میں سب سے اھم موضوع شعرا کے تقابلی مطالعے اور موازنے کا ملتا ھے۔ چنانچہ جاھلیت میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے بازار اسی مقصد کے لیے تھے کہ ان میں شعرا جمع ھو کر اپنے کلام کو سناتے اور سامعین سے داد سخن لیتے تھے۔ ان ادبی میلوں میں شعرا کی طرح خطیبوں کے خطبات بھی ھوتے تھے اور پھر باھم ان میں مسابقت اور تفاخر کے جذبات بھی پیدا ھوتے تھے۔ عکاظ کا ادبی میلہ تو اسلام کے بعد تک موجود رھا، یعنی سنہ ۱۲۹ھ تک (۱)۔ اس حقیقت کے آئینے میں یہ قیاس کرنا بہت آسان ھے کہ جس قوم میں شعر و ادب سے دلچسپی کا یہ عالم ھو تو یقیناً اس کے یہاں تنقیدی پیمانے بھی ھونے لازم ھیں، اس لیے کہ کوئی ادبی شاہکار بغیر اعلا تنقیدی شعور کے منصۂ وجود پر نہیں آ سکتا۔ مذکورہ محفلوں میں شعرا کسی بڑے شاعر کے سامنے اپنا کلام پڑھتے تھے اور وہ شاعر ان کے کلام پر تبصرہ بھی کرتا تھا، چنانچہ اس سلسلے میں جاھلی شاعر نابغہ ذبیانی کا قصہ مشہور ھے کہ

---

* استاد شعبۂ عربی، ونکٹیشور یونی ورسٹی، آندھرا۔

۱- الغزل عندالعرب مولفہ ابو رحاب، طبع اول، قاھرہ ۱۹۴۷ء، ص ۲۶ — ۲۷

اس کے پاس اعشی شاعر آیا اور اس نے اپنے اشعار سنائے۔ اس کے بعد حضرت حسان (جنھوں نے ساٹھ سال جاھلیت کے پائے اور ساٹھ برس اسلام کے بعد زندہ رہے) آئے اور انھوں نے اپنے اشعار پڑھے۔ نابغہ ذبیانی نے کہا اگر ابھی اعشی نے بہت عمدہ اشعار نہ سنائے ہوتے تو میں تم کو تمام انسانوں اور جنوں سے بہتر شاعر قرار دیتا ۔ حضرت حسان نے کہا کہ میں تم سے اور تمھارے باپ سے بڑا شاعر ہوں ، اس پر نابغہ نے ان کا ھاتھ پکڑ کر کہا صاحبزادے ابھی تم ایسا شعر نہیں کہہ سکتے :

فانک کاللیل الذی ھو مدرکی
و ان خلت آن المنتائی عنک واسع (۱)

تو اس رات کی طرح ہے جو مجھ پر آنے والی ہے ، خواہ تم یہ خیال کرو کہ ابھی تم سے بہت دور ہے۔

اس واقعے میں ابھی وھی موازنے کا رجحان ملتا ہے۔ اس سے دلچسپ قصہ امرؤ القیس کا ہے۔ امرؤالقیس اور علقمہ بن عبدہ ایک دوسرے سے اس موضوع پر بر سر پیکار ہوئے کہ ان میں سے ہر ایک مدعی تھا کہ وہ زیادہ بڑا شاعر ہے۔ اس پر علقمہ نے کہا کہ اچھا میں تمھاری بیوی کو حکم بناتا ہوں جو فیصلہ وہ کردے اس پر ہم دونوں راضی ہو جائیں گے۔ ام جندب نے دونوں سے کہا کہ تم دونوں ایسے اشعار کہو جن میں گھوڑے کی تعریف ہو اور اشعار میں قافیہ و ردیف یکساں ہونا چاھئے ۔ چنانچہ دونوں نے اشعار کہہ کر سنائے ۔ ام جندب نے اپنا فیصلہ یہ سنایا کہ علقمہ زیادہ بڑا شاعر ہے اس لیے کہ تم یعنی امرؤ القیس کہتے ہو کہ :

فللسوط الھوب و للساق درة   و للزجر وقع آخرج مھذب

ڈنڈے کے لیے تھکا ہوا غبار اڑانے والا گھوڑا ہے ، پنڈلی کے لیے ڈنڈا ہے اور سخت ڈانٹ ہے۔

لیکن اس کے برعکس علقمہ کہتا ہے :

فادرکھن ثانیاً من عنانہ   یمر کمثر السائح المتحلب

اس نے باگ موڑ کر ان کو دوبارہ پالیا اور وہ نہایت تیز رو ہے (۲) -

---

۱- الشعر و الشعراء، ج ۱ ، ص ۱۲۳ -

۲- ترجمہ لفظی نہیں ہے۔

اس طرح تم گھوڑے کو مارتے ہو اور تھکتے ہو مگر علقمہ کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا نظر آتا ہے اس لیے وہ تم سے بڑا شاعر ہے ۔ امرؤ القیس نے کہا : علقمہ مجھ سے بڑا شاعر نہیں ہے ، البتہ تم کو اس سے محبت ہو گئی ہے ۔ چنانچہ امرؤ القیس نے اس کو طلاق دیدی اور علقمہ نے اس سے شادی کر لی(۱) ۔

یہاں بھی اصل رجحان وہی موازنے کا ملتا ہے ۔ ام جندب کے فیصلے میں کہاں تک انصاف تھا ؟ یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے اس لیے کہ اس دور میں اصول و مبادی نہ تھے ، فیصلوں کا انحصار ذاتی میلان و ذوق پر تھا ۔

حضرت لبید جو جاہلی شاعر تھے اسلام کے بعد زندہ تو بہت زمانے تک رہے مگر اشعار نہ کہے ، جب فرمائش کی گئی تو کہا کہ قرآن مجید کے آگے میں شعر کیا کہوں ۔ انھوں نے صرف یہ شعر کہا :

الحمد للہ الذی لم یاْتنی اجلی حتی لبست من الاسلام سربالا

سب تعریف خدا کی ہے کہ میری موت نہ آئی ، حتی کہ اسلام کا لباس مجھے نصیب ہوا ۔

حضرت لبید ایک بار کوفہ سے گزر رہے تھے ، بنی نہد نے ایک قاصد بھیجا اور پوچھا کہ سب سے بڑا شاعر کون ہے ۔ آپ نے فرمایا امرؤ القیس ۔ اس نے پوچھا اس کے بعد؟ بولے طرفہ ۔ اس نے پھر پوچھا ، اس کے بعد ۔ فرمایا کہ میں (۲) ۔

یہاں بھی وہی اصول موازنہ ملتا ہے اور عہد جاہلیت کے اکثر واقعات سے یہی حقیقت آشکارا ہوتی ہے ، بلکہ اموی دور میں تو اصول موازنہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا ۔

اس رجحان کے علاوہ بھی دور جاہلیت میں ادبی تنقید پر جو مواد ملتا ہے اس میں تنقیدی پیمانے مبہم انداز میں ملتے ہیں اور یہ ابتدائی عہد کی خصوصیت ہے ۔

۱- الموشح مؤلفہ المرزبانی ، ص ۲۷ - ۲۸

۲- طبقات الشعرا، از ابن سلام ، مطبوعہ ، بریل ، لائیڈن ۱۹۱۳ء ، ص - ۱۶

دوسرا تنقیدی رجحان عربی شاعری میں وہ مدرسہ ہائے فکر تھے جو " راویہء شعرا " کے نام سے موسوم تھے -

ہر شاعر کسی بڑے شاعر کا شاگرد اور اس کے رنگ کا ترجمان ہوتا تھا اور یہ سلسلہ پورے عرب میں پھیلا ہوا تھا - ظاہر ہے کہ اس نے ایک تنقیدی ماحول پورے معاشرے میں پیدا کردیا تھا اور یہ تہذیب ذوق شعری کا بہت اچھا طریقہ تھا جو بعد میں بھی باقی رہا -

جاہلیت میں شعر کی تنقید کا ایک اور پہلو ملتا ہے جس کو تنقید ذاتی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ، اس لیے کہ تخلیق نگار کی نگاہیں تنقید کی کسوٹی پر پہلے تخلیق کو کستی ہیں پھر وہ اس تخلیق کو حک و تحکیک کے بعد منظر عام پر لاتا ہے -

عہد جاہلیت میں زہیر بن ابی سلمی کا یہ اصول تھا کہ وہ اشعار کہہ کر ایک سال تک ان کو درست کرتا رہتا تھا - نوک پلک سنوار کر اور کیل کانٹے سے درست کر کے ایک سال بعد ان کو عوام کے سامنے لاتا تھا ، اس لیے اس کے قصائد کو " حولیات " کہتے ہیں - *

علاوہ ازیں وہ قصائد جو سبع معلقات کے نام سے مشہور ہیں ، ان کی عظمت اور ان کے اندر فنی پختگی اس بات کا ثبوت ہے کہ عہد جاہلیت میں عربوں کے یہاں تنقیدی شعور موجود تھا - چنانچہ مختلف واقعات سے جن کی تفصیل باعث تطویل ہو گی ، یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کے غلط استعمال ، قافیہ و روی کی عدم مناسبت اور اشعار کے حسن و قبح کا عرفان رکھتے تھے ، مگر ان کے اندر اتنا تنقیدی شعور نہ تھا کہ وہ اپنی پسندیدگی و ناپسندیدگی کے اسباب کو بیان کر سکیں -

بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عربوں کی زندگی ایک عظیم انقلاب سے دو چار ہوئی اور اسلام نے معاشرے کی ان قدروں کو بدل دیا جو جاہلیت میں تھیں - اس اخلاقی ، تہذیبی اور فکری انقلاب نے زندگی کے دھارے کا رخ موڑ دیا اور شعر و شاعری کا چرچا بہت کم ہو گیا - قرآن مجید سے شغف بڑھا اور فتوحات میں لوگ مشغول ہو گئے - لیکن شاعری جس قوم کی گھٹی میں پڑی ہو وہ اسے ایک دم ترک نہیں کر سکتی - چنانچہ جذبات شعری کا

---

* کتاب العمدہ ، ج ۱ ، ص ۱۲۹ ، طبع دوم ، مطبع سعادت مصر -

مظاہر، خود حضور کی زندگی میں ہوتا ہے۔ شعرا کبھی آپ کی مدح کرتے ہیں اور کافر شعرا کبھی آپ کی ہجو کرتے ہیں اور مسلم شعرا ان کا جواب دیتے ہیں -

صدر اسلام میں عربی تنقید میں دو عناصر داخل ہوتے ہیں، ایک تو عنصر دینی اور دوسرا صدق - دین کی مدافعت اس دور میں شعرا کا سب سے اہم فرض تھا، چنانچہ مسجد نبوی میں منبر نصب ہوتا اور اس پر بیٹھ کر حضرت حسان بن ثابت کفار کی ہجو فرماتے - حضور نے حضرت حسان سے دریافت کیا کہ تم اہل مکہ کی ہجو کیسے کرو گے جب کہ میں خود قریشی ہوں - انھوں نے فرمایا کہ میں آپ کو ان میں سے اس طرح نکال لوں گا جیسے بال آٹے سے الگ کیا جاتا ہے - (۱)

حضور نے فرمایا کہ اشعار اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی، لوگوں کا فرض ہے کہ برے اشعار چھوڑ کر عمدہ چن لیں - (۲)

حضرت عمر رض نے ابن عباس سے کہا کہ تم سب سے بڑے شاعر کا کلام سناؤ، انھوں نے پوچھا کہ وہ کون شاعر ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ زہیر بن ابی سلمیٰ، اس لیے کہ وہ کلام میں رکتا نہیں، یعنی روانی ہے اور نہ وحشی الفاظ استعمال کرتا ہے اور آدمی کی تعریف اتنی ہی کرتا ہے جتنی صفات واقعی اس کے اندر موجود ہوتی ہیں - (۳)

حضرت عمر رض نے مذکورہ تنقید میں ہیئت اور معنی دونوں کا لحاظ رکھا ہے - اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک مقولہ ملتا ہے کہ "شعر قول کی میزان ہے"۔ ایک روایت میں ہے کہ شعر قوم کی میزان ہے (۴) - اس نقطۂ نظر سے اس ایک تنقیدی فقرے پر اگر ہم غور کریں تو ہم کو محسوس ہوگا کہ حضرت علی رض نے کتنی معیاری پہچان بتائی ہے کہ کسی قوم کو جانچنے اور اس کی ذہنی، تہذیبی اور فکری صلاحیتوں کو ٹٹولنے کا ذریعہ اس کی شاعری ہے - اس کی شاعری کے سرمائے کو تول کر ہم میزان پر اس کی معنوی

۱- کتاب العمدہ، ج ۲، ص ۸ -

۲- کتاب العمدہ، ج ۱، ص ۲۷ -

۳- طبقات الشعرا، مولفہ ابن سلام، ص ۱۸ -

۴- کتاب العمدہ، ج ۱، ص ۲۸ -

قیمت کا اندازہ کر سکتے ھیں۔ اگرچہ اس سے قبل بھی عربوں کے یہاں ایک جملہ مشہور تھا کہ شاعری عربوں کا دیوان ھے، جس میں ان کی پوری زندگی مصور ھے۔ مگر حضرت علی رض کا یہ جملہ کہ شاعری کسی قوم کو ناپنے کا ذریعہ اور میزان ھے، میتھیو آرنلڈ کے اس مشہور تخیل سے بالکل ملتا ھے کہ شاعری زندگی کی تنقید ھے۔

اس طرح اگر ھم ان پیمانوں کا تجزیہ کریں جو اسلام نے عربی تنقید کو دیے تو ان میں سب سے پہلا اصول تو صدق کا ھے، اس کے بعد وحشی اور غیر معروف الفاظ سے اجتناب کا ھے، جس کا جاھلی شاعری میں رواج تھا۔ مدح میں حقیقی صفات محمود تھیں اور ساتھ ھی اسلام کی مدافعت بھی مطلوب تھی، یعنی اشعار کو جانچتے وقت مذھبی تاثر بھی ایک عامل بن گیا تھا۔

اسلام نے عربی شاعری کو زندگی کی نئی قدریں دیں، نیا اسلوب بخشا، الفاظ اور اسلامی اصطلاحات کا ایک وسیع ذخیرہ دیا۔ بلاغت و سلاست کے جوھر عطا کئے اور قرآن مجید نے فکر و معنی کے لحاظ سے عربی شاعری اور اس کے پرکھنے کے معیار کو متاثر کیا۔

عصر اموی میں جو قبائلی عصبیت کی فضا پیدا ھوئی، اس نے عہد جاھلیت کے شاعرانہ ماحول کو دوبارہ زندہ کردیا اور خلفا و امرا شعرا کے ذریعے سیاست کے استحکام میں مدد حاصل کرنے لگے، ایک قبیلے کو دبانے اور دوسرے کو ابھارنے۔ یہی وجہ ھے کہ ان خلفا کے دربار شعرا سے بھرے رہنے لگے۔ اس دور میں عربی تنقید کا سارا سرمایہ موازنہ و مقابلہ تھا، چنانچہ عراق میں "مربد" شعرا کا مرکز بن گیا تھا اور وھاں فرزدق، جریر اور اخطل ایک دوسرے کے خلاف ھجو گوئی میں مشغول رہتے تھے۔ لوگ دو جماعتوں میں تقسیم ھو گئے تھے، ایک فرزدق کا طرفدار دوسرا جریر کا۔ ان لوگوں نے اتنا اودھم مچایا کہ بالآخر ان دونوں شعرا کی نشست گاھیں حکومت نے منہدم کرادیں۔ ان "نقائض" سے عربی شاعری کو فائدہ پہنچا اور ذخیرۂ الفاظ میں وسعت پیدا ھوئی۔

اس دور میں عربی تنقید میں قبائلی اور مقامی عصبیت پوری طرح اثرانداز ھو گئی تھی۔ اھل حجاز تو عمر بن ابی ربیعہ کو سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے اس لیے کہ وہ حجازی تھا، اسی طرح بنی تغلب اخطل کو شاعر اعظم کہتے تھے، اس لیے کہ وہ ان کے قبیلے سے متعلق تھا۔

اس رجحان کے علاوہ اس دور میں یہ شعور بھی لوگوں میں تھا کہ بعض شعرا عوامی ہوتے ہیں ان کے اشعار عوام الناس پسند کرتے ہیں اور بعض اشعار خواص کے نزدیک پسندیدہ ہوتے ہیں چنانچہ ابن داب نے یہ تبصرہ کیا کہ فرزدق عوام کا سب سے بڑا شاعر ہے اور جریر خواص میں سب سے بڑا مرتبہ رکھتا ہے۔ (۱)

مفاصلت اور موازنہ اس دور کا سب سے بڑا تنقیدی پیمانہ تھا جس میں سیاسی اور قبائلی عناصر بھی داخل تھے ۔ مفاخرت کے اشعار تو ہالی وہ گئے مگر باہم ایک دوسرے کے اشعار پر جو تبصرے کئے گئے تھے ان کو عربوں نے محفوظ نہ رکھا ۔ بہر حال ادبی تنقید توضیح بھی ہے اور ترجیح بھی اور اسی کا مظاہرہ اس دور میں ہوتا ہے۔

عبدالملک بن مروان کی تنقیدی آراء سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں عربی اشعار میں عجمیت کے عناصر ناپسندیدہ تھے، اگرچہ بعد میں ابو تمام اور متنبی نے ان سے عربی شاعری کو پر کردیا ۔ عبدالملک کی تعریف ایک شاعر نے "تاج" سے کی تو اس نے کہا کہ تم مری توصیف تاج سے کرتے ہو گویا کہ میں عجمی ہوں اور مصعب ابن زبیر کو تم "شہاب" قرار دیتے ہو؟ (۲)

بہر حال عصر اموی کے آخر میں جو علما اور راویوں کا طبقہ پیدا ہوا اس نے درحقیقت عربی تنقید کو بڑا نفع پہنچایا ۔ اس میں اصمعی، ابن اعرابی اور حمادالراویہ وغیرہ شامل ہیں جن کی آراء سے ادبی کتابیں پر ہیں ۔ عصر جاہلی سے اموی تک شخصی اور غیر اصولی دور تھا، عربی تنقید کا اب اصل دور عصر عباسی ہے جس میں اصولی اور منظم تنقید شروع ہوتی ہے۔

عربوں کے یہاں ادبی تنقید میں صدق و کذب کا مسئلہ نقادوں کے درمیان ما بہ النزاع رہا ہے ۔ اس سلسلے میں دو نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں ۔ پہلا طرز فکر یہ ہے کہ "خیر الشعر اصدقہ" بہترین شعر وہ ہے جو زیادہ سچا ہو ۔ یہ رجحان جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا اسلامی اقدار حیات کا پیدا کردہ تھا ۔ یوں بھی عربوں کی شاعری حقائق حیات سے قریب تر ہے اور جھوٹ

۱- طبقات الشعراء، ابن سلام، ص ۵۷

۲- المؤشح، از مرزبانی، ص ۲۲۱

اور مبالغے سے بعید - نفسیاتی طور پر ابتدائے اسلام میں یہ طرز فکر واقعی اہل نظر کا بنیادی محور تھی، جنانچہ حضرت عمر رض کا قول صدر اسلام کی تنقیدی بحثوں میں گزر چکا ہے کہ انہوں نے زھیر کی تعریف میں فرمایا تھا کہ وہ اس بات کی تعریف کرتا ہے جو واقعی انسان میں موجود ہوتی ہے - اس مبحث پر حضرت حسان بن ثابت انصاری کا مشہور شعر ہے کہ :

ان أحسن الشعر انت قائله   بیت یقال اذا أنشدته صدقاً

(بہترین شعر وہی ہے جس کو سن کر لوگ کہیں کہ یہ سچا ہے)

قدامہ بن جعفر کذب کو شاعری کا حسن قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک مبالغہ اور جھوٹ کے بغیر عمدہ شاعری ممکن نہیں -

ابو ہلال عسکری بھی اسی انداز میں سوچتے ہیں اور کہتے ہیں '' اکثرہ قد بنی علی الکذب'' زیادہ اشعار کی بنیاد جھوٹ پر ہوتی ہے(*)اسی خیال کو مشہور شاعر بحتری نے اس طرح ادا کیا ہے -

کلفتمونا   حدود   منطقکم   والشعر یغنی عن صدقه کذبه

تم ہم کو اپنے منطقی حدود کا مکلف بنانا چاہتے ہو حالانکہ شعر میں جھوٹ سچائی سے بے نیاز کردیتا ہے -

ایک اور مقولہ ہے کہ '' احسن الشعر اکذبه '' یعنی سب سے بہترین شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹا ہو - اس سے قبل یہ مقولہ گزر چکا ہے کہ خیر الشعر اصدقه یعنی سب سے عمدہ شعر وہ ہے جو زیادہ سچا ہو !

ان دونوں طرز فکر پر تبصرہ کرتے ہوئے عبد القاہر جرجانی لکھتے ہیں کہ جھوٹ سے شاعری کا میدان زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اور سچ شاعری کے لیے ایسی چیز ہے جیسی عقیم حسینہ -

عرب ناقدوں میں شاید ابن رشیق ایسے ناقد ہیں جو کذب و مبالغہ کو شاعری میں غلط تصور کرتے ہیں اور اس کو حق کے حدود سے تجاوز سمجھتے ہیں - وہ تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ کسی کلام پر اگر کتاب اللہ سے کوئی شہادت مل جائے تو اور اچھی بات ہے -

یہاں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہئے کہ کذب و مبالغہ دراصل یونانی اثرات سے عربوں کی تنقید میں داخل ہوئے ہیں ، چنانچہ اس موضوع پر

(*) کتاب الصناعتین ، ص ۱۳۱

سب سے پہلے قدامہ بن جعفر ہی نے لکھا ہے۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ عام عرب ناقدوں کا رجحان اس طرف ہے کہ مبالغہ اور کذب شاعری کی عظمت کا جوہر ہیں ۔ مگر اس موقع پر یہ امر قابل توجہ ہے کہ کذب سے مراد وہ کذب نہیں جو صدق کا مقابل ہے بلکہ اس کا مقصد افراط صفت اور مبالغہ کے ذریعہ ایک کیفیت حسن پیدا کرنا ہے ۔

اس بحث سے ملحق ایک دوسرا مسئلہ ہے یعنی اخلاق اور فن کے مابین رشتہ کا ۔ یہاں بھی ناقدین عرب کے دو گروہ نظر آتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ابو تمام کی شاعری پر جو بہت سے اعتراضات وارد کئے گئے ان میں فساد عقیدہ کا بھی الزام تھا ۔ اس طرح بعد میں متنبی کے مخالفوں نے جو الزامات اس پر عائد کئے،ان میں ایک اس کی بے دینی بھی تھی مگر ان دونوں شعرا کے مدافعین نے اس الزام کو خارج از موضوع قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابو بکر صولی لکھتے ہیں کہ ابو تمام پر کفر کا الزام عائد کیا گیا مگر یہ تہمت شاعری سے غیر متعلق ہے اس لیے کہ نہ کفر سے شاعری میں کمی واقع ہوتی ہے اور نہ ایمان سے شاعری بڑھتی ہے ۔ (۱)

اس طرح قاضی جرجانی جنھوں نے ایک پوری کتاب ہی متنبی کی مدافعت میں تصنیف کی ہے لکھتے ہیں کہ بے دینی اگر عیب ہوتی تو بے شمار شعرا کو شاعروں کی فہرست سے خارج کردیا جاتا مثلاً ابو نواس اور بشار بن برد وغیرہ، دین کا مقام اور ہے شاعری کا اور ۔ (۲)

قدامہ بن جعفر نے لکھا ہے کہ فحش معانی سے شاعری کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ۔ اس نے امرؤ القیس کے چند فحش اشعار لکھ کر کہا ہے کہ یہ اخلاق کی نظر میں سخت معیوب ہیں مگر فنی نقطہ نظر سے ان کا شمار اعلا اشعار میں ہے ۔ (۳)

اصمعی السید حمیری کو ایک اچھا شاعر شمار کرتا تھا مگر وہ کہتا

۱۔ اخبار ابی تمام ، ص ۱۷۳

۲۔ الوساطہ ، ص ۶۲

۳۔ نقد الشعر ، ص ۴

تھا کہ اگر وہ بد دین نہ ہوتا تو اس سے بڑا شاعر اس کے طبقے میں کوئی نہ تھا ۔ (۱)

اخلاق اور حسن کا مسئلہ تو خود دور جدید کے اہم مسائل سے تعلق رکھتا ہے اور ناقدان ادب اس بارے میں عربوں کی طرح دو گروہوں میں منقسم نظر آتے ہیں مگر عرب ناقدوں کے اندر عام احساس اس کا تھا کہ شعر بہرحال جاندار ہونا چاہئے اور فحش اشعار و شعرا تک کی انہوں نے قدر کی ہے ۔ دہن شاعری کے لیے عیب نہیں ہے مگر اشعار میں جان ہونی چاہئے ۔ اس سلسلے میں عبدالملک کا ایک دلچسپ قصہ ہے کہ راعی شاعر اس کے پاس گیا اور ایک قصیدہ اس کے سامنے پڑھا جس کا ایک شعر یہ تھا :

عرب نری اللہ فی اموالنا حق الزکاۃ منزلا تنزیلا

ہم عرب ہیں اپنے مالوں میں زکواۃ کا حق ادا کرتے ہیں جو خدا کی طرف سے فرض کی گئی ہے ۔

عبدالملک نے اس پر تبصرہ کیا کہ یہ شعر نہیں ہے ، ہاں اسلام کی شرح ہے اور ایت قرآنی کی تلاوت ہے ۔ (۲)

بہر حال عرب ناقدوں کی اکثریت کا رجحان یہی ہے کہ فساد عقیدہ شاعری کے لیے عیب نہیں اور اخلاقی حدود کی پابندیوں سے شاعر کے تخلیقی عمل کو متاثر نہ ہونا چاہئے اور نہ اس کی وجہ سے فنی روح کو مجروح کرنا چاہئے ۔

اب نظریاتی نقطہ نظر سے عربی تنقید کا ایک بنیادی مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے ، یہ در حقیقت قدامہ بن جعفر کی تخلیقی فکر کا نتیجہ ہے ۔ قدامہ نے مدح ، ہجو اور دوسری اصناف سخن پر غور کر کے معانی کے نقطہ نظر سے یہ فیصلہ کیا کہ انسان کے کردار کی صفتیں چار ہیں یعنی عدل ، عفت ، شجاعت اور عقل ۔ (۳) قدامہ کی نظر میں ساری انسانی صفات کا محور یہی چار صفتیں ہیں ۔ انہیں سے سخاوت ، صبر ، قناعت ، شکر ، پاکدامنی اور دوسری

۱- الاغانی ، ج ۷ ، ص ۲۳۶
۲- الموشح ، ص ۱۵۷
۳- نقد الشعر ، ص ۲۰

صفات متفرع ہیں ، جو شاعر ان صفات سے ہٹ کر کسی کی تعریف کرتا ہے وہ غلطی کا مرتکب ہوتا ہے ، جو ان حدود کی پابندی کرتا ہے وہ اپنے گوہر مقصود کو پالیتا ہے ۔ (۱)

اس نظریے کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ صفات جسمانی اور خارجی اوصاف کا بیان شاعری میں قدامہ کے نزدیک ناپسندیدہ ٹھیرا - چنانچہ محبوب کی کمر کے بیان اور ہاتھ اور چہرے کی تعریف کو قدامہ نے معیوب قرار دیا ۔ یہ طرز فکر یونانی تخیل کا پرتو نہ تھی بلکہ یہ خود قدامہ کی اختراع تھی کہ اس نے انسانی کردار کی بنیادی صفات کی تعریف کو ہی تعریف قرار دیا ۔ شاید اس کا ذہن اس طرح کام کر رہا ہو کہ محبوب یا ممدوح کے چہرے ، ہاتھ ، پیر ، کپڑے اور دوسری خارجی اشیاء کے بیان سے اکثر ابتذال اور رکاکت پیدا ہو جاتی ہے ، لہذا انسان کی بہتر تعریف اس کے کردار اور اخلاقی صفات ہی سے ممکن ہے ۔

قدامہ کے اس نظریے کو اکثر عرب ناقدین نے قبول کرلیا اور اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے ، چنانچہ مرزبانی کا خیال ہے کہ جسمانی صفات کا بیان نامحمود ہے ۔ (۲) ابوہلال عسکری نے لکھا ہے کہ جسمانی صفات کی بجائے مدح میں صفات نفسیہ کو پیش نظر رکھنا چاہئے ۔ (۳)

ابن رشیق نے '' فضائل نفسیہ '' کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ اعلا مدح صفات انسانی کی یہی ہے ، اگر کوئی شاعر خارجی اوصاف کا ذکر کرتا ہے تو وہ افضل بات نہیں ہے ، ویسے اس کو اس کا اختیار ہے ۔ (۴)

فضائل نفسیہ کا انکار سب سے پہلے آمدی نے کیا ہے ، اس نے لکھا ہے کہ اوصاف جسم سے انکار کرنا شاعری کے دائرہ کو تنگ کر دینا ہے ۔ آمدی نے ایک کتاب بھی قدامہ کے نظریات کی تردید میں تالیف کی تھی مگر وہ دست برد زمانہ کی نذر ہوگئی ۔

۱۔ نقد الشعر ، ص ۲۰

۲۔ الموشح ، ص ۲۲۱

۳۔ کتاب الصناعتین ، ص ۱۰۱

۴۔ العمدۃ ج ۲ ، ص ۱۳۵

ابن سنان خفاجی نے بھی قدامہ کے اس نظریہ کی پر زور مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ قدامہ نے اس مسئلے میں تمام عرب و عجم کے مالوف طریقہ شاعری سے انحراف کیا ہے، مثلاً چہرے کا جمال و حسن ایک ایسی بین حقیقت ہے جس سے انکار کرنا روز روشن میں آفتاب کے وجود سے انکار کے مرادف ہے۔ جب عقل کی تعریف کی جاسکتی ہے جوکہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ خدا کی بخشی ہوئی ہے تو پھر آخر اسی خدا نے ان کے چہرے کو بھی تو بنایا ہے - پھر اس کی تعریف میں کیا عیب ہے ؟ جس طرح انسان کی صورت اس کی کاری گری نہیں بالکل اسی طرح اس کی عقل بھی اس کی کاری گری نہیں (۱) -

بہر حال یہ ایک بنیادی اختلاف عرب ناقدوں کے درمیان پایا جاتا ہے اور اس بارے میں ان کے دونوں گروہوں کے افکار کا ذکر آپ کے سامنے کیا جا چکا ہے -

اس مسئلہ کی دوسری شق یہ ہے کہ ھجو میں سلب فضائل نفسیہ ھی ھجو کو زوردار بناتا ہے۔ قدامہ کے نزدیک ھجو کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام چیزیں جو فضائل نفسیہ کی ضد ھیں استعمال کی جائیں، انسانی فضائل کی نفی حقیقی ھجو ہے - ھجو میں قدامہ عیوب جسم مثلاً ایک آنکھ ، لنگڑا پن اور بہرا پن وغیرہ کے ذکر کو ھجو میں نہیں شمار کرتے - اسی طرح ان کے نزدیک آبائی اور نسبی عیوب بھی ھجو کے دائرے سے خارج ھیں - (۲)

ابن رشیق لکھتے ھیں کہ اگرچہ بہترین ھجو وھی ہے جو فضائل نفسیہ کی نفی پر مبنی ھو مگر شاعر کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ وہ عیوب جسمانی و نسبی کے ذریعہ ھجو کرے - (۳) انھوں نے ایک شعر کو عربوں کی ھجو میں بہترین قرار دیا ہے کیونکہ اس میں فضائل نفسیہ کی نفی ہے۔ اس شعر کا ترجمہ یہ ہے :

" ایسے لوگ ھیں کہ جب ان کے یہاں مہمان آتا دکھائی دیتا ہے
تو اپنی ماں سے کہتے ھیں کہ آگ پر پیشاب کردو "

۱- سر الفصاحتہ ، ص ۲۵۰

۲- نقد الشعر ، ص ۳۰

۳- العمدۃ ، ج ۲ ، ص ۱۷۳

اس شعر میں صفات انسانی کی ہجو پائی جاتی ہے -

۱- مہمان آتے ہی آگ اس لئے بجھا دیتے ہیں تا کہ وہ گھر تک پہنچ نہ سکے اور لوٹ جائے ، اس لیے کہ بخیل ہیں -

۲- ان کے یہاں کوئی ملازم بھی نہیں ورنہ آگ بجھانے کا کام ماں سے نہ لیتے -

۳- وہ بدتمیز بھی ہیں اس لیے کہ بجائے گھر کے کسی کم عمر سے کام لینے کے ماں سے کام لیتے ہیں -

۴- لکڑیاں بھی ان کے یہاں بہت تھوڑی ہوتی ہیں ورنہ پیشاب سے زیادہ آگ بجھ نہیں سکتی -

۵- پانی کی بھی ان کے یہاں قلت ہے ورنہ جہاں کھانا پکتا ہو وہاں پانی سے آگ بجھانی چاہئے -

بہر حال ناقدین عرب کا ایک طبقہ اس نظریے کا مخالف ہے اور وہ ہجو میں فضائل نفسیہ کا قائل نہیں - ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہجو میں عیوب جسمانی و نسبی کا استعمال بالکل مناسب ہے ، چنانچہ آمدی کے علاوہ ابن سنان خفاجی بھی اسی تخیل کے حامل ہیں - (۱)

قصیدے کی وحدت پر تو اتفاق ہے مگر انفرادیت شعر پر عرب ناقدین کی آراء باہم مختلف ہیں - ابو ہلال عسکری کی نظر میں کلام کی ساری رونق اس کے مختلف اجزا کے باہمی ارتباط سے مستعار ہے ، اگر ان میں تناسب و ہم آہنگی باقی نہ رہے تو پھر کلام میں حسن اور کشش بھی باقی نہ رہے گی - (۲)

ابن سنان خفاجی لکھتے ہیں کہ قصیدے کے لئے یہ امر بہت ضروری ہے کہ اس کے سارے اجزا ایک دوسرے سے مربوط ہوں اور اول و آخر میں ایک اتحاد کی کیفیت ہو - (۳)

باقلانی کہتے ہیں کہ شعر کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ وہ موزوں ہو

---

(۱) سرالفصاحۃ مؤلفہ ابن سنان خفاجی ، ص ۶۵۰

(۲) سرالصناعتین ، ص ۴۲

(۳) سرالفصاحہ ، ص ۲۵۳

اور اس کے سارے اجزا برابر و یکساں ہوں - (۱)

ابن رشیق نے غالباً اس موضوع پر سب سے قابل قدر رائے دی ہے وہ کہتے ہیں کہ قصیدے کی مثال ایک انسان کے جسم کی ہے، جس طرح انسان کے جسم میں باہم اس کے اجزا باہم مربوط ہوتے ہیں، جس طرح جسم کا حسن ایک عضو کی خرابی سے ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح قصیدے میں عدم ارتباط اس کی رونق کو ختم کر دیتا ہے - اکثر اہل نظر اس حقیقت سے آشنا ہیں اور قصائد میں مناسبت اجزا کا لحاظ رکھتے ہیں - (۲)

اسی مسئلے سے قریب ایک دوسرا مسئلہ ہے وحدت شعر کا - قصیدے میں یا کسی نظم میں ایسے اشعار جن کے معنی ایک شعر میں پورے نہ ہوں بلکہ دوسرے شعر سے مل کر پورے ہوتے ہوں، ان کو ابوالعباس ثعلب مذموم قرار دیتے ہیں (۳) - قدامہ بھی اس قسم کے اشعار کو ناقص کہتے ہیں -

مرزبانی لکھتے ہیں کہ وہ شاعر زیادہ صاحب فن ہے جو ایک شعر میں بہت سے معنی پرو دے، بہ نسبت اس شاعر کے جو معانی کو کئی اشعار میں ادا کرے - (۴)

ابن رشیق کی رائے بھی یہی ہے کہ جو شعر اپنے معنی میں آزاد و مستقل ہو، اس سے بہتر ہے جو اپنی تکمیل کے لیے دوسرے شعر کا محتاج ہو - (۵)

لیکن ان ناقدوں کے برعکس جراح کا خیال ہے کہ منفرد شعر شاعر کے لیے عیب ہے اگر شعر کہے تو اس پر لازم ہے کہ اس کا بھائی بھی کہے - (۶)

ابن اثیر کہتے ہیں کہ عرب کبھی دو اشعار اور کبھی اس سے بھی زیادہ میں ایک معنی کو ادا کرتے ہیں- اور ایسا کرنا عیب نہیں - خود قرآن مجید میں ایک

۱- اعجاز القرآن، ص ۸۴

۲- کتاب العمدہ، ج ۲، ص ۱۱۷

۳- قواعد الشعر، ص ۸۹

۴- الموشح، ص ۴۱

۵- العمدہ، ج ۱، ص ۲۶۱

۶- کتاب الورقہ، ص ۱۳

بات کئی جملوں میں جا کر پوری ہوتی ہے۔ امرؤالقیس کے یہاں بھی اس کی مثال موجود ہے - (۱)

عربی تنقید میں ادبی سرقہ کا مسئلہ ہمیشہ زیر بحث رہا ہے ، اس سلسلے میں ناقدین کی طویل و عریض بحثوں سے قطع نظر اتنا لکھنا کافی ہے کہ وہ ابتدا میں تو ہر متحدالمضامین شاعر کو سارق قرار دے دیتے تھے مگر بعد میں مشترک مضامین میں سرقہ کا سوال نہ رہا۔ اس لئے کہ عربوں کے پاس الفاظ زیادہ اور معانی کم ہیں ، مثلاً اگر کوئی شاعر چہرہ کو چاند سے تشبیہ دیتا ہے تو اس میں سرقہ کا سوال نہیں بلکہ یہ مشترک مضمون و تخیل ہے - اس سلسلے میں '' حسن اخذ '' کی اصطلاح رائج ہوئی - قاضی جرجانی لکھتے ہیں کہ اہل شعر و ادب ہمیشہ سے دوسروں کی فکر سے اپنے ذہن کا دیا روشن کرتے آئے ہیں ، ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شاعر دوسرے شاعر سے تخیل لے کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ پہلے سے بھی عظمت میں بڑھ جاتا ہے اور اسی کا نام حسن اخذ ہے - (۲)

عربی تنقید کے بنیادی مسائل میں یہ مسئلہ ہمیشہ سے زیر بحث رہا ہے کہ کسی شعر یا کلام میں حسن کا مرجع الفاظ ہیں یا معانی ؟ یہ سوال در اصل تیسری صدی ہجری میں جاحظ نے اٹھایا تھا اور اس نے کہا تھا کہ معانی تو شہری ، دیہاتی ، جاہل اور عالم سبھی جانتے ہیں ، اصل حسن الفاظ کے انتخاب ، ان کی ترتیب اور اس قالب میں پوشیدہ ہے جس میں معانی پیش کئے جاتے ہیں - (۳)

بعد میں ابو ہلال عسکری نے اس نظریے کی پر زور تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ معانی کو سمجھا دینے کی صلاحیت تو ردی الفاظ میں بھی ہوتی ہے۔ اسلئے الفاظ کا قالب ، ان کا انتخاب ان کی ترتیب اور ان کا تناسب کسی کلام میں حسن اور کشش کا باعث ہوتا ہے ، اس لئے اکثر اوصاف کلام کا تعلق الفاظ سے ہے نہ کہ معانی سے -

---

(۱) المثل السائر ، ص ۲۹۴

(۲) الوساطہ ، ج ۱ ، ص ۱۵۷

(۳) کتاب الحیوان ، ج ۳ ، ص ۱۳۱

اس نظریے کے خلاف پانچویں صدی ہجری میں عبدالقاہر جرجانی نے آواز اٹھائی اور بتایا کہ یہ تصور غلط ہے کہ معانی ہر شخص کو معلوم ہوتے ہیں - معانی کی جدت کلام میں مرجع حسن ہے، ایک عبارت دوسری عبارت سے اس لیے پرکشش ہوتی ہے کہ اس کے معنی زیادہ جان‌دار ہوتے ہیں(۱)- وہ مزید لکھتے ہیں کہ اگر کوئی رموز کلام سے آشنا کسی ادبی تخلیق کی تعریف کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ الفاظ کتنے شیریں ہیں، کتنی پر کشش عبارت ہے- اس تعریف میں وہ دراصل حروف و الفاظ اور ترنم کی تعریف نہیں کرتا بلکہ اس کا مقصد اس عبارت کے حسن و خوبی کی ایک کیفیت کا اظہار ہے، جو وہ اپنے اندر محسوس کرتا ہے - اس کا دل اور اس کی عقل دونوں اس حسن باطن سے محظوظ ہوتے ہیں جو اس ادبی تخلیق میں ماورائے الفاظ پوشیدہ ہوتا ہے-

ابن رشیق اس بحث میں اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لفظ جسم ہے اور اس کی روح معنی ہے، لفظ کا تعلق معنی سے وہی ہے جو روح کا تعلق جسم سے ہے- انسانی جسموں کو لنگڑے پن ، بہرے پن اور دوسرے عیوب لاحق ہوجاتے ہیں مگر روح باقی رہ جاتی ہے - اسی طرح الفاظ کے سقم کا حال ہے - معانی کی کمزوریاں بھی انسان کی روحانی بیماریوں کے مترادف ہیں لیکن اگر معنی بالکل فاسد ہوں تو پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے مردہ جس کے پاس سب کچھ ہے مگر بے فائدہ - (۲)

عرب ناقدوں اور ادیبوں کے اس تخیل نے کہ الفاظ اصل ہیں اور معانی تو سب ہی جانتے ہیں، ادب کو بڑا نقصان پہنچایا - چنانچہ پورے علم بدیع کی کوشش لفظی صنعت گری کے سوا کچھ نہ تھیں - بدیع کی اقسام کو حسن کا ذریعہ سمجھ کر عربوں نے عمداً استعمال کرنا شروع کر دیں(۳)- حتی کہ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں یہ حال ہو گیا کہ صفحات کے صفحات پڑھ جائیے الفاظ کی بھرمار ، صنائع بدائع کی بوچھار اور مقفیٰ و مسجع عبارت کے انبار تو نظر آئیں گے مگر ان کے اندر معانی کچھ نہیں - حالانکہ ابن معتز نے جب کتاب البدیع لکھی

۱- دلائل الاعجاز ، مؤلفہ عبدالقاہر جرجانی ، ج ۲ ، ص ۲۶

۲- کتاب العمدہ ، ج ۱ ، ص ۱۲۴

۳- سرالصناعتین ، ص ۳۵

تو اس میں یہ حقیقت بیان کردی تھی کہ بغیر علم بدیع کی صنعتوں کے بھی کلام پرکشش ہوسکتا ہے - (۱)

شعر کی اچھائی اور برائی کے بارے میں عربوں کے افکار اور ان کی تنقیدی آرا بڑی دلچسپ ہیں - تمام ناقدوں کا یہ عام رجحان ہے کہ اگر اشعار میں کوئی ندرت ، حسن خیال ، لطیف مضمون اور کشش نہ ہو تو پھر شعر گفتن چہ ضرور ؟ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ شعر نہ کہنا غیر معیاری شاعری سے بہت بہتر ہے (۲)- ابوزید نحوی کے سامنے ایک صاحب نے اپنے اشعار پڑھے تو اس نے ان کو سن کر کہا کہ اگر آپ اسی طرز کے شعر کہتے ہیں تو میرا مشورہ یہ ہے کہ اب مزید نہ کہیں - (۳)

ابن مقنع نے اپنی کتاب ,, الدرة الیتیمة ،، میں لکھا ہے کہ ثقیل کلام مردم آزاری کا باعث بنتا ہے اور اس سے انسانوں کے دلوں کو تکلیف پہنچتی ہے - (۴)

اسحاق موصلی نے ابوعبیدہ کے سامنے کسی قدیم شاعر کے چند اشعار پڑھے ابو عبیدہ نے دریافت کیا کہ ان اشعار میں کوئی ندرت یا حسن معنی ہے ؟ موصلی بولے نہیں - اس پر ابوعبیدہ نے کہا کس نے تم کو لدو جانور بنا دیا ہے (۵) - یعنی جو بیکار چیز ہے اس کو حفظ کرنے اور ذہن پر لادنے سے کیا حاصل !

عروہ بن زبیر کے صاحبزادے نے ان کو اشعار سنائے- اشعار سننے کے بعد انہوں نے کہا کہ جاهلیت میں جو جانور ایک ٹانگ سے لنگڑا ہوجاتا تھا اس کو ,, ہزروف ،، کہتے تھے ، اسی طرح تمہارے یہ اشعار بھی تین ٹانگ کے ہیں - (۶)

۱- کتاب البدیع ، ص ۱

۲- محاضرات الادباء و محاورات الشعرا و البلغاء ، ص ۳۹

۳- الموشح ، ص ۳۷۵

۴- الدرة التسمیه ، ص ۶۳

۵- الموشح ، ص ۳۵۹

۶- الموشح ، ص ۳۶۰

عربوں کے یہاں یہ تصور تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے جو شاعری میں اس کی رہنمائی کرتا ہے ۔ ابن مناظر کے سامنے ایک شاعر نے ایک قصیدہ پڑھا تو استغفر اللہ استغفر اللہ کہنے لگے اور پھر بولے کہ ان اشعار کو اپنے شیطان کو واپس کردو بلا وجہ احسان مند بننے سے کیا فائدہ ۔ (۱)

اس سلسلے میں ابو حیان توحیدی نے بڑی پتے کی بات کہی ہے، اس نے لکھا ہے کہ دراصل کلمات اور حروف طبیعت انسانی کے لئے محرک بنتے ہیں ۔ جب یہ نقش و نگار پوری شکل میں ظاہر ہوتے ہیں تو ان میں کشش اور رونق محسوس ہوتی ہے اور اس بنا پر ایک کلام دوسرے سے بہتر ہوتا ہے ۔ قوی کلام دل میں گھر کر لیتا ہے مگر ردی کلام کسی طرح بھی دل کے دروازوں سے پار نہیں اتر پاتا ۔(۲)

فکر و فن کے جو وقیع افکار عرب ناقدوں نے ایک ہزار سال سے بھی قبل پیش کئے تھے اُس وقت ایشیائی زبانوں میں ادبی تنقید کا وجود بھی نہ تھا ۔ وہ عربوں کی ذہنی برتری اور جولانی کا بہترین ثبوت پیش کرتے ہیں ۔

۱- المؤشح ، ص ۳٦۳ - ۳٦۴

۲- کتاب المقابسات ، ص ۳۱ ، ۵۷

نئی کتابیں

ظفر علی خان

مصنف : ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

صفحات : ۳۵۶

قیمت : سات روپے پچاس پیسے

ناشر : مکتبۂ خیابان ادب ، چیمبر لین روڈ ، لاهور -

تبصرہ نگار : میرزا ادیب

اب تک ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے قلم سے چار کتابیں نکل چکی هیں - شاہ حاتم اور ان کا کلام ، مضامین سر سید ، نذر رحمٰن اور خیالات آزاد - زیر نظر کتاب ان کی پانچویں تصنیف ہے - اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے مولانا ظفر علی خان کی شخصی زندگی کے متنوع پہلوؤں کے علاوہ ان کی ذهنی نگارشات کا بھی تفصیلی اور بڑا بصیرت افروز مطالعہ کیا ہے -

مولانا ظفر علی اپنی مختلف اور بہت حد تک متضاد حیثیتوں کے ساتھ منظر عام پر آئے تھے - ان کی نمایاں ترین حیثیت تو ایک صاحب طرز صحافی کی تھی - صحافت کے میدان میں انھوں نے جو کارھائے نمایاں انجام دیے وہ اس امر کے متقاضی هیں کہ انھیں بابائے صحافت کہنے میں قطعاً کوئی جھجک محسوس نہ کی جائے اور واقعہ یہ ہے کہ انھیں بابائے صحافت سمجھا بھی جاتا ہے - وہ ایک شعلہ بیان مقرر بھی تھے - مختلف ہنگامہ پرور سیاسی تحریکوں کے بانی بھی تھے - علاوہ ان خصوصیتوں کے وہ ایک ماہر فن مترجم، انشاپرداز اور شاعر بھی تھے -

مولانا ظفر علی خان اس قافلے کے ایک راهی تھے جس نے انیسویں صدی کے ربع آخر کے ایوان سے نکل کر اپنے آتشین اور حریت پرور افکار سے برصغیر

کی فضاؤں کو ہنگامہ زار انقلاب میں منتقل کردیا تھا۔ اس قافلے کے دوسرے راہی مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی جیسے دیو قامت لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ یہ شخصیتیں اور ان کے علاوہ اور بھی کئی افراد — ایک ایسے سیلاب کی تند و تیز اور طوفانی لہریں بن گئے تھے جنھوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کردیا تھا۔ عجب بات یہ ہے کہ یہ لوگ بالعموم صحافی تھے اور ان کی تگ و دو صرف کاغذ اور قلم کی دنیا تک محدود نہیں تھی۔ بلکہ یہ سب کے سب صاحب کردار اور صاحب عمل بھی تھے۔ ان میں تخلیقی اہلیتیں بھی تھیں اور قائدانہ صلاحیتیں بھی۔ گویا وہ لوگ فقط گفتار کے غازی نہیں تھے، کردار کے غازی بھی تھے۔

مولانا ظفر علی خاں کی پوری زندگی عبارت ہے مختلف ہنگاموں سے۔ کہا جاتا ہے وہ بڑے تیز رفتار آدمی تھے۔ جو شخص بھی ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتا تھا وہ ان کی تیز رفتاری کی تاب نہ لاکر ترک سفر پر مجبور ہوجاتا تھا۔ یہی حالت ان کے عملی کاموں کی بھی تھی۔ وہ ہر میدان میں تیز چلنے کے عادی تھے اور ان کی یہ روش آخر تک قائم رہی ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے تخلیقی اور عملی شعبوں میں اسی مرد مجاہد کی تیز رفتاریوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس کوشش میں سیرت نگاری کے اکثر و بیشتر پہلوؤں اور تقاضوں کو اپنے سامنے رکھا ہے۔

اس کتاب کا سب سے اہم باب وہ ہے جس میں فاضل مصنف نے ظفر علی خاں کے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کا ان کی تمام تفصیلات کے ساتھ تجزیہ کیا ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کردیا ہے۔ اس باب کے مطالعے کے بعد انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس تصویر میں جب صاحب سیرت کے نقوش واضح ہوتے ہیں تو وہ اپنے ماحول کا ایک حصہ بھی معلوم ہوتے ہیں اور اپنے ماحول کی رونق بھی۔

کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب کا ذکر ہوچکا ہے۔ دوسرا باب حالات و کوائف پر مشتمل ہے۔ تیسرے باب میں ظفر علی خاں کے ادبی سرمائے پر نظر ڈالی گئی ہے، چوتھا ظفر علی خاں کی شاعری کے

متعلق ہے اور پانچویں باب میں ان کی نثر نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخر میں اشاریہ بھی ہے۔

یہ کتاب ظفر علی خان کو اور ان کے عہد کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔

شاہ عبد اللطیف بھٹائی

مصنف : اختر انصاری اکبر آبادی

صفحات : ۲۷۵

قیمت : پانچ روپے

ناشر : شاہ عبداللطیف ثقافتی مرکز کمیٹی ، بھٹ شاہ۔

تبصرہ نگار : میرزا ادیب

علاقائی ادب کی بڑی اہمیت ہے اور اس وجہ سے اہمیت ہے کہ ایک ملک کے علاقائی ادب پارے ان لوگوں کی ثقافتی نمائندگی کرتے ہیں جن سے ایک قوم عبارت ہوتی ہے - ان لوگوں کے رہن سہن کے ڈھنگ ، اٹھنے بیٹھنے کے طریقے ، زندگی کے بارے میں ان کے تصورات ، گوناگوں رسوم اور رواج — ان چیزوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس ادب کو سمجھا جائے جو یہ لوگ تخلیق کرتے ہیں ۔ اس اصول کے زیر اثر وادیٔ سندھ کے عظیم المرتبت شاعر اور صوفی حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی یاد میں ان کی آخری آرام گاہ ''بھٹ شاہ'' میں ایک ثقافتی مرکز قائم ہے جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ان ثقافتی سرگرمیوں کے سلسلے میں مؤثر پروگرام مرتب کئے جائیں جن کا تعلق شاہ صاحب کے کلام کی نشر و اشاعت سے ہے - چنانچہ اس کتاب کی تصنیف اسی پروگرام کا ایک حصہ ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ صاحب کے حالات زندگی اور ان کے کلام کا کچھ حصہ رسایل و جراید کے ذریعے اردو میں منتقل ہو چکا ہے مگر جہاں تک ایک مکمل کتاب کا تعلق ہے اختر انصاری اکبر آبادی کی یہ تصنیف اولیت کا درجہ لیے ہوئے ہے ۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی ایک بہت بڑے صوفی تھے - ان کی ساری زندگی لوگوں کو نیکی کی راہ دکھانے میں صرف ہوئی تھی - ان کی مجاهدانہ زندگی نام تھا مسلسل عمل کا ، وہ جب تک زندہ رہے اپنے اس مقدس فرض سے الگ نہیں رہے - لیکن وہ صرف روحانی پیشوا ہی نہیں تھے ، ایک بڑے شاعر اور ایک بڑے ماہر موسیقی بھی تھے - ان کے روحانی فیوض کا عالم یہ ہے کہ آج بھی جبکہ وہ مادی طور پر اس دنیا میں موجود نہیں ہیں ہزاروں لاکھوں لوگ ان سے کسب نور کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے - یہ ان کی زندگی کا فقط ایک پہلو ہے - دوسرا پہلو ان کی نہایت اثر انگیز ، درد انگیز اور وجد آور شاعری ہے اور یہ شاعری انہوں نے ایسے موسیقانہ اوصاف کے ساتھ تخلیق کی ہے کہ اس سے نہ صرف سندھی زبان اور ادب کو وسعت ملی ہے بلکہ سندھی موسیقی میں بھی ایک مستقل اضافہ ہوگیا ہے - ان کی ان خوبیوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت تمام صوفی شعرا میں منفرد ہے -

ان کی شاعری حقیقتاً عوامی شاعری ہے - یہ شاعری عوام کی زبان میں ہے ، عوام کے لیے ہے اور براہ راست عوام کے دلوں کو اپیل کرتی ہے - شاہ عبداللطیف بھٹائی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ان کہانیوں کے پیرائے میں درس زندگی دیا ہے جو مدت مدید سے عوام میں پھیلی ہوئی ہیں اور شہروں اور دیہات کے رہنے والے ان سے بخوبی واقف ہیں -

اٹلی کے عظیم شاعر اور ''طربیہ ' خداوندی'' کے زندہ جاوید مصنف دانتے کی طرح انہوں نے بھی اپنی زبان میں اپنی تخلیق پیش کی ہے اور اس طرح سندھی زبان کو اپنی اختراعات بدیع کے ذریعے کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے -

شاہ صاحب کے کلام و پیام کے سلسلے میں یہ کتاب ہماری ایک خاص ثقافتی ضرورت کو پورا کر رہی ہے اور اس کے لیے اختر انصاری اکبر آبادی کی کوشش قابل قدر بھی ہے اور قابل تقلید بھی -

یہ کتاب ۱۶ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب بہت اہم ہے - مصنف نے شاہ صاحب کے حالات زندگی کی فراہمی میں کافی کد و کاوش سے کام لیا ہے اور ان کے کلام و پیام کے باب میں اس طرح تفصیل آرائی کی ہے کہ ان کی تخلیقی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا - اختر صاحب کی شگفتہ نثر کی وجہ سے کتاب بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہے -

تنقیداور تجزیہ

مصنف : جمیل جالبی
صفحات : ۳۰۶
قیمت : آٹھ روپے پچاس پیسے
ناشر : مشتاق بک ڈپو ، شیلڈن روڈ ، کراچی (۱) -
تبصرہ نگار : ڈاکٹر اسلم فرخی

قیام پاکستان کے بعد تنقید کے افق پر جو نئے نقاد اُبھرے ہیں ان میں جمیل جالبی کا نام بہت اہم ہے بلکہ بعض اعتبار سے تو میں یہ کہنے کے لیے بھی تیار ہوں کہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جمیل جالبی منشی سجاد حسین کے ناول ''حاجی بغلول'' کی ترتیب سے قطع نظر (حالانکہ یہ بھی ان کا اہم کارنامہ ہے) ' ایلیٹ کے مضامین ، اور ' پاکستانی کلچر ' جیسی فکر انگیز کتابیں پیش کر چکے ہیں۔ انھوں نے قومی کلچر کے اہم مسئلے پر جس انداز سے اظہار خیال کیا ہے وہ فکر انگیز ہی نہیں ژرف نگاہی، دروں بینی اور مسائل کو ان کے صحیح تناسب میں دیکھنے اور خلوص، دردمندی اور واضح قومی شعور کی روشنی میں حل کرنے کا اہل بھی ہے۔ جمیل جالبی کا دوسرا اہم ادبی اور تنقیدی کارنامہ ٹی ایس ایلیٹ کے تنقیدی افکار کو اردو میں پیش کرنا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایلیٹ کے تنقیدی افکار کو مربوط انداز سے اردو میں پیش کرنے کا سہرا جمیل جالبی ہی کے سر ہے۔ جمیل جالبی ایلیٹ کے قائل ہیں ، اس کی عظمت سے متاثر ہیں اور ان کے تنقیدی افکار و خیالات میں ایلیٹ کے اثرات بہت نمایاں ہیں لیکن وہ ایلیٹ کے مقلد نہیں بلکہ انھوں نے اپنا راستہ خود متعین کیا ہے۔ 'تنقید اور تجربہ' کے مضامین پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جمیل جالبی نے مشرق و مغرب دونوں سے یکساں طور پر استفادہ کیا ہے اور دونوں سے یکساں طور پر متاثر ہیں۔ میر، خواجہ میر درد ، غالب ، شیفتہ ، نذیر احمد ، فراق ، مجاز اور میراجی کے ساتھ ساتھ وہ ایلیٹ ، سارتر اور پیسٹرنک کے فن پر بھی نظر رکھتے ہیں اور سارتر کے تعارف اور اس کے فلسفۂ وجودیت پر مضمون لکھتے ہوئے وہ اپنے ادیبوں اور شاعروں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ انھوں نے جس طرح ایلیٹ اور سارتر کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے اسی طرح میراجی کو بھی سمجھا اور سمجھایا ہے۔ جمیل جالبی اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

'تنقید اور تجربہ' کے مضامین میں نظریاتی تنقید اور عملی تنقید دونوں کے نمونے ملتے ہیں - دونوں میں جو انداز کارفرما ہے اس کی توضیح جمیل جالبی کے الفاظ میں یوں ہوسکتی ہے - " تنقید کے لئے جیسا کہ ایلیٹ نے کہا ہے، باخبری بنیادی چیز ہے - یہاں شعور کی سطح واضح ہوتی ہے، فکر اور اس کے وہ بنیادی مسائل اہمیت رکھتے ہیں جن پر ادب کی بنیاد قائم ہے اور جن سے معاشرے کی تہذیبی روح قوت حاصل کرتی ہے- فکری تنقید کے بغیر آج کا ادب ایک قدم بھی نہیں چل سکتا "- جمیل جالبی کے تمام مضامین کی بنیاد باخبری پر ہے، ان میں نقاد کے شعور کی سطح بہت واضح ہے اور اس نے فکر کے ان بنیادی مسائل کو اہمیت دی ہے جن پر ادب کی بنیاد قائم ہے - کسی نقاد کو باخبر کہنا بظاہر رسمی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن تنقیدی انتشار کے اس دور میں باخبری ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے - جمیل جالبی باخبر نقاد ہیں ، وہ اہم اور بنیادی مسائل پر خیال انگیز گفتگو کرتے ہیں - ان کی رائے بڑی سنجیدہ اور متوازن ہے اور پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جمیل جالبی کا انداز بیان تنقید کی روایتی خشکی یا شاعرانہ شکوہ سے بالکل عاری ہے - تنقید میں ان کا لہجہ وہی ہے جو کسی پری وش کے ذکر میں غالب کا تھا - متین لیکن متانت میں شوخی کی آمیزش، سنجیدہ مگر سنجیدگی میں زندگی کا حوصلہ اور حسن - باتیں کرنے کا وہ بے تکلف انداز جو خطوط غالب کی خصوصیت ہے ! جمیل جالبی کے مضامین کو ان کے اسلوب اور لہجے نے زیادہ جاندار، توانا اور شگفتہ بنا دیا ہے- اسلوب کی یہ ندرت اور لہجے کی یہ بے تکلفی کم نقادوں کے حصے میں آئی ہے-

' تنقید اور تجربہ ' کے دیباچے میں بھی جمیل جالبی نے بڑی خیال انگیز باتیں کہی ہیں اور اپنے تنقیدی نقطہ' نظر کی وضاحت کی ہے لیکن تنقید کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے ایک بات بڑی عجیب لکھی ہے ، وہ لکھتے ہیں: " میرے لیے تنقید (اور یہی میرا میڈیم ہے) کوئی ایسی چیز نہیں جس سے ادیبوں اور شاعروں کی توصیف و تعریف کا کام لیا جائے - یہ تنقید کا ایک کام ضرور ہے لیکن سارا کام ہرگز نہیں ہے" یہاں تک تو ان کے خیال سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں لیکن آگے چل کر وہ لکھتے ہیں : " بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا فنکار نقاد بن جاتا ہے- پیشہ ور نقادوں پر جو اتفاق سے ادبیات کے استاد بھی ہوتے ہیں یہ پھبتی اس لیے بھی ضرور کسی

جانی چاہیے کہ وہ جو کچھ کلاس روم میں پڑھاتے ہیں وہی اپنے مضامین میں لکھ دیتے ہیں۔ "میں تنقید کی اس قسم کو ' نصابی تنقید ' کا نام دیتا ہوں "۔ اس رائے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ نقاد جو اتفاق سے ادبیات کے استاد نہیں ہیں اپنی تنقید میں وہ سب کچھ لکھ دیتے ہیں جس پر کلاس روم میں کوئی گفتگو نہیں ہوسکتی۔ حالانکہ بات یہ نہیں ہے۔ نہ ادبیات کے استاد کو پیشہ ور نقاد قرار دینا صحیح ہے اور نہ ادبیات کے تمام اساتذہ کی تنقید کو نصابی تنقید کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مجنوں، فراق، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی سے گزر کر یہ بات تو حالی تک پہنچتی ہے۔ اصل چیز تو علمی سہل انگاری اور بے حسی ہے جو " ریڈی میڈ " (Ready made) قسم کی نصابی تنقید کی ضرورت پیدا کرتی ہے۔

' تنقید اور تجربہ ' کو مشتاق بک ڈپو نے اپنے روایتی حسن کے ساتھ شائع کیا ہے۔ حسن ظاہر اور فکر معنوی سے معمور یہ مجموعہ ادب سے دل چسپی رکھنے والے تمام افراد کے لیے ایک تحفہ ہے جو اردو تنقید کے نئے اور خوش آہند انداز کا پیامبر ہے۔

روح المطالب فی شرح کلام غالب

مصنف : سید اولاد حسین شاداں بلگرامی

صفحات : ۶۱۹

قیمت : سفید کاغذ -/۱۸ نیوز -/۱۲

ناشر : شیخ مبارک علی ناشر و تاجر کتب ، اندرون لوہاری دروازہ لاہور

تبصرہ نگار : سید قدرت نقوی

غالب کے کلام میں تہ دار معنی کی بہتات ہے۔ غالب کے احباب اور شاگردوں نے بعض اشعار کی شرح خود غالب سے بھی معلوم کی ہے جو ان کے خطوط میں محفوظ ہے۔ مولانا حالی نے یادگار غالب میں بہت سے اشعار کی شرح و مطلب بیان کر کے ایک نئے راستہ کی نشاندھی کی ، اس کے بعد غالب کے کلام کی مختلف شرحیں مختلف حضرات نے لکھیں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں سب سے پہلی شرح مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی نے لکھی تھی؛ جو اب

کمیاب کیا ناپید ہے۔ آجکل بہت سی شرحیں ملتی ہیں جن میں نظم طباطبائی، حسرت موہانی اور آسی کی شرح کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ جوش ملسیانی، سعیدالدین احمد، آغا باقر نبیرہ آزاد کی شرحیں بھی مروج ہیں، بیخود دہلوی، بیخود موہانی، سہا بلند شہری وغیرہ نے بھی شرحیں لکھی ہیں۔ اثر لکھنوی اور نیاز فتحپوری نے منتخب اشعار کی شرح لکھ کر چھپوائی ہے۔ جزواً بہت سے حضرات نے کلام غالب کے مطالب بیان کئے ہیں، اب تک اس پہلو پر بہت حضرات توجہ فرماتے رہے اور کچھ نہ کچھ اضافہ فرماتے رہے ہیں۔ شاداں بلگرامی کی شرح دسمبر ۱۹۶۷ء میں طبع ہوئی اس لیے یہ سب سے مؤخر اور نئی کتاب ہے۔ *

کسی شاعر کی شرح بیان کرنے کے لیے جو اصول و ضوابط ضروری ہیں اگر شارح ان کا پابند نہیں تو وہ اپنے فریضے سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ ان اصول و ضوابط کے علاوہ شارح کی ذات میں چند صفات کا ہونا بھی ضروری ہے، ورنہ وہ صحیح منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اور یہ اس لیے ضروری ہے کہ بعض اوقات شاعر کی تخلیق کے دو رخ ہو جاتے ہیں۔ ایک وہ جو شاعر کے پیش نظر تھا اور ایک وہ جو شاعر کی تخلیق سے پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی شاعر نے جس انداز میں اسے پیش کیا، اس انداز نے اپنی ایک الگ فضا پیدا کرلی۔ اس طرح شعر دوہری معنویت یا اس سے بھی زیادہ کا حامل ہو گیا۔ دراصل تخلیقی ماحول یعنی شاعر کے پیش نظر امور اور فضائے تخلیق یعنی شعر سے پیدا شدہ صورت میں اختلاف کی وجہ، شاعر اور قاری کے علم، مشاہدے، تجربے وغیرہ میں عدم مطابقت ہوتی ہے۔ غالب کے کلام کی مختلف شرح کی وجہ حقیقی یہی ہے اور شارحین کے باہمی اختلاف رائے کی وجہ بھی یہی ہے۔ دراصل یہی اختلاف رائے غالب کی عظمت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

مولانا اولاد حسین شاداں بلگرامی مرحوم، علمی و ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ مرحوم نے بہت سی درسی کتابوں کے ترجمے کئے ہیں جن سے طلبہ کی کافی رہنمائی ہوتی رہی ہے۔ آپ کا حلقہ تلامذہ نہایت وسیع اور وقیع ہے۔ بعض مشاہیر آپ کے سر چشمہ علم سے فیضیاب ہیں۔ زیر نظر کتاب اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس کی ابتدا میں مرحوم نے اپنے حالات خود قلمبند کئے ہیں اور اسی میں اپنے شاگردوں کا ذکر بھی کردیا ہے۔

---

* شاداں بلگرامی نے یہ شرح ۱۹۲۶ء میں لکھی تھی لیکن اشاعت اب عمل میں آئی ہے۔

مولانا کی شرح کا حصہ کافی غور و فکر چاہتا ہے۔ اس حصے کے متعلق بہت سی باتیں کی جاسکتی ہیں۔ لیکن گفتگو کا مرکز و محور پھر وہی بنتا ہے کہ شارح نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اپنی رسائی کی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔ لیکن جب عمومی حیثیت یا آفاقی سطح پر اس کا جائزہ لیا جائے تو پھر شارح سے بہت کچھ اختلاف کی گنجائش نکل آتی ہے، اور یہ اختلاف جزوی و کلی طور پر کیا جاسکتا ہے۔ مولانا نے خود بھی دوسرے شارحین سے موقع بموقع اختلاف کیا ہے۔ مولانا کی شرح میں اختلاف کی بہت زیادہ گنجائش موجود ہے:

مولانا نے غالب کے اکثر اشعار میں اصلاح بھی فرمائی ہے۔ وہ اصلاحیں خود غور طلب ہیں، بعض جگہ تو وہ مضحکہ خیز چیز بن کر رہ گئی ہے۔ مثلاً غالب کے دیوان کے پہلے ہی مطلع کے مصرع اول " نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا " میں اصلاح فرمائی ہے:

" نقش فریادی ہے کس ہستیٔ غم تاثیر کا
نقش فریادی ہے کس کی دوریٔ دلگیر کا
نقش فریادی ہے کس کے ہجر دامنگیر کا "

غور فرمائیے کہ یہ تین مصرعے کس پائے کے ہیں؟ اور ان میں کیا کیا خوبیاں ہیں؟ اور کیا ان تینوں میں سے کوئی سا ایک " نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا " سے افضل یا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ اس کا فیصلہ خود صاحبان ذوق سلیم فرما سکتے ہیں۔ اصلاح کی تین شکلیں خود تذبذب کی شاہد عادل ہیں۔ ایک اور اصلاح دیکھئے:

حال دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا

مولانا اس شعر میں "یعنی" کے استعمال کو ایک خامی قرار دیتے ہیں اور مصرع ثانی میں ان کے نزدیک " پایا " کے بالمقابل " گم ہونا " آنا چاہیے تھا۔ ترمیم فرمائی ہے:

حال دل نہیں معلوم اتنا جانتے ہیں ہم
*ہم نے جابجا ڈھونڈھا تم نے ایک جا پایا

سوچئے کہ کتنی خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں؟ 'ہم' کی تکرار اور " ہیں

ہم " کا تنافر ، " جا بجا " کے بالمقابل " ایک جا " کیا یہ ساری جدتیں کسی خوبی یا اضافے کا سبب ہیں؟ یا صرف اصلاح دینے اور استادی ظاہر کرنے کا شوق؟ یہ عمل بکثرت پایا جاتا ہے کہیں مصرعے بدلے ہیں اور کہیں الفاظ۔ اگر اس طرح اشعار کا خون ہوجائے تو قاری جائے۔ انہوں نے تو اپنی دانست میں خوبی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک اور مثال دیکھئے:

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

آپ سوچیں گے اس میں کیا سقم ہے؟ مولانا اس میں لفظ " موج " کو بے جا قرار دیتے ہیں بلکہ بے مصرف بتا کر اس کو بدل دینے کا مشورہ اس طرح فرمایا ہے، " موج کی جگہ ' اب تو " پڑھ سکتے ہیں '۔ گویا اصلاح کے بعد شعر کی شکل یہ ہوگی :

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ اب تو بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

" اب " کی تکرار ہوجائے تو کیا مضائقہ ہے؟ " موج " نے جو معنویت اور وسعت پیدا کر رکھی ہے وہ باقی نہ رہے تو کیا نقصان ہوتا ہے؟ اصلاح کا لطف تو پیدا کر ہی دیا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ کتاب میں اشعار بھی درست نقل نہیں کئے گئے۔ بلکہ شرح لکھتے وقت بھی کسی مستند نسخے کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا
یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

دونوں شعروں میں " یک " کی جگہ " اک " لکھا گیا ہے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر　　بادہ نوشی ہے* باد پیمائی

اس شعر میں " باد پیمائی " کی جگہ " بادہ پیمائی " لکھ دیا ہے

اور مطلب بھی '' بادہ پیمائی '' کا بیان کیا گیا اور اس کے معنی فضول اور بیہودہ کام بتائے ہیں۔ مولانا کی علمی مرتبت و شہرت کا تقاضہ تھا کہ کسی مستند نسخے کی طرف رجوع فرماتے کیونکہ ان کے حلقہ اثر و رسوخ میں اس شرح کو یقیناً استناد کا درجہ دیا جائے گا اور مرحوم کی ہر تحریر کو حرف آخر مان لیا جائے گا اور یہ ایک بہت بڑی خرابی پیدا کرنے والی بات ہوگی۔

شرح اشعار کی خوبیوں کو آشکار کرنا ایک طویل عمل ہے۔ باذوق حضرات پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے۔ شرح میں تبسم زیر لب کے مواقع بہت ہیں۔ شرح نویسی کا انداز بہت قدیم ہے، اکثر مقامات پر گنجلک پن کا شدید احساس ہوتا ہے:

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں؟
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟

مولانا نے برفاب کو '' برف آب '' لکھا ہے ان کا بیان کردہ مطلب ملاحظہ کیجئے:

'' کھانے پینے اور سونے کا سامان کہاں سے لاؤں (خواب کے سامان کو روزہ سے کیا تعلق! اگر یہ کہیں کہ مطلقاً راحت کی چیزیں مقصود ہیں تو اون کو مصرع ثانی میں واضح کر دیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ پہلے مصرع میں '' خواب '' قافیہ کے لئے ہے) - آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں۔ روزہ (صوم) کو اذعان قلب اور اقرار لسان کے ساتھ عین ایمان سمجھتا ہوں۔ مگر خس خانہ اور برف پڑا پانی کہاں سے آئے۔ ''

اس شرح سے آپ کے پلے کیا پڑا؟ آپ جانیں۔ مولانا نے ایک شارح کا فریضہ اس طرح ادا کر دیا کہ اس رباعی کی شان نزول کا سراغ لگانا ان کے فرائض میں شامل نہ تھا۔ رمضان اگر موسم گرما میں ہو تو دوپہر کو سونے کے لیے سامان خواب جس کا اشارہ خس خانہ میں پایا جاتا ہے، ضروری نہیں۔ برفاب کا تعلق بھی گرمی ہی سے ہے۔ یادگار غالب میں اس کی

شان نزول بھی مل سکتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ قطعہ بھی تھا جو غالب نے پادشاہ کے سامنے سر دربار پڑھا تھا :

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

مولانا نے اس میں بھی ''ناچار'' کو ''لاچار'' بنا دیا ہے۔ رباعی کا مطلب صاف ہے کہ گرمی کا زمانہ ہے۔ روزہ رکھنا میرے ایمان میں داخل ہے لیکن میں کیا کروں کہ نہ کھانے کا سامان ہے اور نہ سونے اور آرام کرنے کے اسباب مہیا ہیں۔ دوپہر کو آرام کرنے کے لیے خس‌خانہ ہو، شام کو روزہ رکھنے کے لیے برف کا ٹھنڈا پانی ہو تو روزہ رکھنے کا لطف ہے۔ اس رباعی کو قطعے کی روشنی میں دیکھنا چاہئے تھا۔

کتاب کی نمایاں خصوصیت الفاظ کے معنی بیان کرنا قرار دی جاسکتی ہے کہ ہر لفظ کی لغوی حقیقت پر اچھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے۔ الفاظ کے مختلف معنی و مفہوم کو اچھی طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض الفاظ کے اصل و مروج تلفظ کی نشاندھی بھی ملتی ہے مگر مولانا لغوی تلفظ کو اہمیت دیتے ہیں اور عربی لغت کے تتبع کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اگر یہاں اردو زبان کے تصرفات پر نظر رکھتے تو بہتر تھا۔ اصول یہ ہے کہ دخیل الفاظ جب ہماری زبان میں رائج ہوئے اور ہم نے ان میں لغوی یا لہجائی تصرف کیا ہے تو تصرف کی شکل ہمارے لئے صحیح ہے۔ مثلاً ''معدن'' اور ''صاحب'' بفتح دال و ہائے حطی مروج ہیں اردو میں یہی صحیح ہے۔ عربی میں یہ بالکسرہ ہیں، اس سے ہمیں کوئی تعلق نہیں۔ بہرحال کتاب اپنی خوبیوں اور خامیوں کے باوجود غالبیات میں اضافے کا سبب ثابت ہوگی، اس کے مباحث سے اختلاف و اتفاق قارئین کا اپنا کام ہے۔ البتہ صاحبان ذوق اس سے کماحقہ لطف اندوز ہوں گے۔

نوجوان ورتھر کی داستان غم

مصنف : گوئٹے

مترجم : ڈاکٹر ریاض الحسن

صفحات : ۱۹۲

قیمت : پانچ روپے پچھتر پیسے

ناشر : ادبی سنڈیکیٹ ، ۶/۱۳ م الف ، ناظم آباد ، کراچی

تبصرہ نگار : مرزا ادیب

علامہ اقبال نے غالب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف جس خوبصورت اور مؤثر نظم میں کیا ہے ، اس کا آخری شعر ہے :

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

یہ گلشن ویمر میں ابدی نیند سونے والا غالب کا ہم نوا گوئٹے ہے ۔ گوئٹے کا پورا نام یوہان وولف گانگ گوئٹے ہے ۔ یہ وہی گوئٹے ہے جس کو پہلی مرتبہ نپولین نے دیکھ کر کہا تھا: ''بے اشک آپ ایک انسان ہیں'' اور جس کے دیوان مغربی کا جواب علامہ نے '' پیام مشرق '' کی صورت میں دیا ہے ۔

'' نوجوان ورتھر کی داستان غم '' گوئٹے کا وہ تخلیقی کارنامہ ہے جو کم و بیش دو سو سال سے پڑھا جا رہا ہے اور اس لمبی مدت میں بھی اس کی مقبولیت ویسی کی ویسی ہی ہے جیسی اپنی اشاعت کے وقت میں تھی ۔ دنیا کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور ہر ملک ' ہر قوم نے اس غم انگیز قصے کو درد اور دکھ کے عالم میں پڑھا ہے اور اب تک اسے اس عالم میں پڑھا جا رہا ہے ۔

یہ کتاب ایک نوجوان ورتھر کی المناک عشقیہ داستان ہے ' ورتھر ایک ایسی عورت سے بے پناہ محبت کرنے لگتا ہے جو ایک شخص کی بیوی بن چکی ہے ۔ یہ عورت شارلوٹے ' ورتھر کے آتشیں احساسات سے بخوبی واقف ہے اور خوب جانتی ہے کہ اس کا وجود ورتھر کے لئے زندگی کی ساری مسرتوں کا مرکز بن چکا ہے مگر چونکہ وہ ایک فرض شناس بیوی ہے اس لیے اپنے عاشق کو کوئی ایسا اقدام کرنے کی اجازت نہیں دیتی جو غیرذمہ دارانہ ہو اور جسے اخلاقی نقطہ نظر سے قابل اعتراض سمجھا جائے ۔ وہ خود کو اپنے شوہر '' البرٹ '' کی وفا شعار رفیقہ حیات ثابت کرتی ہے اور جس وقت

ورتھر اس کے شوہر سے بظاہر سفر پر جانے اور حقیقت میں خودکشی کے لیے پستول طلب کرتا ہے تو وہ اپنے کانپتے ہاتھوں سے یہ خوفناک چیز اسے بھجوا دیتی ہے -

ڈاکٹر ریاض الحسن اس کتاب کے مترجم ہیں - انھوں نے اس کے شروع میں ایک طویل و مبسوط دیباچہ لکھا ہے - جس میں اس کتاب کے ماخذ و مواد کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ شارلوٹے ، خود گوئٹے کی اپنی محبوبہ کا نام تھا - گوئٹے کو اس سے بے پایاں محبت تھی مگر یہ عورت اس کے ایک دوست کی منسوبہ تھی اس لیے گوئٹے اپنی محبت میں بری طرح ناکام ہوا اور غالباً اسی ناکامی کے تاثر کو کم کرنے کے لیے اس نے یہ ناول لکھا تھا -

یہ ناول اٹھارویں صدی عیسوی کے جرمنی بلکہ پورے یورپ کے شدید احساسات کی آئینہ داری کرتا ہے - اس میں یورپ کے نوجوانوں کی شیفتگی و فریفتگی کا بھرپور اظہار کیا گیا ہے لیکن اس انداز میں کہ اسے آج بھی انسانی محبت کی نہایت دردناک کہانی سمجھ کر پڑھا جا سکتا ہے اور پڑھا جا رہا ہے - نوجوان ورتھر کی داستان غم خطوط کی صورت میں ہے - یہ خطوط پڑھنے والے پر گہرا اور دیرپا اثر چھوڑتے ہیں - اس کہانی کی مقبولیت کا اس امر سے اندازہ لگائیے کہ نپولین نے اسے سات مرتبہ پڑھا تھا -

گوئٹے نے یہ کہانی اس زمانے میں لکھی تھی جب اس کا ذہن عنفوان شباب کے گہوارے میں جھول رہا تھا - اس کے بعد اس کی حکیمانہ بصیرت نے نوجوانی کی رومانی کیفیات کی طرف توجہ نہیں کی مگر اس کتاب کو اس کی ذہنی تخلیقات میں ایک نہایت اہم درجہ حاصل ہے - اور گوئٹے کی شہرت میں اس نے بھی بڑا اہم حصہ لیا ہے -

ڈاکٹر ریاض الحسن نے کتاب کا ترجمہ براہ راست جرمن زبان سے کیا ہے - ترجمہ بے عیب ہے - کتاب یوں پڑھی جا سکتی ہے جیسے طبعزاد ہو - مترجم نے ایک تو معلومات افزا دیباچہ لکھا ہے جس کے مطالعے سے گوئٹے کے ذہنی پس منظر کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے اور پھر ترجمے میں جابجا اردو اور فارسی کے ایسے اشعار بھی درج کردیے ہیں جو مصنف کا مفہوم بڑی خوبصورتی سے واضح کردیتے ہیں -

غبار خاطر

مصنف: مولانا ابو الکلام آزاد

مرتب: مالک رام

صفحات: ۴۳۴

قیمت: دس روپے

ناشر: ساہتیہ اکیڈمی - نئی دلی

تبصرہ نگار: ابو سلمان شاہجہان پوری

مولانا ابو الکلام آزاد، غبار خاطر، مالک رام، ان میں سے کوئی محتاج تعارف نہیں۔ مولانا آزاد ایک بے مثال صاحب طرز انشا پرداز، غبار خاطر ان کا شاہکار اور مالک رام اردو کے مشہور ادیب اور محقق، جنھوں نے غبار خاطر کا نیا ایڈیشن مرتب کیا ہے۔

مولانا آزاد کی وفات کے بعد یہ طے کیا گیا تھا کہ ساہتیہ اکیڈمی مولانا کی تصنیفات نئی ترتیب کے ساتھ شائع کرے گی۔ اس منصوبے کے تحت اب تک مولانا کی مشہور تفسیر ترجمان القرآن کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور اب غبار خاطر کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔

غبار خاطر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کے نام مولانا کے چوبیس خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ خطوط مولانا نے قلعہ احمد نگر کے زمانۂ اسارت میں لکھے تھے اور اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس دلی سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن بھی اسی ادارے نے شائع کیا، تیسرا ایڈیشن آزاد ہند پبلی کیشنز، لاہور نے ۱۹۴۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس ایڈیشن میں موسیقی سے متعلق ایک طویل اور دلچسپ خط کا اضافہ ہوا جو پہلی دو اشاعتوں میں نہیں تھا۔ پچھلے چند برس میں غبار خاطر کے نصف درجن سے زیادہ ایڈیشن صرف پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں ان میں سے بعض ایڈیشنوں میں صحت کتابت و طباعت میں کافی اہتمام کیا گیا ہے اور بعض میں مولانا آزاد کے حالات وغیرہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

مالک رام نے یہ ایڈیشن جدید اصول تحقیق و ترتیب کے مطابق مرتب کیا ہے۔ شروع میں ایک مفید مقدمہ ہے جس میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے تعلقات، مولانا کے طرز انشا، غبار خاطر کی ادبی حیثیت

اور اس ایڈیشن کی تیاری میں جو اصول پیش نظر رہے ہیں ، ان پر روشنی ڈالی ہے۔

مولانا کے اسلوب نگارش کی ایک خصوصیت اشعار کا بر محل استعمال تھا۔ وہ اس کمال فن کاری سے شعر کا استعمال کرتے تھے کہ شعر عبارت کا ایک جز بن جاتا تھا پھر یہ اشعار صرف اردو ہی کے نہیں عربی و فارسی کے بھی ہوتے تھے۔ انھوں نے متعدد مقامات پر انگریزی کے شعرا کے خیالات سے بھی رنگینیٔ عبارت کا کام لیا ہے۔ غبار خاطر کے چوبیس خطوط اور ۲۸۳ صفحات میں تقریباً سات سو شعر آئے ہیں۔ ان اشعار کے مصنفین کے نام تلاش کرنا ایک دشوار گزار مرحلہ تھا لیکن فاضل مرتب نے چھ سو سے زائد اشعار کے حوالے تلاش کر لیے۔

غبار خاطر میں بہت سے اشعار اپنے اصل متن کے مطابق نہیں ہیں اور ان میں لفظی تبدیلیاں ہیں۔ فاضل مرتب نے ان تبدیلیوں کی نشاندھی بھی کی ہے۔ ان تبدیلیوں کے کئی سبب ہوسکتے ہیں مثلاً

۱- مولانا نے جہاں متعلقہ شعر دیکھا تھا وہاں وہ اس طرح درج ہو جیسا کہ مولانا نے غبار خاطر میں استعمال کیا ہے۔

۲- کسی شعر کے اصل الفاظ حافظے میں محفوظ نہ رہے ہوں اور مولانا کی طبع موزوں نے اس مفہوم کو شعر کے سانچے میں ڈھال لیا ہو۔

۳- مولانا رح نے اپنے مزاج و حالات کے مطابق اس میں لفظی ردوبدل کر لیا ہو۔

ان میں سے ہر امکان موجود ہے۔ پہلے امکان کے ثبوت میں حافظ کا یہ شعر پیش کیا جاسکتا ہے۔

بیفگن جرعهٔ بر خاک و حال اهل شوکت بیں
که از جمشید و کیخسرو هزاران داستاں دارد

غبار خاطر میں بیفگن کی جگہ '' بیفشاں '' چھپا تھا۔ فاضل مرتب نے دیوان خواجہ حافظ شیرازی (مطبوعہ تہران ، ۱۳۲۹ شمسی) کے حوالہ سے '' بیفگن '' بنا دیا۔ لیکن ضیاء الحسن فاروقی نے لکھا ہے کہ دیوان حافظ کے نول کشوری نسخہ مطبوعہ ۱۹۱۷ء میں '' بیفشاں '' ہی چھپا ہے۔ معلوم ہو گیا کہ مولانا کے حافظے نے غلطی نہیں کی بلکہ ان کی نظر سے نول کشوری

نسخہ گزرا ہو گا ۔ اسی طرح دوسرے اور تیسرے امکان کے ثبوت میں بھی متعدد اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں ۔

کتاب کے متن میں جن رجال و کتب کے نام آئے ہیں، فاضل مرتب نے ان پر ضروری حواشی تحریر کیے ہیں ۔ یہ ایک نہایت مفید کام ہے، اس طرح بہت سی کتابوں اور ان کے مصنفوں کے بارے میں اہم معلومات یک جا ہو گئی ہیں ۔

غبار خاطر کی سابقہ اشاعتوں میں املا و کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں ، ان کا احساس مولانا کو بھی تھا ۔ اور مولانا نے ایک نسخے میں ان کی اصلاح بھی کر دی تھی ۔ مرتب نے ان اصلاحوں کے مطابق پوری کتاب پر نظر ڈالی اور اس طرح املا کی اغلاط کی تصحیح اور کتابت میں یکسانیت پیدا کر دی ۔

رموز اوقاف کا ابھی تک اردو میں پوری طرح رواج نہیں ہو سکا ۔ غبار خاطر کی سابقہ اشاعتوں میں اس کا کوئی اہتمام نہ تھا ۔ اس اشاعت میں اس کا خاص خیال رکھا گیا ہے ۔

دو سو تراسی صفحے پر کتاب کا متن ختم ہو جاتا ہے ، اس کے بعد ایک سو صفحوں میں حواشی ہیں اور پھر چوبیس صفحوں میں پانچ قسم کی فہرستیں ہیں ۔

۱۔ فہرست اعلام

۲۔ فہرست بلاد و اماکن

۳۔ فہرست آیات قرآنی واردۂ متن

۴۔ فہرست کتب واردۂ متن

۵۔ فہرست مآخذ حواشی

غبار خاطر کے اس ایڈیشن کی تیاری میں تقریباً دوسو کتب و رسائل سے مرتب نے استفادہ کیا ہے ۔ اس سلسلے میں جو محنت اور جانفشانی کی گئی، اس کے لیے مرتب مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ اس ایڈیشن کے حواشی اپنی مستقل حیثیت اور افادیت رکھتے ہیں ۔

کلیات مصحفی

مرتب : نثار احمد فاروقی
صفحات : ۲۵۴
قیمت : چھ روپے پچھتر پیسے
ناشر : علمی مجلس - فراش خانہ - دہلی ۶
تبصرہ نگار : افسر امروہوی

غریب‌الوطن مصحفی کے انتقال سے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد اس کی قسمت جاگی اور امروہے کے ایک جوان‌العمر ادیب نثار احمد فاروقی نے کلیات مصحفی کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا - اس کلیات کا ایک حصہ (جلد دوم) موصوف کی تصحیح و ترتیب کے بعد چھپ کر بصیرت افروز ہوچکا ہے - اس کلیات کی ترتیب اس طرح ہے کہ پیش لفظ و حرف اولین کے بعد ۲۰۸ صفحات میں ۳۳۸ غزلیں ہیں جن کے اشعار کی تعداد ۳۶۰۵ ہوتی ہے - غزلیات کے ختم پر دو مسدس ترجیع بند اور دو ترکیب بند ہیں ، ایک ترکیب بند مسدس ہے دوسرا مثمن اس کے بعد پانچ مثنویاں ہیں - مثنویاں ختم ہوجانے کے بعد رباعیات درج کی گئی ہیں جن کی تعداد پچاس ہے - آخر میں تمام مندرجات کا اشاریہ ہے - فاروقی صاحب نے یہ اچھا کیا ہے کہ کلیات کی تمام غزلوں کے مطلعے بقیہ صفحہ اشاریہ میں درج کردئے ہیں، اس سے پڑھنے والوں کو بڑی سہولت ہوگی اور ہر شخص کو اس کی مطلوبہ غزل ورق گردانی کے بغیر آسانی کے ساتھ مل سکے گی -

کلیات مصحفی کاغذ ، کتابت اور طباعت کے لحاظ سے صاف ستھری اور خوبصورت کتابوں میں شامل کرنے کے لائق ہے - معلوم ہوتا ہے کہ "علمی مجلس دہلی" خوش سلیقہ افراد پر مشتمل ہے اور اس کے سامنے اساتذۂ ماضی کی تخلیقات کو موجودہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ شائع کرنے کا جامع منصوبہ ہے - کلیات مصحفی اس مجلس کے سلسلۂ مطبوعات کی چوتھی پیشکش ہے - اس کلیات کا پیش لفظ مشہور محقق مالک رام صاحب کا تحریر کردہ ہے - موصوف نے تاریخ ادب کے اس ناواجب سلوک کا ذکر بڑے افسوسناک انداز میں کیا ہے جس کے نتیجے میں مدت تک مصحفی کو فراموش کیا جاتا رہا - لکھتے ہیں :

> " ہم آج تک اتنے بڑے شاعر اور خادم ادب کو اس کا جائز مقام پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں حال‌آں کہ ان کا اپنے زمانے میں ڈنکا بجتا تھا "۔

نثار احمد فاروقی کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور کلیات مصحفی کی تصحیح و ترتیب سے ان کی دقت نظر اور نفاست طبع کا اظہار ہوتا ہے ۔ کاش آن چند اغلاط سے کلیات مصحفی کا دامن پاک و صاف رہتا جو غالباً سہو کتابت سے رہ گئی ہیں ۔ مثلاً مثنوی '' ہجو مکان '' ص ۲۳۱ میں ایک شعر اس طرح چھپا ہے ۔

خاکباری ہے اس کی چھت کا کام
خاک اس سے جھڑا کر کے مدام

اس کے دوسرے مصرع میں '' کرے ہے '' کی جگہ '' کرکے '' چھپ گیا ہے ۔
رباعی نمبر ۱۱ صفحہ ۲۳۷ یوں درج ہے :

جوں آبلہ پھوٹ پھوٹ کب تک بہئے
ہے مصلحت آپ بھی کہ چپ ہی رہئے
نے یار و آشنا نہ مشفق نہ شفیق
کہئے تو یہ درد اپنا کس سے کہئے

اس رباعی کے دوسرے مصرع میں '' آپ بھی '' کی جگہ '' اب بھی '' ہونا چاہئے ۔ پہلے مصرع کے '' کب تک '' کا تقاضا یہی ہے ۔

ایک رباعی اور ہے (نمبر ۳۴ صفحہ ۲۴۰) :

دو دن وہ کشیدہ جو مجھے پاتا ہے
یوں پیار سے حق میں میرے فرماتا ہے
آجائے ہے مصحفی کے کیا جی میں بھلا
کم بخت جو آتے جاتے رک جاتے ہیں

چوتھے مصرع میں '' رک جاتا ہے '' کے بدلے '' رک جاتے ہیں '' لکھا جانا اور طباعت میں باقی رہ جانا تعجب خیز ہے ۔ اس قسم کی اور بھی متعدد غلطیاں ہیں جن کی نشاندھی کی جاسکتی ہے ۔ بہتر ہو کہ کلیات مصحفی کی دوسری اشاعت میں ان کا اعادہ نہ ہونے دیا جائے ۔

تصحیح

زیر نظر شمارے میں قاضی عبدالودود کے مضمون "تذکرۂ مسرت افزا" اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مضمون "کربل کتھا کا لسانیاتی تجزیہ" میں چند اغلاط طباعت رہ گئی ہیں، از راہ کرم ان کی تصحیح کرلی جائے۔

تذکرہ مسرت افزا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶	۲۵	۳۰	۱۳۷
۶۲	۱۵	آئینہ	آینہ
۸	۲۱	خواب	در خواب
۸	۲۶	خاں	خاں اور زوجۂ مصیب
۹	۲۰	اطلات ملتی	اطلاعات ذیل ملتے
۱۲	۱۸	پڑی	اڑے
۱۶	۳	اسپرلگر	اشپرنگر
۱۷	۱۰	۱۱۶۰	۱۱۶۳
۱۹	۲۳	تدبیر	ھزبر
۲۱	۲	ھوے	ھووے
۲۵	۹	شاعر	شاعری
۲۷	آخر	کتاب	کاتب
۲۸	۲۵	نہیں ہے	نہیں ہے، یا ہے تو محض برائے نام ہے

۲۹	۳	تدبیر	ہنر ہر
۲۹	۱۹	کے	کی
۲۹	۲۱	ص ۳۶	ص ۱۳۶
۳۰	۱۰	کی اغلاط	کے چند اغلاط
۳۱	۱۱ تا ۱۳	ان کی پیدائش.........نہ سمجھتے ہوں	یہ عبارت خارج کی جائے
۳۳	۷	دوسروں...علاوہ	دوسرے تذکروں کی شہادت کے علاوہ

کربل کتھا کا لسانیاتی تجزیہ:

۳۶	۱۱	جوڑنا	جوڑتا
۳۶	۱۴	پیچدگی	پیچیدگی
۳۶	۲۱	کو ی	کوئی
۳۸	۱۶	ے	بے
۳۹	۱۸	نسبتاً	نسبتہً
۴۰	۲۶	عبدالستاو	عبدالستار
۴۲	۳	جرات	جرأت
۴۲	۴	زبر	زیر
۴۲	۲۳	یہا	یہاں
۴۴	۲۳	پنجہ بی	پنجابی
۴۶	۲۱	معمولی	مفعولی
۴۷	۱۱	نہیں	ہیں
۴۹	۱۷	غناوی	غناءی
۵۴	۱۳	اپنی اپنی	اپنی
۶۰	۱۸	اوڑاتیا	اوڑاتیاں
۶۰	۲۴	ثر	اثر
۶۳	۲۱	لجراتی	گجراتی

۶۸	۱۱	کی	کی طرف
۶۸	۲۳	صغیری	صفیری

رسالہ اردو جولائی ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر گیان چند کا مضمون "عظمت اللہ خاں کے عروضی اجتہادات کا جائزہ" شائع ہوا ہے۔ اس میں ذیل کی تصحیحات کرلی جائیں:

۱- ص ۲۹ کے فٹ نوٹ میں مضمون نگار کے تعارف میں لکھا ہے:

صدر شعبہ' اردو جموں و کشمیر یونیورسٹی (کشمیر)

یہاں قوسین میں کشمیر کی بجائے جموں ہونا چاہیے کیونکہ موصوف جموں کے شعبے کے سربراہ ہیں۔

۲- ص ۴۷ پر ایک نثری جملے:

"ہماری موجودہ عروض اور پنگل کی بحریں اگلے شعرا کی آزمودہ ہیں" کی تقطیع کی گئی ہے اس میں 'کی آز' کا وزن مفعولن درج ہوگیا ہے جو مفعول ہونا چاہیے۔

۳- ص ۶۲ پر ایک مصرع:

"ایک اندھیری دے کر چھائے..............." کا وزن
' فعلن فعلن فعلن فعلن .... ' درج ہے۔ اس کی بجائے
' فاع فعولن فعلن فعلن .... ' ہونا چاہیے۔

* * *

تتمۂ پھول بن

تصنیف :

محمد حیدر ابن جعفر

ترتیب و مقدمہ :

شیخ چاند ابن حسین

مقدمہ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علی آلہ و اصحابہ اجمعین ۔

اما بعد ۔ تتمۂ پھول بن کا ذکر کرتے ہوئے میں نے پھول بن کے مقدمے میں عرض کیا تھا کہ اس کی ترتیب میں فی الوقت (یعنی ۱۹۵۰ء میں) مصروف ہوں اور انشاءاللہ العزیز بہت جلد اس کا متن اور تصریحی نوٹ پیش کر سکوں گا ۔ چنانچہ حسب تحریر بندہ نے چند دن بعد ہی اس کام کو مکمل کر کے قبلہ بابائے اردو مرحوم کی خدمت میں بغرض اشاعت پیش کردیا تھا ، اور قبلہ بابائے اردو نے اس کو منظور بھی فرما لیا تھا ۔ چنانچہ انھوں نے میرا مبیضہ اپنے پریس مینجر کے پاس بھیجا اور اس کی اشاعت کا حکم بھی دے دیا ۔ بدقسمتی سے ان دنوں انجمن کے حالات کچھ بگڑے ہوئے تھے ۔ منیجر پریس نے مبیضہ کے ساتھ کیا کیا اس کا علم نہ تو مرحوم قبلہ بابائے اردو کو ہوا نہ مجھے ۔ اب کوئی دس گیارہ سال گزرنے کے بعد مجھے پھر اس کا خیال آیا ۔ اور انجمن کے موجودہ اہل بست و کشاد کی مسلسل کوششوں کے باوجود بھی وہ مبیضہ نہ ملا تو لامحالہ اس کام کو ازسر نو انجام دینے کا خیال پیدا ہوا ۔ چونکہ اس مثنوی کا صرف ایک ہی مخطوطہ ہے جو انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے ، لہذا اس کے عکسی نسخے کو بروئے کار لا کر تتمۂ پھول بن کی از سر نو ترتیب کا کام شروع ہوا ۔ للہ الحمد کہ تھوڑی بہت محنت سے یہ متن اب قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں ۔

مولوی نصیرالدین ہاشمی مرحوم نے اپنی تصنیف " یورپ میں دکھنی مخطوطات " میں اضافۂ پھول بن کے تحت ابن جعفر کی اس تصنیف کی پوری صراحت کردی ہے ، جس میں نہ صرف سبب تالیف تتمۂ پھول بن کی وضاحت

کی ہے بلکہ وہ تمام خصوصیات بھی بیان فرمائی ہیں جن کا اعادہ کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا - تتمہ' بھول بن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شاعر نے دل کھول کر شادی بیاہ کی ان رسوم کی تفصیل قلم بند کی ہے جو اس زمانے میں بالخصوص دکن میں رائج تھیں اور اب تک تھوڑی بہت کمی و بیشی کے ساتھ متوسط طبقے میں رائج ہیں۔ ان رسوم میں خاص کر ھلدی ، تیل ، تناول طعام ، جہیز اور شب گشت کا تفصیلی ذکر بہت ممتاز ہے۔ سبب تالیف کے بارے میں خود ابن حعفرکا بیان بہت ھی واضح ہے۔ وہ لکھتا ہے :

اھی یک نیک بی بی یک شہر میں
نہیں کوی انکی ثانی بحر و بر میں
کہ شیخ بختور کی وو ہے دختر
بزرگی کے فلک کی ہے وو اختر
خدا کی مغفرت سوں شیخ دلشاد
ہوے دنیا کے بتخانے تے آزاد
اتھی مادر بھی انکی بانوے نیک
خدا کے خاصگاں میں وو اتھی ایک
وو بی بی تھی خدا کے دوستاں میں
رکھیا حق تس جنت کے بوستاں میں
صفت ان بزرگاں کے بیشتر ھیں
ولیکن یاں کیا ھوں مختصر میں
مرد انکا امیر نامور ہے
شجاعت ھور سخاوت میں نشر ہے
بہوت آتے ھیں واں شہری شہر کے
سدا جاتے ھیں لے کچھ مال (و) زر لے
سکل آفاق میں وو یوں ہے مشہور
ہے جیوں مشہور گھن کے اوج پر سور
آ ہے قانون پر وو بزرگاں کے
ہے ظاہر سب امیراں میں جہاں کے

٥

نواب عبدالنبی خاں کا ہے فرزند
نواب عبد الرحیم کا وو ہے دلبند
کرم کے بحر کا رخشاں گہر ہے
نواب بہلول خاں کا وو جگر ہے
نواب عبدالحمید ہے نام اس کا
عدل انصاف ہے جم کام اس کا
ہوا آفاق سب ملکے ملک میں
رکھیا حق اس کے تئیں امن و اماں سیں
سگل عالم تھا اس کے آسرے تل
دیا حق اس کے تئن ہمت کا یوں بل
فراری کی ہوئے ، تلوار لے ہات
بغیر شمشیر وو کیتا ہے کس دھات
نکالیا نین تلک دشمن ہو شمشیر
ہوئے تس دہدبے سوں دشمناں زیر
آ نے سب دشمناں کوں دوست کیتا
زہر نا دیکوں شکر ان کوں دیتا
عدو جو دفع ہوتا ہے شکر سوں
سراسر احمقی دینا سم اسکوں
اسے دایم رکھے حق آبرو سوں
امن سوں حق رکھے اسکے ملک کوں
رکھے حق آن دونونکوں جگمیں دایم
جلک ہے گھن ہو چندر سور قایم
کرے حق عمر (و) دولت روز افزوں
رکھے لئے شان و عز و دبدبے سوں

رہے ان کا ہمیشہ بول بالا
ہونے ان کوں مراتب بہوت اعلا

کسی کا نا کرے حق ان کوں محتاج
نچھیں محتاج کس کے وو خدا باج

دلاوے جگ کے محتاجاں کوں انسوں
رکھے حق سرخ رو دایم آنو کوں

دیوے ان کے مراداں دو جہاں میں
رکھے حق ان کے تئیں امن و اماں میں

قلعہ سدھوٹ کیرا ان کوں مکاں ہے
مکاں اسکے نمن جگ میں کہاں ہے

قلعہ بھی کوئی نیں ثانی ہے اس کوں
ندی لائی ہے سر بھی اس کے چرن سو(ں)

عظیم الشان ہور گہری ندی ہے
ندی سب پور ہور تھوڑی کدی ہے

نہیں سب خشک ہوتی ہے کدی وو
رواں صیف و شتا میں ہے ندی وو

جداں وو پور آوے تا کنارا
گزرنے فیل کوں نیں اس سوں پارا

بری آں کے دلیراں تیوں بھلے بھوڑ
کبھی نامرد تیوں جاوے نہ مکھ موڑ

کنارے تس قلعہ سدھوٹ کا ہے یوں
لب کوثر آپر قصر جناں جیوں

رواں پچھاں ہے وو دنرات جیوں مار
ہے جاری سیل اشک عاشقاں سار

د سیں گرداب یوں ہو اس کے درمیاں
ہیں محبوبانکے جیوں چاہ زنخداں

دل عشاق کے نمنے ہے جوشاں
اچھے وو رعد باران تھوں خروشاں
زیادہ مضطرب ہو عاشقاں سوں
ہزاراں پیچ کھا توڑے اپس کوں
کر اپسیں گیسوے خوبا(ں) نمن خم
ہوئے جا کر رخ دریا سوں محرم
اپس کے اصل کا ہے وصل جویاں
ہے نسدن سالکاں کے سار پویاں
جداں ہوئے کثرت صورت ستی پاک
سٹے یک منزل وحدت میں بیباک
وصل دریا سوں اس کا گر نہ ہوتا
صدف کے بر میں در کا گھر نہ ہوتا
پھرا توں اس بیاں سوں اب عناں کوں
غرض رکھ توں اپس کے مدعا سوں
نچھل عصمت کے گھن کی سور ہے وو
بہوت نیکی منے مشہور ہے وو
محباں سات حب دل میں دھرے وو
مدارا دشمناں سوں لیے کرے وو
کریں انسان پر وو بہوت احساں
بھی حیواناں کوں پالیں از دل و جاں
رہیں اس پاک دامن کیاں ہمیشا
بہوت بیبیاں ہے شہری شہر سوں آ
سدا آرام سوں رہیں رات دن یوں
محل میں ان کے خویش و اقربا جیوں

آنو کی سب سوں خوی و بوی ہے خوب
ہر یک کے سات گفت و گوی ہے خوب

کریں ہر کام وو نت عدلکے سات
سگل ظلم و جفا سوں دھوئے تھے ہات

آ ہے اس نیک کا سب کام بھی نیک
ہزاراں لاکھ لکھوں میں ہے وو ٹیک

کبھی نا حق تلف کس کا کریں وو
ادک اس بات میں حق سوں ڈریں وو

دلاویں نا کسی کا حق کسی کوں
اماں وو دیویں جسکا اسی کوں

پوجیں استاد کا حق جان و دل سات
آنو کے فرزنداں کا بھی اسی دھات

کریم صاحب آ ہے اس نیک کا نام
آ ہے جیوں نام ان کا لیک ہی کام

کریم انکوں دیا ہے نام بھی نیک
دیا ہے اس موافق کام بھی نیک

چندر ہے پارسائی کے گگن کی
آ ہے وو مشتری عصمت کے گھن کی

اچھے قصیاں سنی انکوں ادک ذوق
کہانیاں سوں اچھے دن رات لے شوق

قصے کوں بھولیں کے وہ سنے جب
بچارے یوں اپس دل میں انو تب

حکایت ہے سمنبر کی بہوت خوب
سگل اس کا بیاں ہے بہوت محبوب

ولے نیں بیھاؤ کا مذکور ہے کچ
نہ ہلدی تیل کا دستور ہے کچ

کچ یک شمہ سخن کا مج منے پائے
سو یوں اس بیہاؤ کا مج حکم فرمائے

کرو کچ ذکر اس کے بیہاؤ کا اب
لکھیا وہیں دو قصہ تصویر سوں سب

کرے جب حکم سوں یوں مجھ سرافراز
حکم پر میں کیا گنج سخن باز

کھرا کھوٹا جکچ دھر نا اتھا گنج
کیا ظاہر امر پر ان کے بے رنج

سخن گرچہ نہ تھا کہنے کے لایق
ہیں شاعر جگمیں یکسوں ٹیک فایق

نہ رکھ خام، سخن کا ننگ ہور نام
لکھیا دو حرف جیوں تیوں پختہ و خام

گر اس میں عیب چننے جاؤگے تم
تو پھتا لفظ یک نا پاؤگے تم

سراپا شعر ہے کچا سراسر
رکھو معذور مج فضل و کرم کر

کرو سکتے ہو گر اصلاح کوئی
وگر نیں تو کرو تم عیب پوشی

ختم کر ابن جعفر گوش توں دھر
اتا ابن نشاطی کے بچن پر

مندرجہ بالا اشعار سے نہ صرف سبب تالیف تتمہ پھول بن کی وضاحت ہو جاتی ہے بلکہ جس غرض سے یہ اشعار لکھے گئے ہیں اور جس کے حکم سے لکھے گئے ہیں ، ان سب کی صراحت بھی ہو جاتی ہے ۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے ان تمام باتوں کا بیان اپنی کتاب مذکورہ میں بہت ہی شاندار طریقے سے کیا ہے جس میں میری طرف سے کسی اضافے

کی گنجائش ہی نہیں ، البتہ میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر شادی بیاہ کے رسوم کا بیان ابن نشاطی خود بھی کرتا تو شاید اس سے بہتر نہ کر سکتا تھا ، گوکہ وہ ایک بڑے پایہ کا شاعر ہے اور ابن جعفر اس پایہ تک نہیں پہنچ سکتا ۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بحیثیت ایک شاعر کے ابن نشاطی کی قادر الکلامی اور قوت بیان وغیرہ مسلم ہیں ۔ ابن جعفر نے بالکل اسی طرح اس تتمہ کو لکھا ہے جس طرح ابن نشاطی نے پھول بن لکھا ہے ۔ زبان سادہ ، پر زور اور دلکش ہے اور شادی بیاہ کی رسوم کے سلسلے میں تمام باتیں بالتفصیل بیان ہوئی ہیں ۔ ابن جعفر محض شاعر ہی نہ تھا بلکہ ایک مصور بھی تھا ، چنانچہ وہ خود کہتا ہے کہ میں نے ان اشعار کے ساتھ تصویریں بھی بنائیں جو اس کے ممدوح کو پسند آئیں ۔

جس مخطوطے سے اس متن کی ترتیب ہوئی ہے اس میں تصاویر بھی ہیں اور خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ ان اصلی تصاویر کو پیش نظر رکھ کر بنائی گئی ہیں جو خود ابن جعفر نے بنائی تھیں ۔ و اللہ اعلم ۔

شادی بیاہ کی رسوم کے سلسلے میں جو خاص اصطلاحات تتمۂ پھول بن میں استعمال کی گئی ہیں ، وہ اس وقت کی کسی اور ادبی یا علمی کتاب میں نہیں ملتیں ۔ اس نقطۂ نظر سے تتمۂ پھولبن کی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے ۔

ابن جعفر کے تتمہ کا آغاز ابن نشاطی کے اس شعر کے بعد ہوتا ہے

عدالت کا رکھ اپنے سیس پر تاج
فراغت سوں سدا کرتا اتھا راج

جو میرے مرتبہ ایڈیشن کے صفحہ ۱۱۱ پر چھپا ہے ۔

چونکہ ابن جعفر نے یہ اضافہ کریم خان قلعہ دار دھوٹ کے ایما سے کیا ہے ، لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اضافہ ابن نشاطی کے کوئی سو ۱۰۰ سال بعد (یعنی سنہ ۱۱۲۷ھ کے بعد) ہوا ہے ۔ اس کے سنہ تصنیف کا دوسرا کوئی خارجی ثبوت نہیں ملتا اور نہ خود ابن جعفر نے اپنے کلام میں اس کا کوئی ذکر کیا ہے ۔

مرحوم مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا ہے کہ اس تتمہ سے اس وقت کے مسلمانوں کے تمدن اور بود و باش کے طریقوں کا پورا پورا پتہ چلتا ہے ۔

تصاویر تتمۂ پھول بن کے سلسلے میں یہ بھی جسارت کرتا ہوں کہ بہت ممکن انڈیا آفس کا یہ مخطوطہ وہی مخطوطہ ہو جو ابن جعفر نے تیار کیا تھا اور جس میں وہ تصاویر بعینہ موجود ہیں جو ابن جعفر نے بنائی تھیں ، لیکن یہ دعویٰ یقینی نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ اس کا بین ثبوت نہ مل جائے ۔

اس مقدمے کے اختتام سے پہلے میں جناب اختر حسین صاحب صدر انجمن ترقی اردو کا دلی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ان کی عنایت سے مجھے انڈیا آفس کے نسخے کا یہ عکسی مجموعہ دوبارہ تتمۂ پھول بن کی ترتیب کے لیے عنایت کیا گیا ۔ یہ عکسی مجموعہ میں نے جناب قبلہ بابائے اردو کے ایما سے انڈیا آفس سے منگوایا تھا اور مرحوم کو پیش کردیا تھا تاکہ ان کے کتب خانۂ خاص میں محفوظ رہے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تتمہ پھول بن

محمد حیدر جعفر زباں کھول
نچھل دریا سوں دلکے در بچن رول

سمنبر ہور ہمایوں شاہزادہ
سکونت جب کئے اس ملک میں آ

دنو آئے سو خوشخبری سنیا جد
آدک شاہ عجم شادا ں ہوا تد

رواں کر یوں محبت سات خامہ
لکھیا تب یوں دنوں کوں شاہ نامہ

تمی آئے سو سن کر میں ہوا شاد
ہوا سب عمر کا غم پل میں برباد

ا تا امید یوں ہے مج خدا سوں
ملاوے مج سوں لا کر تم دونو کوں

محبت سوں بھی کیتے دھات لکھ کر
کیا ہے ختم تب نامے کوں اس پر

میرے اس خط کوں دیکھیں گے تمی جب
شتابی قصد آنے کا کرو تب

مجھے لے ہے تماری انتظاری
ہے تمنا دیکھنے مجھ بیقراری

کرو تم آ کے میری چشم روشن
میرے دل کے کرو گلخن کوں گلشن

وزیر کوں بہوت لشکر دیکے سنگات
روانہ تب کیا نامہ بھی دے ہات

وزیر اس شاہ کن نے تب وداع ہو
چلیا ہے جلد شہزادی طرف وو

ہر یک منزل مراحل قطع کرتا
ہر یک جنگل و بستی سوں گزرتا

کتے دن راہ چل کر اس وضع سوں
وو شہزادی کے آ پونچیا شہر کوں

سو شہزادے کوں نامہ شہ کا دیتا
زبانی بھی سگل اظہار کیتا

کہیا شہ ہے تمہاری یاد میں جم
تمارا یاد ہے دن رات ہمدم

وو نامہ دیکھ دونو شاد ہو کر
جتے غم فکر سوں آزاد ہو کر

آپس کی سلطنت سب لے کے سنگات
عجم کوں تب چلیا شہزاد خوش دھات

نکل کر واں سوں کر طے منازل
عجم کے ملک کوں پونچیا ہے خوشدل

شہنشہ سب شہر آراستہ کر
مصفا سب چپا ہور راستہ کر

کیا سب شہر کوں یک دھرتے گلزار
ہوا ہے شہر سارا پھول بن سار

بلا بھیجیا ہے ان کوں شہر میں تب
وو آئے دبدبے ہور شان سوں سب

ھمایوں شاھزادہ ھور سمنبر
ھوئے داخل مبارک وقت آ کر

دونوں پرسوں تصدق کر کے لے مال
لجایا محل میں دختر کوں در حال

بجا لایا ہے تب آداب شہزاد
گلے لا شاہ اس کوں لے ھوا شاد

کیا نب اس کے تئیں رھنے کی خاطر
مقرر ٹیک مندھر بہوت نادر

اتا توں جملہائے معترض چھوڑ
لجا کر دل کوں مقصد کے طرف جوڑ

ھر یک مذکورکوں توں یک طرف دھر
سمنبر کی اتا شادی بیاں کر

شہ ملک عجم عادل نیکو نام
لگیا کرنے کوں شادی کا سر انجام

اول نادر ھنر منداں بلا کر
کہیا ان سب کے تئیں شہ یوں سراسر

عمارت کا نپٹ نادر کرو کام
نچھے ویسے محل دار روم یا شام

حکم شہکا آنو پر یوں ھوا جب
ھنر اپنا دکھانے کوں لگے سب

محلاں جا بجا خوش طرح سارے
عجب کچ زیب و زینت سوں سنوارے

هر یک جاگا کرے تھے کام زر کا
کرے تھے خرچ لے لعل و گہر کا

کئے هر محل مین کاربز و گلزار
هوئے سب محل زیب آور ارم سار

جو کوئی دیکھے و محلاں یوں کہے هیں
عمارت خوب ان سے کیں دیکھی نیں

منجی خانے بدل شو کی بھی یکٹھار
کئے آراستہ فردوس کے سار

رہے نا اسمین بو شیو جیوں بھشتی
محل جیوں بحر و صلت بیچ کشتی

هر یک محل و مندھر کوں کر کے تیار
بچھانا بھی کئے خوش وضع آسٹھار

سگل محلاں کوں یوں تیار کیتے
سو شہکے پاس سب اظہار کیتے

شہنشہ جب دیکھیا محلاں کوں تیار
کیا اسباب سب مجلس کا اس اٹھار

سگل عالم کوں دعوت خاص هور عام
کھلا بھیجیا ہے وو شاہ نیکو نام

امیراں هور شاهاں کوں اسی طور
بلا بھیجے هیں شہری شہر سوں هور

قبولے نیوتا بیمذر سارے
بھرے مجلس میں آجیوں گگن پو تارے

بلا بھیجے هیں بیبیاں کوں اسی دھات
الاچی بھیجکر خوش رسم کے سات

زنانے بھی کرے مجلس مہیا
مزین جیوں فلک پر ہے ثریا

منجی خانے میں شو کوں زیب و فرسوں
بٹھائے ھیں وو ماہ بختور کوں
کیا شہ خادماں پر حکم جاویں
بلا مطرب و رقاصاں کوں لاویں
ہوئے رقاس ہور مطرب بھی حاضر
سکل انکوں ہوئے یک دھرتے ناظر
لگے گانے بجانے راگ ہور ساز
ہوئے سب عاشقاں کے دل کے در باز
قداں مجلس منے سفرا بچھائے
سو کھانا کئی جنس کا لیکے آئے
کئے سب مل کندوری خرج اسٹھار
ہوا ہے عیش کا پھر تازہ بازار
اُتھا عاروس شو کے گھر میں دن رات
مہیّا عیش ہور عشرت اسی دھات
اُتھے عالم سکل اس شہر کے شاد
ہوا سارا شہر شادی سوں آباد
ملیا تھا خلق واں چارو کدھن کا
ہوا تھا شہر سارا پھول بن سا
رسم ہلدی کی دو طرفا رواں تھی
سکل اس کام میں نسدن دواں تھی
ادھر سوں رسم ہلدی کی آدھر جائیں
بھی رسمانی وہاں سوں یونچ لے آئیں
کئے ہلدی کتئیں جب رسم اتمام
بری کا تب لگے کرنے سر انجام
زر و گوھر یتا تھا بے معیّن
نہیں سکتا اُتھا کوئی اسکے تئیں گن

مرصع کا سگل زیور سراپا
رکھے تھے جوڑ سب طبقاں منیں لیا

بہوت جوڑے بھی نادر بیحد تھے
زری هور رنگ رنگیں کے جنس کے

پھولیل و عطر کے شیشے تھے بیحد
بھی شیشے تھے گلابی یونچ بیحد

سہاگ پوڑا تھا مشکیں زعفراں کا
عبیر و ارگجا بھی خوش وهاں تھا

نچھل چوڑیاں اُتھے موتی جڑے خوب
مرصع کا اتھا مو بند محبوب

کنگن تھے دهال موتی کے درخشاں
اتھا سہرا بھی خوش موتی کا رخشاں

گلاب پا شاں مرصع کے دھرے تھے
لباب خوش گلاب اس میں بھرے تھے

بھی رسما نہ سگل کر تیل کا واں
رکھے اٹھار پر لا جوڑ طبقاں

جڑتکی لا کے چوکی تیر محبوب
رکھے تھے جوڑ رسما نے منے خوب

مہیا کر جتا اسباب خوش دهات
چلے دلہن کے گھر لے دبدبے سات

دُر و یاقوت کا خوش چوک بھی کر
نچھل چوکی مرصع کے اُپر دھر

فرش لیا بہوت نادر اس اپر بچھائے
عروس نازنیکوں لیا کے بٹھلائے

چڑائے تیل مل کر صمدناں سب
جواھر زر سٹے لے وار کر تب

سو ویں مجلس منے سفرا کئے بار
تکٹ کر لیائے چوہا شربت اسٹھار

بھی کھانا لے جنس کا لا دھرے تب
سگل معمور سفرے کوں کرے سب

بہوت عالم کے تئیں کھانا کھلائے
دھلا ھاتاں عطر ھور پان لائے

سگل صمدیانکا رسمانہ ادا کر
دئے پان ھور خوشبو سبکوں یکسر

قلم کا ھو کے قاصد سر برہ کار
اکیا کرنے جھز کا ساز نیار

روپے سونے کے دیگاں ھور دھالے
جڑت کے بھی صراياں ھور پیالے

مزین پانداں ھور پیکداں خوب
اُتھے طشت آفتابے بہوت محبوب

صندوقاں مُہر زرینے کے اُتھے لے
پٹارے تھے بھرے پوشاک سوں کے

بھی شطرنجیاں و سُزنیاں ھور قالین
نہالیاں گاؤ تکیئے نرم بالبن

جڑتکے چار پایاں ھور کرسیاں
ھنڈولے بھی مرصع کے اُتھے واں

نہالیاں نیم تاسی بالشاں خوب
زری تھے چادر اں بھی اسپو محبوب

پلنگ پوشاں پو موتی خوش بھرے تھے
مقیشے کام بھی اسپر کرے تھے

سنہرے ہور جڑتکے تھے شمعدان
رکھے تھے جوڑ خوش طبقاں کے درمیان

کتنے شے سیم وزر کے بھی کرے تھے
ادک ترتیب سوں لیا کر دھرے تھے

سکل اسباب تھا جو زندگی کا
رکھے تھے واں بہوت ترتیب سوں لیا

غلاماں ہور کنیزاں لے اسی دھات
اتھے رومی وحبشی جوں کے دن رات

اتھے گھوڑے و ہاتھی بھی معین
بھی اونٹاں ہور گاڑیاں تھے سکاسن

بیان سارا کہاں لک کوئی کریگا
لکھے ہرچند تو سب نا سریگا

کریم ایسا دیا ہے گنج مجھ ہات
تو میں خرچیا ہوں بے معتاد اس دھات

ولے اس طول کوں یوں مختصر کر
لکھیا دو حرف میں میں ٹیک دفتر

رسم سب تیل کا بھی کر کے تیار
چلے عارس طرف سوں شو کے دربار

نقارے نوبتاں ہور دبدبے سات
لجا پونچاے شو کے گھر کوں خوش دھات

بہت دن بونچ تھی شادی دو طرفا
وہاں کھاتے تھے کھانا لوگ سب آ

اتھی مجلس محل میں یونچ دن رات
کھلے گلشن منے جیوں گل خوشی سات

رسم ہلدی بری ہور جہز کے جب
بجالائے ادک ترتیب سوں سب

اتھے سب عیش و عشرت میں شب و روز
ہمیشہ تھا سبوں تک روز نو روز

اچھے عیش و خوشی دنیاں میں دائم
سدا رہے دین احمد جگ میں قایم

شب شب گشت آئی جلوہ کر ہو
نہ تھی شب بلکہ رشک روز تھی وو

فلک پر آ کہ شاہ روم تا شام
کیا جاری سکل اطراف احکام

گیا مغرب میں پھر کرنے کوں شاہی
چڑہیا تخت فلک پر بدر لاھی

ہوا روپوش جب وو شاہ گلرنگ
بھریا سب جگ منے آ لشکر زنگ

ہوا جب احمر سوزاں نہانی
تداں ظاہر ہوا شمع شبانی

دیوے گھن پر ہوئے تاریانکے روشن
منور تھی تجلی سوں دھرت گھن

ہوا اشہب قلم کا تیز رو تر
رکھیا سر گشت کی مجلس منے سر

ہوا ہے برق نمنے تیز و ترار
——— منے تھا بحر کے سار

بچھانے ہر محل میں خوش کئے تب
جتے تھے محل زیب آور ہوئے سب

زری سُزنیاں بچھا تکئے دھرے خوب
شمع ہر ٹھار پر روشن کرے خوب

قندیلاں یوں آپر لٹکائے سارے
درخشان جیوں گگن پر ہیں ستارے

محل سارے منور یوں ہوئے جب
فخر کرنے لگے افلاک پر سب

کیا تب خادماں پر حکم یوں شاہ
بلاؤ مجلساں کوں کر کے آگاہ

بلا بھیجے سگل لوگاں لتئیں جب
سو آ مجلس کتئیں زینت دئے سب

بھرے مجلس منے سب آکے ہر ٹھار
ہوا پھر عیش کا واں تازہ گلزار

آتھے اس شہر کے سب لوگ حاضر
اتھے بھی پر ملک کے کے مسافر

امیراں ہور شہاں بھی پر شہر کے
سگل اس وقت پر مجلس منے تھے

جتے مجلس میں واں حاضر آتھے سو
عدد کرنے منے آتے نہے وو

بھرے تھے لوگ آ مجلس میں اس طور
زمیں تل بوج سوں عاجز ہوا ثور

سگل مجلس منے یوں تھے وو ہر ٹھار
دسیں جیوں گگن اپر ثابت و سیار

آتھے سید عرب ہور شیخ بھی واں
قریشیاں ہور افغاناں و مغلاں
آتھے سندی و ھندی قوم بھی کے
آتھے ھر قوم کے بھی لوگ واں لے
زنانی صف بھی تھی ھر قوم سوں پُر
جڑے ھیں زر پو ھیرےلعل جیوں دُر
بھری مجلس محل میں ہور سب بہار
گل محفل ھوئی روشن چمن سار
حکم شہ یوں کیا تب خادماں پر
بلاویں مطرب و رقاص یکسر
ھوئے آ جمع اپنے ساز لے سات
بھرے مجلس منے سب آ کہ خوش دھات
تمبورہ ہور کمانچہ عود و مردنگ
اتھا بھی سرمنڈل قانون ہور چنگ
اتھا بربط رباب و چارتارہ
کرے عشاق کا دل پارہ پارہ
بھی سازندے سروداں ہور سہ تار
سٹیں آواز دلبر زخمہ ھر بار
بجاوے کوئی قانو (ن) کوئی کمانچہ
لگاوے کوئی مندل پر تماچا
کرے بربط کے تئیں کوئی گوشمالی
بھرے ھر دل منے شوقوں آلالی
ھوا جب یوں طرب کا ساز پر سوز
ھوئی وو شب سبوں پر روز نوروز

صرایاں مئے کے لیکر ساقیاں آئے
سگل مجلس منور کرکے دکھلائے

لگا لگ جام مے کے جھیلنے تھے
پیالے جیوں کہ گینداں کھیلتے تھے

سگل مجلس ہو مستی کا ہوا بار
ہوئے مخمور سارے یار و اغیار

پڑیا جب ساز کا آواز درگوش
ہوئے سب شوق ہور مستی سوں بیہوش

جو ویسے میں کتے رقاص بھی آئے
سگل مستاں کے تئیں پھر ہوش میں لیائے

نچھل صورت میں تھے جیوں چاند سارے
مگر اترے ہیں گھن پر تے ستارے

نزاکت میں دسیں بوں سر و بالا
سروقد پرے موں جیوں سرخ لالا

مکلل تھیاں زر و زیور میں ساریاں
بچتر بے بدل چنچل و و ناریاں

کھڑیاں جب ناچنے کوں ہوکے تیار
ہوئی مجلس سگل جیوں نقش دیوار

ہر یک پل میں دکھاویں چھند کے دھات
کھلاویں عاشقاں کے دل خوشی سات

ہر ایک اعضا سوں دکھلاویں لکھاں چھند
ہزاراں دل کریں ہر بال میں بند

و آیاں ناچنے گانے کتیس جب
نین مجلس کے خیرہ ہو رہے تب

ہمیشہ بہار

(تذکرہ شعرائے فارسی)

مُصنّفہ

کِشن چند اخلاص

(تیسری قسط)

مرتبہ

ڈاکٹر وحید قریشی

شاه طاهر دکنی

بانک باز میدان سخن آفرینی زبانه انداز رزم‌گاه سخن چینی، شاه طاهر دکنی(۱) در آن ملک در عالم شعر نظیر نداشت ـ اکثر تذروان [ص ۲۹۱] بلند پرواز معانی را به سنان تیزی فکر صید می نمود ـ [و اصلش از ولایت است گویند در عالم فضل و کمال یگانهٔ روزگار بود (۲)] من اشعاره :

جلوهٔ زلف شاهدے برد دل رمیده را
پے بکجا برد کسے مرغ بشب پریده را
وه چه شود اگر شبے بر لب من نہی لبے
ما بلب ِتو بسپرم جان بلب رسیده را

این بیت از قصیدهٔ مشهورش بتحریر می آید :

عدل تقدیرے و تقدیر عدالت غلط است
زانکه تحقیق شد این مسئله در باب فدک

میرزا حسن ترمذی طالب

میرزا حسن ترمذی طالب تخلص در سلک امیران اکبر شاهی منتظم بود ـ هر گاه جذبهٔ معنوی بر مزاجش [ص ۲۹۲] غلبه کرد ترک منصب نموده منزوی شد و در سال هزار و هژدهم هجری روحش بمطلوب حقیقی پیوست ـ مثنوی

۱ـ کلمات الشعرا کے حاشیے (ص ۸۷) میں شاہ طاہر دکنی کے ایک قصیدے کا ضمنی ذکر ہے کہ اسی زمین میں خود سرخوش نے بخشی‌الممالک روح اللہ کی شان میں قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع تھا :

ترک شوخی نکند زان سبب استاد ازل
همچو اطفال کشیده ست فلک را به فلک

نتائج الافکار : آخر کار در ۹۵۴ھ اربع و خمسین و تسع مائه بسفر آخرت پرداخت (ص ۴۳۷)

۲ـ اضافه بر حاشیه

خورشید و فیروز و مثنوی طالب و مطلوب و دیوان شعر ازو یاد گار ماند :

بامیدیکه آن سرو روان من برون آید
نشینم بر درش چندان که جان من برون آید .

طالب آملی

طالب آملی (۱) از امرایان جهانگیری - داماد ستی خانم بود - و عندلیب هزار داستان بوستان سخن - همه معنی شناسان او را استاد نادره کار می دانند و در فن شاعری سخن او را مسلم می دارند - این مطلع او صندل قبول [ص ۲۹۳] بر جبین دارد (۲) من اشعاره :

به تن بو یا کند گلهائے تصویر نهالی را
بپا بیدار سازد خفتگان نقش قالی را
هر عضوتنت ساده تر از عضو دگر بود
موئے که در اندام تو دیدیم کمر بود
لب از گفتن چنان بستم که گوئی
دهان بر چهره زخمے بود به شد
هر سنگ که بر سینه زدم نقش تو بگرفت
آنهم صنمے بهر پرستیدن من شد
بدل چو آفت عشقے رسد زچاره چه سود
شکست شیشه نگردد ز مومیائی به
[ص ۲۹۴] کفر است در طریقت ما کینه داشتن
آئین ماست سینه چو آئینه داشتن
پروانه در قفس نشنید است هیچ کس
دل را ز چیست این همه در سینه داشتن

۱- کلمات الشعرا (حاشیه) : داماد شیخ حاتم از امرایان جهانگیری مرد صاحب کمال و صاحب طبع -

۲- کلمات الشعرا : این مطلع او در خاص و عام شهرت دارد -

حدیث تشنه لبی خواستم کنم اظهار
زبانم آب شد از شرم و در گلویم رفت
آبم بکن از شرم بنزدیکی آن کوے
شاید بغلط یار زمن دست بشوید

در تعریف اسپ می گوید :

سازد از موئے تنش گر بمثل خامهٔ مو
آن مصور که بود طبعش مائل بکسل
هم ازان رغبت رفتار که در طینت اوست
نقش از خامهٔ مو خود بخود آید بعمل [ص ۲۹۵]

[وقتے که جهانگیر بادشاه خدمت مهرداری بطالبا فرموده ، طالبا قطعهٔ گفته از نظر شاه گذرانید که این دو بیت ازان قطعه است :

چو مهر (۱) تو دارم چه حاجت بمهرت
مرا مهر داری به از مهر داری
(۲) ز شاعر ثنا خوانی آید نه خدمت
که بلبل غزل خوان بود نے شکاری(۳)]

رباعی :

با مر دم اهل هرکه مخلوط نشد — هم چون سخن بیهوده مربوط نشد
سر رشته عمر خویش بر آب روان — هر چند گره زدیم مضبوط نشد

"حشرش بعلی ابن ابی طالب باد" تاریخ وفات اوست (۴) -

۱- اصل : مهرے -
۲- آتش کدهٔ آذر (حاشیهٔ مصحح) ص ۸۸۰ میں یه شعر یوں درج ہے :
ز شاعر سخن سنجی آید نه خدمت — که بلبل نوا زن بود نے شکاری
۳- اضافه بر حاشیه -
۴- کلمات الشعرا (حاشیه) : تاریخ وفاتش "سرش (کذا) بعلی ابن ابی طالب باد" یافته اند -

نوازش خان رومی طالع

نوازش خان رومی طالع تخلص می کرد - و گاه گاهے مصرعے و بیتے می گفت :

وضع (۱) جہان چو تصویر ما را خموش دارد
چیزے نمی نوان گفت دیوار گوش دارد

میر عبدالعلی سبزواری طالع

میر عبدالعلی سبزواری طالع تخلص شاگرد عموے خود که میر سید محمد ثاقب [ص ۲۹٦] نام داشت ہست - شعر بسیار سنجیدہ می گوید ، لیکن چرخ کج رفتار ہیچ گاہ باہن ذرہ مند مساعد نشد :

حرف بیجائے عزیزان کے برد از جا مرا | می نماید اندکے اس خودنمائی‌ها مرا
طالع برائے رفتن از خود بیاد او | خوب آمدہ ز مصحف دل استخارہ ام

ملا نورالدین محمد ظہوری

ملا نورالدین محمد(۲) ظہوری ترشیزی (۳) حسن کلام ظہوری ظہورے دارد که محتاج بیان نہ - و فکر بلندش عروجے دارد که محتاج نردبان دلیل و برهان نیست - نامش نور الدین محمد است - در سنه نه صد و هشتاد و هشت‌هجری از خراسان بدکن آمد [ص ۲۹۷] و باتفاق مولانا ملک قمی در احمد نگر توطن گذید - و مولانا دختر خود را بنکاحش آورد - و در صحبت علی عادل شاه رتبهٔ تقرب

۱- اصل : وضعے

۲- حاشیے پر '' نامش نور الدین محمد است'' لکھ کر 'نامش نور الدین' کا ٹکڑا کاٹ دیا ہے -

۳- کلمات الشعرا (متن : ظہوری تبریزی - حاشیه : ترشیزی) در بیجا پور دکن علم خوش خیالی افراخته - در نظم و نثر ید بیضا داشت در نثر رسالهٔ نورس و خوان خلیل و گلزار ابراهیم بنام عادل شاه بسیار خوب نوشته - و در ساقی نامه که بنام برهان الملک گفته داد سخن وری داده . گویند وقتے که پیش نظام شاه در احمد نگر فرستاد نظام شاه باوجود نا آشنائی سخن چند زنجیر فیل پر از نقد و نفائس و جنس صلهٔ آن فرستاد - ظہوری در قهوه خانه نشسته بود تمباکو می کشید - فرستادها قبض الوصول خواستند قلم برداشت و بر پارهٔ کاغذ بر نگاشته : که تسلیم کردند تسلیم کرد -

حاصل نمود - دیباچهٔ نورس و خوان خلیل و گلزار (۱) ابراهیم از نتائج افکار آن درر گفتار است - و بر نظم و نثر یکسان اقتدار داشت - و دیوان کلانے مملو از اشعار آبدار دارد - و مثنوی نیز گفته - و ساقی نامه که بنام برهان نظام الملک نوشته و در آن جا داد سخنوری داده هرگاه پیش نظام شاه در حیدر آباد فرستاد، باوجود نا آشنای [ص ۲۹۸] سخن بادشاه کریم چند زنجیر فیل بر از نقد و جنس صلهٔ آن فرستاد - در قهوه خانه نشسته تنباکو می کشید- فرستاده ها قبض الوصول خواستند قلم برداشت و بر پرچهٔ قرطاس نگاشت که: تسلیم کردند تسلیم کردم-

گویند که دکهنیان بموجب دستور پر فتور و شیوهٔ نامرضیهٔ غریب کشی ملا ظهوری و ملک قمی را در هنگام هرج و مرج بقتل رسانید[ند] - من اشعاره:

[ص ۲۹۹] دل را ز نکهت گل و ریحان فراغ باد
عطر دماغ سوختگان دود داغ باد

ظهوری نامهٔ دادی بقاصد
چه حسرتها درو پیچیده باشی

گاهے بنکهتے نفسے راست میکنیم
این هم غنیمت است که ره برصبا نه بست

چشم را پردهٔ خود کرده بدیدن رفتم
پنبه در گوش نهادم بشنیدن رفتم

چراغ نیرگیٔ خانه ام زیاده کند
بروشنایٔ شب هاے تار سوگند است

من دانم و دل داند زین نامه چها دیدم
صد بار ز بے تابی وا کردم و پیچیدم

[ص ۳۰۰] به طفلی خدمت پیرے نکردم
به پیری خدمت طفلے ضرور است

۱- اصل : گلذار

دماغم بر نمی تابد فسون پیر و برنا را
جنونے کو که در زنجیر پیچم (۱) کوه و صحرا را
نشد از تند باد آه ماه و هفته طوفانی
سرشکے کو که گردابے کنم امروز و فردا را
دو عالم یوسف ما قیمت یک جلوه می خواهد
که می گوید جواب دعوی عین زلیخا را

ز شوق آنکه بپائے کسے فروریزد
چه بوسه ها که هوس جمع کرده در لب ما

عشق اگر تحفه پذیر است دل وجانے هست [ص ۳۰۱]
شوق اگر بر سر لطف است گریبانے هست

آن را که قبول عشق رد کرد
هر کار که نیک کرد بد کرد

از هفته و مه گر رود آدینه برون
شاید که رود ز خاطرت کینه برون
مهر تو توان فگند از سینه برون
گر عکس توان فگند ز آئینه برون

عرفی شیرازی

مولانا عرفی شیرازی نامش خواجه صیدی است ۔ ایزد فیاض چنان بردوش نظمش خلعت قبول پوشانیده که حله بافان سخن برشته تابی ازان محتاج اند ۔ هنگامے که عزم سوادهندوستان نمود اول بدکن آمد وچندے در [ص ۳۰۲] احمد نگر با مولانا قمی و ملا ظهوری صحبت داشت ۔ و باز متصل اکبر آباد در فتح پور سیکری که موطن قدوة العرفا شیخ سلیم چشتی قدس الله سره العزیز است ، و اکبر بادشاه آن را مکان بادشاه نشین قرار داده بود ، رسید ۔

چون سخن سنجان باریک بین کلامش را فروغ آگہی یافتند قدومش را

۱- دیوان ظهوری (نولکشور) ص ۲۷ : پیچد

گرامی داشتند ۔ مولانا در مدح حکیم ابوالفتح گیلانی و سپه سالار بحر نوال عبدالرحیم خانخانان قصاید فرا نوشت ، و از انعامات ایشاں بہرہ' فراواں برداشت۔

[ص ۳۰۲] و بعمر سی و پنج سالگی در سال نہصد و نود و نہ ھجری موافق سنہ سی و شش اکبری در لاہور شعلہ وار فرونشست ، و در مقبرہ' میر حبیب‌اللہ آسود ۔ شخصے از شاگردان او 'استادالبشر' تاریخ وفاتش یافتہ و ''ھادی' کلام عرفی شیرازی'' نیز تاریخ وفات اوست ۔ و از غایت اعتقاد کہ بجناب امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہہ داشت و بشوق دریافت سعادت خاک‌پاک مرقد منور ایں بیت در قصیدہ بصد اشتیاق گفتہ بود :

[ص ۳۰۴]
بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہند ہلاکم کنی اگر بتتار

میر صابر اصفہانی بعد از قریب سی سال نعش او را بہ نجف اشرف رسانید۔ چنانچہ رونقی ہمدانی تاریخش گفتہ :

یگانہ گوہر دریائے معرفت عرفی
کہ آسماں پئے' پروردنش صدف آمد
چو عمر او بسر آمد ز گردش دوراں
شکست ہر صف دل ھائے پر شغف آمد
بگوش چرخ رسانید حرف جانسوزے
کہ عمرم از تو چو در معرض تلف آمد
[ص ۳۰۵] بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم
فکند تیر دعاے و بر ھدف آمد
رقم زد از پئے تاریخ رونقی کلکم
بکاوش مژہ از ہند تا نجف آمد (۱)

۱- یہ عبارت کلمات الشعرا' (ترجمہ' عرفی) سے ماخوذ ھے ۔ شروع کے جملوں میں اخلاص نے کچھ رد و بدل کیا ھے ۔ کلمات الشعرا' کی اصل عبارت یہ ھے :

در سی و شش سالگی در سنہ تسع و تسعون و تسعمایہ' در لاہور در گزشت ۔

[اگلے صفحے پر]

دیوان قصایدش تازه گویان جادو فن را حیرت افزاست ، و کارستانیست از معانی - تاریخ اتمامش بدین منوال گفته :

این درج نکات سحری اعجازی (۱)
چون گشت مکمل ز رقم پردازی
مجموعه طراز صنع (۲) تاریخش گفت
اول . دیوان عرفی شیرازی

مصرع آخر تاریخ انجام است ، و موافق تعداد اعداد آن قصیده گفته ، و موافق عشرات [ص ۳۰٦] غزل ، و موافق میات قطعه و رباعی - و در تتبع دیوان عارف شیراز آهنگ دیوان ثانی داشت که دهانش صدف وار فلک بر بست - و مخزن اسرار و خسرو شیرین را نیز تتبع می کرد ، توفیق انجام نیافت - و در نثر رسالهٔ نفسیه که خطاب بنفس کرده ، هم ازو یادگار است -

گویند که هرگاه از شیراز بهند آمد فیضی او را پیش اکبر بادشاه برد - بادشاه بطور تحقیر از زبان بر آورده که عرفی همین است - فی الفور در جواب گفت پاره همین است و تتمهٔ آن می آید - بادشاه ازین سخن حدت طبع او دریافته فرمود که از اشعار خود چیزے بخوان - عرفی این دو بیت بخواند :

عرفی گلهٔ سر مکن که جائے گلهٔ نیست
توفیق رفیق هر تنک حوصلهٔ نیست
بر هر سر گام یوسفے در چاه است
صاحب نظرے لیک درین قافلهٔ نیست

[پچھلے صفحے سے]

و همان جا مدفون کردند - استاد البشر و هادیٔ کلام عرفیٔ شیرازی تاریخش یافتند - از اعتقاد که بجناب مفوض الطاعت علی المرتضیٰ داشت و بشوق دریافت خاک مرقد سرور این بصد اشتیاق گفته بود -

بیت قصیده :

بکاوش مژه . . . . الخ (کلمات ص ۴۳ ، ۴۴)

۱- کلیات عرفی (دیباچه) طبع تهران، ص ۳۲ : این طرفه نکات سحری و اعجازی
۲- ایضاً : قدس

گویند چون از عراق بهند آمد بخانهٔ حکیم ابوالفتح گیلانی می بود ، و عقد محبت فیما بین مستحکم ۔ حکیم بخانخانان ظاهر کرد که چنیں کسے تازه از شیراز آمده است ۔ و اجازت ملازمت [ص ۳۰۸] گرفت ۔ بعده ملا عرفی قصیده در مدح خانخانان گفته پیش خانخانان آمد و خواست که بخواند ۔ خانخانان در آں وقتے بر پلنگ طلا خوابیده بود لیکن بخواب نرفته ۔ گفت چون کوفت سفر باقیست باز متصدع خواهد شد ، بر ذمهٔ جانبین دین است ۔ هفتاد هزار روپیه همراه کرده گفت که بحمام رود و بیآساید ۔

اشعاوش که بسیار اشتهار دارند از یں ممر بر چند بیت اختصار نمود ۔ این بیت خوش نگاه میان ناصر علی است :

[ص ۳۰۹] من ازین درد گران مایه چه لذت یابم
که باندازهٔ آن صبر و ثباتم دادند

غافل مرو که تا در بیت الحرام عشق
صد منزل است و منزل اول قیامتست

مجو سعادت طالع ز من که فرصت رفت
چو سر بریده شود ، سایهٔ هما چه کند

هزار گونه مراد محال می طلبی
تو خود بگو که اجابت هایں دعا چه کند

مدار صحبت ما بر حدیث زیر لبی است
که اهل هوش عوام اند وگفتگو(۱) عربی است

[ص ۳۱۰] قدم برون منه از جهل یا فلاطون شو
که گرمیانه گزینی سراب و تشنه لبی است

من بلبل بهشتم اما دریں گلستاں
در روز بد نهادم بنیاد آشیاں را

چناں با نیک و بد عرفی بسر کن کز پس مردن
مسلمانت بزمزم شوید و هندو بسوزاند

۱- تکمیل از دیوان عرفی (طبع نولکشور)

بلند همتیٔ ذره داغ میکندم
وگرنه ذره کجا ، مہر آفتاب کجا

یارب تو نگہدار دل خلوتیان را
کاں مغبچه مست است و در صومعه باز است

قصیده در نعت حضرت گفته ـ و این بیت که هم در نعت است و هم متضمن بر فخریهٔ خود در آں قصیده گفته :

سایهٔ من همچو من در ملک هستی امتت
سایهٔ تو در عدم پیغمبر همتاے من

عاشق هم از اسلام خرابست و هم از کفر
پروانه چراغ حرم و دیر نداند

مگو که نیست گنه گار تر ز من عرفی
که این حدیث گراں مایه لاف یکتائی است

ز بت ، نه گوشهٔ چشمے ، نه چین ابروے
بحیرتم که دل برهمن ز کف چوں شد

شادماں بیگ و زین خان کوکه
هر دو معشوق و عاشق دگرند
روز و شب همچو شیشهٔ ساعت
ساعتے زیر و ساعتے زبر اند

ناصر علی

[ص ۳۱۲] بخیال بندی و معنی آفرینی متجلی میاں ناصر علی (۱)

۱ـ کلمات الشعرأ (ص ۴۷) : از اهل هند صاحب سخن بلند خیال معنی یاب ذی همت و کمال همچو او برنخاسته (حاشیه): سوائے شعر حسن خلق و خدا شناسی و همت و سخاوت و استعنا و بے پروایٔ بمرتبهٔ دارد که در هیچ مخلوقے دیده نمی شود چنانچه خود گفته ... (متن ـ ص ۷۵) : در آخر عمر باشاره مجذوبی در دار الخلافه بدعویٔ قطبیت اقامت ورزید ـ جنوں ساخته بهم رسانید دم از دوستیٔ

[اگلے صفحے پر]

از اهل هند همچو (۱) شاعر خوش لفظ و خوش خیال تا حال بعرصهٔ ظهور نیامده ـ مردے بود باستغنا و علو همت موصوف ـ و طائر خیالش در هوائے فصاحت به بلند پروازی معروف ـ اشعار آبدارش از آفتاب مشهور تر است ـ چنانچه خود [از روے لاف (۲)] نواسنج این معنی گردیده :

هر بیت من برابر دیوان صائب است
از بسکه اهل طبع مکرر نوشته اند

[ص ۳۱۳] زاد گاه او لاهور است ، در سنه یک هزار و یک صد هجری از سرهند بیجاپور رفت ، و در لشکر ظفر اثر شاه عالمگیر با ذوالفقار خان امیرالامرا خلف جمد الملک اسد خان پیوست ـ و قصیده در مدح آن خان قدردان انشا کرد بنظر گزرانید که مطلع آن قصیده این است :

اے شان حیدری زنشان تو آشکار
نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

خان قدر دان بجایزهٔ خلعت فیل و زر نقد خطیر امتیاز داد ـ چون آن سخنور عالی فطرت از بسکه غنائے معنی داشت و اسباب صورت در چشم [ص ۳۱۴] آن دقت آفرین آزاده منش آن قدر مرغوب نمی نمود ، تمام مبلغ تابخانه رسیدن بذل و ایثار فرمود ـ و باز هند معاودت نموده در دارالخلافه

[پچھلے صفحے سے]

بو علی قلندر می زد ـ ششم مبارک رمضان سنه یک هزار و یک صد و هشت درگذشت فقیر تاریخش یافته ـ

وارسته علی همت بے پروا ... الخ ۰

(ص ۷۷) مرد پیرے از یاران او نامش بردن باعث ریش خند او تا ابد است در مطلع این مثنوی (در زمین یوسف زلیخا) تصرف کرده پیش فقیر خواند ـ فقیر آنچه در جوابش گفته بنظم در آورد ـ

علی آن پیشوائے خوش خیالاں . . . الخ

۱ـ قلم زده ' او '

۲ـ اضافه بر حاشیه

شاهجهان آباد بلباس قلندری سکونت اختیار کرد ـ و بتاریخ ششم رمضان سنه یک هزار و یک صد و هشت در گذشت ، و در راه روضهٔ متبرکهٔ حضرت نظام‌الدین مدفون گشت ـ تاریخ رحلتش مرزا سرخوش چنیں گفته :

[ص ۳۱۵] وارسته علی ز همت بے پروا
از راحت و رنج دهر مستغنی رفت
دائم چو توجهش سوے معنی بود
دل کنده ز صورت کدهٔ هستی رفت
سرخوش ز خرد سال وفاتش پر سید
گفت آه علی بعالم معنی رفت (۱)

گویند شخصے پیش ناصر علی آمده نشت بچهٔ ریشش سفید شده بود ، ایشان بسوے او دیده گفتند که صاحب ظاهرا تف بریش همیں معنی دارد ـ

گویند روزے مرد پیرے از [ص ۳۱۶] یاران قدیم او که نامش بردن باعث ریش خند او تا ابد است ، در مطلع ایں مثنوی تصرفے کرده پیش مرزا سرخوش خواند و سرخوش آنچه جواب او را بنظم آورده در ایں جا بزبان قلم می آید :

علی آں پیشوائے خوش خیالاں
چو شد در مثنوی کلکش در افشاں
رساندش پایهٔ معنی بمعراج
بود ایں مطلع او درةالتاج
الهی ذرهٔ دردے بجاں ریز
شرر در پنبه زار استخواں ریز
[ص ۳۱۷] در ایں مطلع نمود از احمقیها
یک از پیران جاهل دخل بیجا

۱ـ اس کے بعد یه جمله لکھ کر کاٹ دیا ھے : دلگیر از رحلت- ناصر علی تاریخ وفات اوست ـ

که باشد پنبه نرم و استخوان سخت
کجا این نرم را نسبت بآن سخت
بتغییر حروف (۱) چند فی‌الفور
درستش کرد در زعم خود این طور
الهی ذرهٔ درے به تن ریز
شرر در پنبه زارے موے من ریز
من این حرف از زبانش چون شنفتم
چو گل خندیده بر رویش بگفتم
چرا این حاجت از حق خواهی اے یار
توانم کرد من هم این قدر کار
[ص ۳۱۸] که مشتے خس بر آتش بر فروزم
همه موے سر و ریشت بسوزم
سزائے آنکه در شعرے بلندے
کند زین گونه دخلے نا پسندے
مناسب تر درین هنگامه افتاد
بر اهل سخن این شعر اوستاد
چراغے را که ایزد برفروزد
هزل گو تف زند ریشش بسوزد

اشعار آبدار آن سر حلقهٔ سخنوران هندوستان از بسکه مشهور اند ، بنا بران بر چند بیت اکتفا نمود - من غرر نظامه :

[ص ۳۱۹] محبت جادهٔ دارد نهان در خلوت دلها
چو تار سبحه گم گردید این ره زیر منزلها
نمی باشد نشانی غیر درویشی کریمان را
که افشاندن تهی می سازد آخر دست دهقان را

۱- کلمات : حروفے -

می توان کردن به نرمی رام از خود رسته را
پنبه سد راه می گردد شرار جسته را
با تو در یک پوست گنجیدم چو بادام دو مغز
جا بود در سینهٔ هم. دل بدل پیوسته را

علی در بحر حافظ دست و پاے می زند امشب
"کجا دانند حال ما سبکساران ساحلها"

[ص ۳۲۰] اگر آن هلال ابرو بمیان نشسته باشد
مه نو بچشم مردم مژهٔ شکسته باشد
آب چون در روغن افتد ناله خیزد از چراغ
صحبت ناجنس را باشد ثمر آزار ها
دشمن خود ساختم شیخ و برهمن را علی
بسکه از شوقش گسستم سبحه و زنار را
مرا ترک طلب سرمایهٔ صاحب کلاهی شد
چو کجکول گدائی واژگون شد تاج شاهی شد

[ص ۳۲۱] چو آزردی دلے را از مکافاتش مشو غافل
که گردد آهنش شمشیر چون کشتی تباهی شد
ز سختی‌هاے چرخ کینه جو از بسکه دل تنگم
نمی آید نفس از سینه بیرون چون رگ سنگم
همت درویش از منعم شدن کمتر شود
از چکیدن باز ماند قطره چون گوهر شود

مرزا ابوالمعالی عالی .

مرزا ابوالمعالی عالی در عهد فرخ سیر وزارت خان خطاب داشت در ابتدائے سلطنت بخدمت دیوانی تن امتیاز یافت ـ مرد سخندان و عالی فهم سخنور دوست بود ـ [ص ۳۲۲] اکثر درخانه اش مجمع شعرامی شد ، و با همه کس برفق و مدارا پیش می‌آمد ـ دیوانے پر از قصاید و غزل و رباعی یادگار بر صفحهٔ روز کار گذاشته ـ من اشعاره :

تنها نه خال عارض جانانه خوشنماست
هر جا که سبز می شود این دانه خوشنماست

تا خطش بر چهرهٔ چون ماه رنگ هاله ریخت
از سر نو حسن طرح شعلهٔ جواله ریخت
فتنه برپا چون نگردد کز سر جادوگری
سرمهٔ کز چشم باقی ماند بر دنباله ریخت

میر طاهر علوی

[ص ۳۲۳] میر طاهر علوی استاد طور خود بود ، و نزد همه سخنوران شاعری او مسلم الثبوت است ـ در عهد عالم گیر از ولایت بکشمیر رسید ، و همانجا پیمانهٔ عمرش لبریز گردید ـ من اشعاره :

آہے ؟ سمند تن ؟ شده از جان شکوهتم
مسند بباد داده سلیمان شکوهتم

قصیده که در اول دیوان دارد دو سه بیت ازان می نگارد :

از هر دو دیده مطلع دیوان حیرتم
بسمل تر (۱) از نگاه پریشان حیرتم
[ص ۳۲۴] طراح باغ جلوه تمنائے کیستم
مد نگه طناب خیابان حیرتم

گاہے باین زبان هم می فرمودند :

در کمان ابروش شد نیم کش تیر نگاه
کند دیگر در نظر دارد نگه دزدیدنش
از شکست رنگها سیر بهار زعفران
میکند ، پیداست هر دم زیر لب خندیدنش

---

۱ - بسم الله ؟ بسمل تر ؟

سید محمد نجفی عتابی

سید محمد نجفی عتابی تخلص از زبان عربی و فارسی نیک آگاه بود، و در معنی یابی و خوش فکری یگانهٔ عصر خود - چندے از واژونی طالع بحکم اکبر بادشاه در قلعهٔ گوالیار زندانی ماند - هرگاه نجات یافت بدکن شتافت - دیوانے دارد مملو [ص ۳۲۵] از اشعار آبدار - من اشعاره :

در گلخن هوس دل فرزانه سوختم
قندیل کعبه بر در بت خانه سوختم
گل‌بزبر لب نمی‌دانم چه می‌گوید که باز
بلبلان بینوا را در فغان می آورد

رباعی :

آن را که قضا ز خیل عشاق نوشت
آزاد ز مسجد است و فارغ ز کنشت
آزادهٔ عشق را چه هجران چه وصال
از خویش گذشته را چه دوزخ چه بهشت

شیخ عبدالعزیز عزت

فاضل عالی فطرت، شیخ عبدالعزیز عزت(۱) جامع کمالات عقلی و نقلی بود - او ز شاگردان والد خود که عبدالرشید نام [ص ۳۲٦] داشت بود -

---

۱- کلمات الشعرا : (حاشیه ترجمهٔ عزت) در علم معقول و منقول سرآمد زمانه بود (متن) توجه بادشاه جوهر شناس در صدد تربیت او مصروف بوده است - می خواستند که بمرتبهٔ سعدالله خان رسانند - زندگانیش وفا نکرده (لیکن حاشیه میں یوں ہے) بادشاه دین پناه اورا می‌خواست که بپایهٔ سعدالله خانی رساند - بمنصب هفت صدی و خدمت داروغگی عرض مکرر که نواب سعد الله خان مرحوم در اوایل داشت سر افراز ساخته - همیشه توجه بادشاهانه در صدد تربیت او مصروف بود که بقضاے الهی ودیعت حیات سپرده -
نتائج الافکار : وفات ۱۰۸۹ھ

همت خان او را در پیش گاه خلافت در عهد شاه عالم‌گیر پیش آورد - و چندے بخدمت داروغگی عرض مکرر مامور ماند - بادشاه جوهر شناس از روے قدردانی می خواست که او را بدرجهٔ سعد الله خان رساند ، که دریں اثنا پیمانهٔ عمرش لبریز گردید - گاه گاهے بخیال شعر نیز پرداخت - و طرهٔ اشعار را بشانهٔ قلم می آراست ، لهذا نام مبارکش در زمرهٔ شعرا نگارش یافته - گویند فاضل مستعد و خیلے عالی همت بوده مراتب وزارت [ص ۳۲۷] و امارت اصلا پش او قدر نداشت - من اشعاره :

شعار (۱) کار کشایان ملال خاطر نیست
گره چگونه کند جا بر ابروے ناخن
ز جوش دل چه نویسم که جوش بے تابی ست
ز درد دل چه نگارم که نامه سیمابی ست
سرگذشت (۲) خویش اے مجنوں ز ما پنهاں مدار
از کسے ما نیز وقتے داستانے داشتیم
بعد ما معنی رسے خواهد گریست
گر نگرید کس کسے خواهد گریست
[ص ۳۲۸] گرچه ما بے ابر می گریم زار
ابر بے ما هم بسے خواهد گریست

شیخ عطا الله عطا

شیخ عطا الله عطا تخلص (۳) متوطن امروهه ، سخن را بلطافت و ظرافت اکثر روا می نمود از شاگردان مرزا بیدل صاحب بود - من اشعاره :

قلم من ز روضهٔ الشهدا سر کند سرگذشت شمشیرش

۱- تکمیل از روے کلمات الشعرا

۲- اصل : سرگذشتے

۳- کلمات (ص ۸۰ حاشیه) میں ایک سطر موجود ہے ، اخلاص نے استفاده نہیں کیا -

چشم مستش آیدم تا در نظر
می نماید جام صهبا در نظر
شب بیاد رویش از طوفان اشک
دیدهٔ ما داشت دریا در نظر
تیر سر داد بمسجد رندے
گفت یا شیخ صدا را عشق است

وقتے که مرزا بیدل از روے عنایت قلمدان باو عطا کردند عطا این رباعی انشا کرد ۔ رباعی :

[ص ۳۲۹]
بیدل شه اقلیم کمال هر فن
از گوشهٔ چشم دل نظر داشت بمن
از روے عنایتے قلمدان و بیاض
فرمود مرا وزارت ملک سخن

بعمر چهل سالگی در شاهجهان آباد ازین جهان فانی در گذشت ۔ راقم این اوراق " آشنا رفته حیف " [۱۱۳۰ھ] تاریخ وفاتش گفته ۔

حکیم محمد حسن شیرازی عارف

حکیم محمد حسن شیرازی عارف تخلص بحکم جهانگیر بادشاه تا دو سال زندانی ماند ۔ شاعر عالی فطرت و سخنور صاحب قدرت بود ۔ و از جوهر حلم و تمکین و کم گوئی متجلی ۔ و از [ص ۳۳۰] کج خرامی هاے فلک کج رفتار شورشے در مزاج داشت ۔

چندانکه زلف تست دراز است کار من
از یکسر است زلف تو و روزگار من
توان مهرهٔ افعی از کام افعی
بانگشت پا سهل بیرون کشیدن
اگر پیکر مور گردی نیابی
ز انبار این ده خدایان یک ارزن

عامل

عامل(۱) شاگرد صائب تبریزی است ـ و فکر شعر درست داشت :

[ص ۳۳۱] چه یاری بهتر از کردار خیر اندیش می خواهی
چه حسنے خوشتر از حسن سلوک خویش می خواهی

عارف لاهوری

عارف لاهوری(۲) این شعر مشعر احوال اوست :

زیر قدم خاک نشینان خرابات
فرشے(۳) نبود شسته تر از چادر مهتاب

خواجه عبدالرحیم عابد

خواجه عبدالرحیم عابد تخلص(۴) مغل تورانی ولایت زا بوده ـ هرگاه (۵) اتفاق دیدنش شده با دل بریاں و دیدهٔ گریان بنظر آمده ـ حالے از شوق دنیا ربوده و سوز و گدازے داشت ـ من اشعاره :

بیک پا ایستاده در چمن سرو
باین آزادگیها بندهٔ کیست ؟

[ص ۳۳۲] از و ناز و عتاب و عشوه و نا مهربانی ها
ز من عجز و نیاز و بندگی و جانفشانی ها

بخون دیدهٔ عاشق کجا آلوده می سازد
کف پاے که از رنگ حنا دارد گرانی ها

رباعی :

الله چو گفتی ز سوی الله مگو منزل چو رسیدی سخن از راه مگو

۱- از شاگردان رشید مرزا صائب بوده ـ اوست : چه یاری بهتر .... الخ
۲- کلمات الشعرا میں حال موجود ہے - اخلاص نے اس سے کچھ نہیں لیا۔
۳- اصل : فرش
۴- عابد کا حال کلمات الشعرا (ص ۸۱ حاشیه) میں درج ہے لیکن اخلاص نے اس سے کچھ نہیں لیا -
۵- قلمزد : اکثر چون

یک نکتهٔ علم است بمعنی عابد　　آ که چو شدی خواه بگو خواه مگو

در دهلی رسمے ست دیرین که در ماه صفر بروز آخری چهار شنبه اکثر مردم این شهر بلک اگر تمام شهر مبالغهٔ بگویم جا دارد برائے طواف روضهٔ متبرکهٔ حضرت [ص ۳۳۳] سلطان المشائخ می روند ـ در سنه یکهزار و یک صد و نه [۱۱۰۹ ھ] بروز مذکور رفته بودند ، بوقت معاودت بین العصروالمغرب بسبب کثرت هجوم در لعل دروازه که مدخل و مخرج شهر کهنه است . بسیارے از مردم تلف شدند ـ و بعضے را دست و پا شکسته شد ـ عابد این مصرع در تاریخ این واقعه گفته : بروز چار شنبه مرگ انبوه ـ

ملا علی قلی صفهانی

ملا علی قلی صفهانی بهند نیامده ـ خوش فکر و معنی یاب می نماید :

[ص ۳۳۴]　　نشد که از سر ما فتنه دست بردارد
بهر دیار که رفتیم آسمان پیداست

علاء الدین

علاء الدین اهل وجد و حال بود از علم موسیقی اهل هند بسیار آشنا :

ندانم آن گل رعنا چه رنگ و بو دارد
که مرغ هر چمنے گفتگوے او دارد

نشاط باده پرستان بمست ها پر سید
هنوز ساقیٔ ما باده در سبو دارد

علی عظیم عظیم

علی عظیم عظیم (۱) خلف و شاگرد شیرازه بند مجموعهٔ خیال (۲) هاے خفی و جلی میان ناصر علی است ـ فکر رسائے دارد ، و دیوان مختصرے ظاهرا ترتیب داده باشد (۳) :

۱- نتائج الافکار : وفات ۱۲۰۰ھ

۲- 'معنی' لکھ کر قلم زد کیا ہے -

۳ قلمزده: از اوقات شریفش در فکر صید تذرواں بلند پروازے .... که بال افشانی آن ها بعالم روحانی است مصروف .

[ص ۳۳۵] هر که شد محو تو از قبله ندارد خبرے
شش جهت چون گہر افتاد جبیں سائے دل

محمد هاشم عاجز

محمد هاشم عاجز مردیست طالب علم جید و از علوم رسمی بهره مند و از معقول و منقول آشنا - بر مزاجش وارستگی و بی تعلقی غالب است ، هر جا که گل رخے می بیند ببلبل آسا بناله و فغان می آید(۱) و هر جا سرود می‌شنود مانند تار طبنور آهنگ آن مقام [ص ۳۳۶] می کند - حسب اتفاق فکر شعر هم می نماید -

شب که دل از یاد رویش گریه جوئبار داشت
هر سرشک از دیدهٔ من جلوهٔ گلزار داشت (۲)
حباب وار ز دل تا هوا برون نشود
چگونه دیده بروے تو باز می گردد

عبدالعزیز جونپوری عزیزی

عبدالعزیز جونپوری عزیزی تخلص در وطن خود تولد یافته ، و در عهد جهانگیر بادشاه فی‌الجمله از علم رسمی (۳) بهره برداشته :

[ص ۳۳۷] پئے تسلیٔ دل کلک مانیٔ فکرم
ا در بصفحه کشد نقش روے نیکویش
هنوز چهره با تمام نا رسیده بجان
خدنگ غمزه رسد از کمان ابرویش

عالمی شیرازی

عالمی شیرازی از بصارت چشم معذور بود ، و در هزل و لطیفه گوئی نظیر نداشت- وقتے که غزالی به شیراز رفت اعزه براے امتحان غزالی غزلے

۱- بگردش می گردد (قلمزده)
۲- اصل : گلذار
۳- قلمزده : نیز

طرح کردند ـ بسبب درد دندان از غزالی در گفتن غزل توقفے شد ، عالمی برائے او این چند ابیات گفت :

غزالی آن سخن پرداز کاندر شاعری خود را
چنان داند که شاگردند خاقانی و حسانش
[ص ۲۳۸] به شیراز آمد و وقتے که شعرے درمیان آمد
ز بہر امتحان تکلیف فرمودند یارانش
بہانه درد دندان کرد و درمان باشدش کندن
اگر خواهد که گوید شعر باید کند دندانش

مرزا جعفر عاشق

مرزا جعفر عاشق تخلص طبعش به هجو میل تمام دارد ـ من اشعاره :

می شود از گریه در بزم جنون عشرت مرا
قطرهٔ اشک است گوی اختر دولت مرا

وقتے که مرزا ابو تراب غبار بخدمت وقائع نگاری احمد آباد امتیاز داشت عاشق قصیده در هجو غبار [ص ۲۳۹] گفته بود (۱) این بیت ازان قصیده است:

هنوز طفل مزاجست می کند صد بار
همیشه زنگله بازی بالت اغیار (۲)

غبار بشنید و گفت لایق من نیست که در برابر هجو هجو بگویم ،

۱ـ مرزا ابو تراب غبار کے بارے میں سرو آزاد کا اقتباس قابل ملاحظه ہے :

جعفر عاشق تخلص در هجو غبار قصیدهٔ پرداخت غبار باین رباعی جواب ادا کرد

گویند که هجو کرد مارا جعفر — شیرین و لطیف همچو شیر و شکر
صد شکر که آنچه عیب ما بود غبار — امروز بجاے دیگرے گشته هنر
(سرو آزاد ، ص ۱۲۵ ، ۱۲۶)

۲ـ قیاسی تصحیح ـ

چیزے صله خواهم داد - اتفاقاً بر سر راه هر دو عزیز دو چار شدند - غبار قدم از جادهٔ اهلیت بیرون نهاده ، از دست پاجیان روا دار بے حرمتی عاشق گردید -

عروجی

عروجی [از امرا زادهاے هندوستان (۱)] بعروج طبع معروف بود - [و در سلک ملازمان جهانگیر بادشاه منسلک (۱)] و خط نستعلیق درست [ص : ۳۴۰] می نوشت (۲) آخر ترک منصب نموده بفقر و قناعت در ساخت - در وزن مخزن اسرار مثنوی گفته مسمی بمعدن ابرار - و دیوان اشعار نیز دارد - من اشعاره :

بوصل یار تمناے دل چناں گرم است
که حرف شعله صفت برسر زباں گرم است

روز محشر نمونهٔ روزم
شب یلدا نشانهٔ ز شبم

[ص ۳۴۱] ز خون دیدهٔ من گر محیط یاد آرد
شود بکام صدف در چو لعل رمانی

گه کافر دیر و گاه زاهد کیشم
گه خویش مبیں و گاه دور اندیشم

گه مرهم ریش و گه سراسر ریشم
گه دشمن خویش گه بدشمن خویشم

سید لطف الله عاصی

سید لطف الله عاصی در عصر عالم گیر بادشاه بود - طبع شعر درست داشت - این شعر ازوست :

از پے جاه خراب ایں همه نتواں بودن
چشم وا کن که بخواب ایں همه نتواں بودن

۱- اضافه بر حاشیه

۲- قلمزده عبارت : مے نوشت - از امرا زاده هاے هندوستان بود و خود نیز در سلک ملازمان جهانگیر بادشاه منسلک بود -

نعمت خان عالی

نعمت خان عالی (۱) در عهد بهادر شاه بخطاب دانشمند خان امتیاز یافته بود - در عربی و فارسی [ص ۳۴۲] دستگاه عالی داشت - صاحب چندین تصنیفات است - مرد ظریف مزاج و خوش طبع بوده - در سنه سیوم (۲) بهادر شاه سفر آخرت گزید - رباعی :

عالی زغمت اشک بریزد چه کند
وز همچو تو شوخے بگریزد چه کند
پیراست و تو پشت می کنی جانب او
انصاف بده که بر نخیزد چه کند

تاریخ مرثیهٔ بادشاه زادهٔ خجسته شیم محمد اعظم گفته و آن این است :

شهزادهٔ دیوانه وش و اژدر دم
حقا که نبود هیچ از رستم کم
[ص ۳۴۳] دیدند سر و تنش جدا گشته ز هم
گفتند همه اے محمد اعظم

خواجه معین الدین غازی

خواجه معین الدین غازی تخلص در ایام بادشاهزادگی در سرکار شاه عالم بخدمت قوربیگی ممتاز بود - این شعر ازوست :

پیوستن و گسستن فرقے ندارد اصلا
با یار آشنا شد هر کس ز خود جدا شد

۱- کلمات الشعرا مین ذکر ص ۷۹ ، ۸۰ حاشیه میں موجود ہے اخلاص نے اس سے استفادہ نہیں کیا -

۲- اصل : سیوئم

ملا طاهر غنی

آراستهٔ باطن و ظاهر ملا طاهر ، غنی تخلص (۱) متوطن کشمیر ، نغمه سرای بوستان سخن بوده - و زمزمه سرای چمنستان این فن - تا حال همچو شاعر معنی بند ازاں خطهٔ [ص ۳۴۴] دلپذیر برنخاسته ، بلک از سواد هند نیز بر نیامده - زمین سخن رنگیں کردهٔ اوست ، و بحر شعر آب دادهٔ او - در غزل نویسی سواد از چشم غزالاں باج می گیرد ، و در قصیده از قصد هاے بلند بر سر سخن تاج می گذارد - در رباعی مربع نشین چار بالش او رنگ سخن است - و مصراعش مانند طرهٔ زلف غیرت خوباں دلآویز - و هر مطلعش بساں (۲) بیت ابروان گلرویاں فتنه انگیز - دیوانش که دیوانیان [ص ۳۴۵] سخن را دستور است ، از اول تا آخر سیر کردم - مصرعے بنظر نیامد که خالی از ادا و تشبیه و ایهام باشد - غرضکه خلعت شاعری بر قامت آن سخن آفرین زیبا و رساست -

[گویند در حالت نزع ملا طاهر غنی شعراے کشمیر بخانه او جمع آمدند - غنی گفت که چراغے بودم که می باید خاموشم شد شمارا بخدا می سپارم - شاعرے گفت اے مولوی بگذار تا انگشتے بچراغت چرب کنیم شاید بکار عمرت آید و نور حیات بیفزاید (۳)] -

---

۱- کلمات الشعرا : صاحب طبع عالی بوده ، پایهٔ سخنوری را بدرجهٔ کمال رساند ، از خطهٔ کشمیر بلکه تمام اقلیم هند همچو او سخنورے خوش خیال نازک بند معنی یاب بر نخاسته ... اکثر شعرش بطرز ایهام است .

نتائج الافکار : وفات ۱۰۷۹ھ

۲- قلم زده : مانند

۳- یه اور مندرجه ذیل عبارت حاشیے پر درج هے :

روزے در قهوه خانه مرزا محمد علی صائب اشعار خود خواندن آغاز کرد - اتفاقاً پسرے که اشعار متقدمین بسیار در خاطر داشت ، برابر هر شعر شعر خواند ، و گفت این همه اشعار که می خوانی سرقه است - میرزا او را پیش طلبید و در گوشش این مصرع خواند : مضمون نه بسته بند تنبان شماست؟

روزے ظفر خان احسن براے دیدن شاعرے آمد - دید که خوابیده است ،

(اگلے صفحے پر)

و "غنی" تاریخ ابتدائے شعر گفتن و تخلص یافتن آن عالی فطرت(۱) است لیک در عین شباب طائر روحش صید چنگل شاهین قضا گردید ـ من اشعاره :

دمے که یار گذارد قدم بخانهٔ ما
سزد که کعبه شود سنگ آستانهٔ ما
[ص ۳۴۶] بردند پس از مردن ما معنی ما را
صد شکر که ماند است بیاران سخن ما
از مالدار کیسهٔ خالی است یادگار
گوید بگوشم این سخن پوست کنده مار(۲)
بریزش زیر بار خود در آور ساده لوحان را
بیفشان سیم و زر چندانکه بر دارند داماں را
ز شوخی پشت بر من کردی و بر رو نمی آرم
کنی گر جانب من پا دراز آن نیز بردارم
که نظر بر غیر دارد گاه بر ما چشم او
بسکه بیمار است می افتد بهر جا چشم او
[ص ۳۴۷] سعی بهر راحت همسایها کردن خوش است
بشنود گوش از برائے خواب چشم افسانها
کاسهٔ خود پرمکن زنهار از خوان کسے
داغ از احسان خورشید است بر دل ماه را

(بسلسله صفحهٔ ماسبق)

بضرب پا بیدارش کرد ، و گفت بر خیز ! فلاں غنیم را کشتم و بسزا رساندم ـ شاعر گفت که کشتنِ غنیم کار سپهداری است اما لکدزدن کار خر است؟

گویند امیر تیمور از خدمه رکاب مصاحبه داشت ـ شاعره دولت نام اتفاقاً یک چشمش بے نور شد ـ روزے بادشاه بسویش نگاهے کرد و گفت دولت کورے نمی باشد جواب داد که اگر دولت کور نمی بود ملازمت پادشاه لنگ اختیار نمی کرد ـ

۱ـ ماخوذ از کلمات الشعرا
۲ـ تصحیح از دیوان غنی طبع نولکشور ص ۱۰

رفت مانند شیشهٔ ساعت (۱)
عمر من در نفس شماریها

روزی مار نیست غیر از خاک
خاک بر فرق مالداریها

هست چون ناخنم نگین بے نقش
ننگ دارم ز نامداریها

[ص ۳۴۸] حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر
دام همرنگ زمین بود گرفتار شدیم

کند در هر قدم فریاد خلخال
که حسن گل رخان پا در رکاب است

می شود پیمانه پر از کثرت نعمت غنی
خضر وقت است هر که قانع شد بقوت لایموت

عزت شاه و گدا زیر زمین یکسانست
می کند خاک برائے همه کس جا خالی

لاف موزونی زند مانند سرو
هر که خواهد صفحهٔ از بوستان

بود کج بحث چون حرف غلط در صفحه مجلس
نخیزد گر بتحریک زبان از تیغ بردارش

[ص ۳۴۹] بسے مشکل بود دل کندن از خوبان پس از الفت
هنوز آب از غم یوسف بچشم چاه می گردد

نهان شد شمع در فانوس و بے تاب است پروانه
بتقریبے مکان خویش خوبان گرم می سازند

مکن با دوستان از آشنائی اختلاط افزون
در آید چون درون دیده مژگان خار می گردد

۱- تصحیح از دیوان غنی ص ۱۹

شعرے دگران را همه دارند بخاطر
شعرے که غنی گفت کسے یاد ندارد

علی رضائی مشهدی غزالی

علی رضائی مشهدی غزالی [ص. ۳۰] تخلص در سخن گوئی و سخن سنجی صاحب قدرت بود ، و از مذاق اهل توحید آگاه . و از اشعار متقدین و متاخرین آن قدر یاد داشت که شرح آن نتوان داد - و از حسد و حقد اقارب که الاقارب کالعقارب گفته اند ، بروے تهمت الحاد بستند ، و قصد بجان کشتن کردند - از وطن جدا شده بدکن آمد (۱) - خان زمان علی قلی خان بیگ عیسی [غربیی ؟] (۲) او را شنیده این قطعه با یک هزار روپیه همراه کسان خود [ص ۳۰ ب] فرستاد ، در آخر قطعه اشارتے بطریق تعمیه بتعداد زر مرسوله نمود-

قطعه :

اے غزالی بحق شاه نجف ... بسوے (۳) بیدلان محزون آی
پایهٔ تو چه داند آن جا کس(۴) ... سر خود را بگیر و بیرون آی (۵)

۱- آتش کدهٔ آذر (حاشیه مصحح): چون یکے از معاصران خویش بنام نوری دندانی را هجوے گفت، مشهور تر شد - ولے بمناسبت تهمت زدگی بروزگار شاه طهماسپ از ایران بدکن گریخت و در آن جا نیز اختر مرادش چنانکه باید درخشندگی نیافت تا آنکه حاکم جونپور بنام علی قلی خان ، مشهور بخان زمان که از اکابر اعیان دربار اکبری بود قدر او ندانست (ص ۲۸۱)

۲- به ظاهر عیسی هی لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے - عیسی تخلص خان زمان علی قلی خان کا کہیں دیکھنے میں نہیں آیا - میر ہمت خان عیسی ایک امیر ضرور تھے لیکن وہ بخشی اول دورهٔ عالمگیر میں ہوئے ہیں (بزم تیموریه، ص ۲۸۰) سیاق عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کا تعلق جملے کے اگلے حصے سے ہے - غزالی کی دکن میں بے قدری کی بنا پر قیاس ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ غریب‌الوطنی (غریبی) یا پھر مفلسی یا قلاشی قرار دیا جائے - بہر حال قرأت مشکوک ہے -

۳- خزانهٔ عامره : که سوے

۴- خزانهٔ عامره ، نتائج‌الافکار : چون که بے قدر گشتهٔ آن جا

۵- نتائج‌الافکار : سر غزالی که غین است کنایه به هزار روپیه نموده -

مولانا از خان مذکور صله ها گرفت و نعمت هاے فراوان یافت ـ بعد قتل او بپارگاه اکبر بادشاه رسید ـ بادشاه قدردان از روے قدر دانی بخطاب ملک‌الشعراءُ امتیاز بخشید ـ و در گجرات غزال [ص ۳۰۲] روحش در سنه نهصد و هشتاد [۹۸۰ھ] هدف ناوک قضا گردید ـ

مصنفات مولانا بسیار است ـ دیوان قصائد و غزل و رباعیات متعدد دارد که قریب لک بیت توان گفت ، و در نثر کتاب اسرار ازوست ، و نسخه رشحات‌الحیات در تصوف ، و مراة‌الکائنات در بیان اخلاق نیز نوشته ـ من اشعاره :

شورے شد و از خواب عدم دیده کشودیم
دیدیم که باقیست شب فتنه غنودیم
[ص ۳۰۳] چون رد و قبول همه در پردهٔ غیب است
زنهار کسے را نکنی عیب که عیب است

قطعه :

اے غزالی گریزم از یارے — که اگر بد کنم نکو گوید
من و آن ساده دل که عیب مرا — همچو آئینه روبرو گوید

رباعی :

در کعبه اگر دل سوے غیر است ترا
طاعت (۱) همه فسق ، کعبه دیر است ترا
ور دل بحق است و ساکن میکدهٔ
مے (۲) نوش که عاقبت بخیر است ترا

رباعی :

در عشق نه جاه ونے (۳) حسب می باید
نے (۳) علم ونه فضل و نے (۳) نسب می باید

۱- مجمع‌الفصحا (طبع تهران) جلد ۳ ، صفحه ۲۸ : طاعت گشته
۲- ایضاً : خوش باش
۳- اصل : نه

[ص ۳۰۴] این واقعه را کسے عجب می باید
معشوق غیور ست ادب می باید (۱)

رباعی :

سلطان گوید که نقد گنجینهٔ من صوفی گوید کد دلق پشمینهٔ من
عاشق گوید که داغ دیرینهٔ من من دانم و دل که چیست در سینهٔ من

شیخ محمد اکرم غنیمت

شیخ محمد اکرم غنیمت تخلص (۲) متوطن قصبهٔ کنجاه مضاف صوبهٔ پنجاب - از ارادتمندان حضرت غوث الاعظم بود ، و مشق اشعار خود را پیش مہر محمد زمان راسخ می گذرانید [ص ۳۰۵] و استفادهٔ فن شعر می نمود - و اکثر خیالہاے رنگین در الفاظ شوخ و عبارت متین بسته در ہندیان غنیمت بوده- دیوان مختصر ازو یادگار است - من اشعاره :

کرده ام از مہر لب نقد بیانہا در گره
بسته ام چون غنچهٔ سوسن زبانہا در گره
بیاد داغہاے کہنه دل دارد تماشاے
بود طاؤس را سیر (۳) چمن بر گشته دیدنہا

مثنوی نیز فکر کرده مشتمل برداستان عشق عزیز و شاهد مسمیٰ به نیرنگ عشق - بیتے چند از آن مثنوی نیز [ص ۳۰۶] درین مختصر می نگارد -

ابیات :

مرا روزے بدل شوق آشنا شد کتاب صبر را شیرازه وا شد

۱- آتش کده آذر کے حاشیه میں بھی مصحح نے اس رباعی کو پیش کیا ہے -

۲- کلمات الشعراء : از خاکیان هند غنیمت بوده طبعے درست داشت و دیوانے مختصر دارد - نتائج الافکار : وفات ۱۱۰۰ھ

۳- دیوان غنیمت (طبع لاهور) سیر چمن طاؤس را

بامیدے تماشاے نگارے | نمودم جانب مکتب گذارے
بر آمد بر در مکتب خروشم | که من سی پارهٔ دل می فروشم
بگوش شاهد آمد نالهٔ من | بغل پروردهٔ تبخالهٔ من
مرا از مهربانیها درون خواند | خرد از همرهی بیرون در ماند
ز سر پا کرده رفتم یک قدم پیش | بلا گردان لطف طالع خویش
بگفتا پیش تر آ ، پیش رفتم | تکلف بر طرف از خویش رفتم
[ص ۳۰۷]
ز دست من بصد اعزاز برداشت | غلط گفتم بچندیں ناز برداشت
بمهر اول غبارش را برافشاند | پس آنگه سورهٔ (۱) اخلاص برخواند
پسندش کرد و گفتا من خریدار | بگفتم گر (۲) شود طالع مددگار
بگفتا قیمتش ، گفتم نگاهے | بگفتا کمترک ، گفتم که گاهے
بگفتا یافتم زیں بیش مخروش | مبادا بشنود اخوند خاموش

مرزا ابو تراب غبار

مرزا ابو تراب غبار مردیست موزوں ، شعر هائے راست براست دارد :

طفل بدخوے سرشک من نمی گیرد قرار
خواب آسایش مگر در دامن محشر کند

ملا محسن فانی

عارف [ص ۳۰۸] معارف ربانی ملا محسن فانی (۱) از اکابر کشمیر

۱- اصل : صورهٔ

۲- نیرنگ عشق (طبع لاهور) ص ۳۳ : ار

۳- کلمات‌الشعراٗ : خود را از اکابر موحدان می گرفت و از اکابر کشمیر صوفی مشرب بود - از مصاحبان دارا شکوه است -

نتائج‌الافکار : وفات ۱۰۸۱ھ

ید ، و بادشاه زادهٔ بلند اقبال دارا شکوه ، خلف شاه جهان بادشاه [را] مصاحب‌ بندے بخدمت صدارت صوبه اله آباد مامور بود ، به سببے از اسباب بے منصب شد ، و سالیانه در خور معاش او مقرر گشت۔ و باز تا آخر عمر از کشمیر بر نیامد ۔ در عالم شعر فکر بلند و طبع رسا داشت۔ اگر غنچگیان عرائس مضامین را به نسایم شمایم زبان معجز بیان رنگین و شاداب تر بشگفتن می آورد ، [ص ۳۰۹] و دامن دامن گلهاے سخن بسمع سامعان می افشاند ۔ جامع کمالات طبیعی و الہی و منطق و معانی بوده ۔ شاعری نقصان آن والا گوهر یست ۔ چون بخیال شعر سر می پرداخت و صاحب دیوان ست لاجرم نام آن برگزیدهٔ الہی را در زمرهٔ این فرقه بقلم آورده ۔ این چند بیت از اشعار آن معنی نگار است ۔ من اشعاره :

سر نوشت ما چو کلک تیغ آن دلبر نوشت
بر بیاض گردن ما حرف ترک سر نوشت

[ص ۳۶۰] در بیاض حسنت ابرو مطلع برجسته بود
خط پشت لب برابر مطلع دیگر نوشت

تاب دیدار تو آورد دل و منفعلم
آب می شد اگر این آئینه جوهر می داشت

موے سفید خندهٔ صبح اجابت است
گشتیم پیر بر در آو تا دعا رسید

دست ارباب کرم چون کیسهٔ مفلس تهیست
معنیٔ این نکته حل شد از کف دریا مرا

با دهانت چسان کنم نسبت
دهن غنچه را که بو دارد

[ص ۳۶۱] وصف موئے میان او فانی
چه نویسد قلم که مو دارد

نقش ابروے تو محو از دل ما نتوان کرد
یعنی از صومعه محراب جدا نتوان کرد

بقدر وسعت مشرب بهر کس جرعهٔ دادند
تو در پیمانه مے داری و من خون در جگر دارم

فغفور

فغفور (۱) معنی یاب خوب می نماید :

مرا قیامت مردن بصورت دگر است
مسافران عدم انتظار من بکشند

فروغ

فروغ ، خوب متین می گفت :

یار بهتر ز من احوال مرا می داند
من چسان عیب خود از آئنه پنهان دارم

شیخ ابو الفیض فیضی

[ص ۳٦۲] شیخ ابو الفیض فیضی ملک الشعرائے اکبر شاهی بوده - مولدش دارالخلافهٔ آگره است ، و خلف شیخ مبارک ناگوری - شیخ عبد القادر بداؤنی می نویسد که شیخ مبارک از علماء متبحر بود و سالک اطوار مختلفه - در اوایل در امر معروف و نهی منکر بمرتبهٔ جهد داشت که اگر در مجلس او کسے انگشتری طلا یا لباس سرخ می پوشید ، از مجلس بدر می کرد - و از سرود نغمه احتراز می نمود - و [ص ۳٦۳] آخر غیرت الهی بمرتبهٔ دامن گیر او گردید که بے سرود و نغمه ساعتے نمی ماند - در اوایل عهد اکبر بادشاه وقتے که جماعت نقشبندیه استیلا داشتند نسبت خود را بایں سلسله درست کرد - و زمانے منسوب بمشائخ همدانیه شد - و آخر حال که اهل عراق در بارگاه خلافت غالب آمدند ، برنگ ایشان سخن می گفت - تفسیر منبع نفایس الفنون نام مانند تفسیر کبیر چهار جلد ضخم نوشت - و در دارالسلطنت لاهور هفدهم ذی قعده سنه هزار و یک بعالم بالا [ص ۳٦۴] انتقال کرد - و تولد شیخ فیضی نهصد و پنجاه و چهار است - و تحصیل علوم عقلی و نقلی و کلی و جزئ از پدر خود نموده -

گویند دوازده هزار کتاب در علوم عربی و فارسی اکثر بخط مصنف جمع کرد ، و تفسیر بے نقط در سنه هزار و یک با تمام رسانید مسمی بسواطع الالهام -

---

۱- کلمات الشعرا : از تازه گویان و معنی یابان بوده

علماے عصر مثل مولانا جمال لاهوری و مولانا عبدالسلام مفتی و شیخ عبدالخالق دهلوی وغیره در تعریف تصنیف آن توقیعات نوشتند - میر حیدر معمائی [ص ۳٦٥] تمام سورهٔ اخلاص را تاریخ انجام یافت - و خود نود و نه فقرهٔ بے نقط تاریخ یافت - مولانا ملک قمی و ملا ظهوری رباعیات در تعریف آن گفتند - در سنه هزار و چهار روز یکشنبه دهم صفر بخاک پیوست - بسیارے از مستعدان مرثیه و تاریخ فوت آن معنی آفرین گفته اند - یکے از فضلاے عصر ''فیاض عجم'' تاریخ یافته - حکیم عارف تاریخ رحلتش بدین گونه نظم نموده :

شیخ ابوالفیض فیضی آنکه بفضل
در جهان خرد جهانبان بود
[ص ۳٦٦] زادهٔ خاک هند بود ولے
فضل را افضل خراسان بود
بکدامیں زبانش بستایم
کز جهاں هر چه بهتر است آن بود
در هزار و چهارم از هجرت
جان پاکش قریب یزدان بود

اکثر عزیزان تاریخ وفاتش بسیار مذمت آمیز نوشته اند - و بنده نوشتن آنها را مناسب ندانسته ، عنان کمیت قلم را ازان وادی باز داشت - من اشعاره :

باقامتش سر پست من تیره بخت را
مانند هندوے که پرستد درخت را
[ص ۳٦٧] پیداست ز ماه تا بماهی
ماهیت حسن او کماهی
زخم بالاے دیده است او را
چشم زخمے رسیده است او را

وقتے که بادشاه عالم پناه اکبر بادشاه از هندوستان بعزم جنگ بادشاه

گجرات بسرعت تمام تر باده هزار شتر سواران جنگ آزموده ، بگجرات رسیده ، فتح آں ملک نمود ـ فیضی در شاهنامه مفصل ایں داستان را بسلک نظم آورده ، ایں چند بیت از آنجا بقید قلم می آید :

[ص ۳٦۸] یلاں بر شتر تیر کش در کمر
شتر ، چوں شتر مرغ در زیر پر
شهنشه سواری جمازه کرد
ره و رسم پیغمبری تازه کرد
بزیر سپر فخر شاه شهاں
چو زیر سپهر مقوس جهاں

مرزا ابوالفتح سبزواری فاتح

مرزا ابوالفتح سبزواری فاتح تخلص برادر زادهٔ مرزا حسین عارف ، جوان رعنائے بود ـ از اصفهان بهند رسید ، و پس از چند سال رخت اقامت بعالم بقا بر بست ـ شعر خوب می گفت ، و خط شکسته نیز می نوشت ـ مطلع قصیدهٔ پر زورش [ص ۳٦۹] ایں است :

بهار شد که بروید چو گل شرار از سنگ
برنگ لاله دمد لعل آب دار از سنگ

میر احمد فائق

بمعنی یابی و ادا بندی لایق ، میر احمد فائق(۱) برادر رشید میر جلال الدین سیادت است ـ اکثر بخدمات لاهور سرفراز می ماند (۲) ـ مردیست صاحب کمال ، در شیوهٔ سخن وری یگانه ، و سر آمد شعرائے زمانه ـ این چند اشعار آبدار گل سر سبد دیوان ایشاں اند ـ من اشعاره :

۱ـ کلمات الشعراء (حاشیه ص ۸۸) : میر سید احمد برادر میر جلال الدین سیادت در لاهور بعلاقهٔ مذهب و خدمت خزانه اقامت دارد ـ و از خوش فکران است ـ

۲ـ نتائج الافکار : وفات ۱۱۰۰ھ

[ص ۳۷۰] نه امروزیست از عشق توام این آه و زاریها
چو موسیقار می‌کردم فغان در نے نوازیها
نسبت فقر و فنا بسکه بهم نزدیک است
نیست یک پرده جدائی ز کفن تا کفنی (۱)
پروانه گو بناز! که در چشم می کشند
خوبان هند سرمه ز دود چراغ ها
از شرم چشم مست تو خوبان نهفته اند
در آستیں چو غنچهٔ نرگس پیالها
یوسف من بے تنزل یافت اوج اعتبار
در غمش چشم کبوترهاے چاهی شد سفید
آخر ز شرم ابروت اے آفتاب حسن
شمشیر خود هلال بزیر سپر کشید
[ص ۳۷۱] دمے بخوش دلی ار بگذرد غنیمت دان
زمانهٔ که محرم بود سر مثالش

رباعی:

باشند اگر چو سینه صاف و یکرنگ از هم نشوند آشنایان دل تنگ
بیگانگی آورد کدورت فائق آئینه ز آب خود نمی گیرد زنگ.

فصیحی

فصیحی (۲) فصاحت عبارت و متانت کلام بدرجهٔ تمام داشت:

خویش را بر نوک مژگان ستم کیشان زدم
آں قدر زخمے که دل می‌خواست در خنجر نبود

۱- یہی شعر به ادنیٰ تغیر اس تذکرے میں وحدت کے حال میں بھی درج ہے۔
۲- کلمات الشعرا: میرزا فصیحی از فصحاے زمانه بود اشعار ریخته (کذا) دارد و استاد یگانه۔
نتائج الافکار: وفات ۱۱۰۰ھ

[ص ۳۷۲] دوش تقلید جرس کردم و صد قافله سوخت
آه گر ناله پریشان تر ازین می کردم

فاطمه قواله

[فاطمه قواله در صفهان بداد سخن رسیده ، سرخوش بادهٔ نشاط و انبساط بود :

در این زمان رواج خوش آمد زبس رواست
در گوش خلق حرف نصیحت هزار پاست
بحر از صدف بچشم دهد جاے اشک را
کوچک دلی ز وضع بزرگان چه خوشنماست (۱)]

فرحت

فرحت کشمیریست ـ اکثر دیدنش در مجالس مشائخ می شود ـ شعرهم بتلاش می گوید ـ من اشعاره :

اهل بنیش سبزهٔ نا رفته از جا می کنند
آمد و رفتے (۲) نباشد مردمان چشم را
پیری رسید و رفت سیه مستی شباب
موے سفید من نمک این شراب شد

رباعی :

عید است و جهان ز عیش شد نغمه سرا
عالم گردید باز عشرت پیرا
از بسکه نداشت نقد عیشے در دست
طفل اشکم ز خون دل بست حنا

فروغی کشمیری

فروغی کشمیری [ص ۳۷۳] سخن را بسیار بآب و تاب می گفت ، و

۱ـ اضافه بر حاشیه
۲ـ اصل : رفت

در هاے اشعار آبدار در سلک نظم می سفت - و در سال هزار و هفتاد و هفت [۱۰۷۷ھ] رقم سنجان دیوان قضا برورق حیاتش خط کشیدند - من غرر نظامه :

گر دلت آرزو کند آں گہر یگانه را
رقص کناں بآب ده همچو حباب خانه را

کے زبیم خنجرت خواهد دلم یکسو گرفت
همچو ابرو می تواں تیغ برابر رو گرفت

[ص ۳۷۴] یا رب چه خوش ست ایں دو عذاب دوزخ
آتش بزمستان و بتابستان یخ

لاله را هم با چمن دل صاف نیست
ما دل یاران عالم دیده ایم

اے که در رفتن شتاب تیر دارد عمر تو
چوں کماں بهر که می سازی منقش خانه را

میرزا نادر الزمان فصیح

میرزا نادر الزمان فصیح برادر زادهٔ محمد امین عرفان است - در سن تمیز چند سال بمشق سخن پرداخته ، طرز مرزا جلال اسیر اختیار نمود - آخر جذبهٔ معنوی بر مزاجش غلبه کرد ، و ازیں فن خود را معطل محض نگاهداشت :

[ص ۳۷۵] ما را نشان ز دولت نایاب داده اند
بر یاد آں کمر چه قدر تاب داده اند

عمر بگذشت و نیاسود دل از ناله دمے
کارواں رفت و هماں بانگ درا می آید

شد از دمیدن خط رام وحشی چشمش
بدام سبزه تواں کرد صید آهو را

شیخ محمد فائز

شیخ محمد فائز از شاگردان مجمع الکمالات صورت و معنی مولوی محمد سعید اعجاز است ، و دیوان مختصرے ہر بیت دارد :

گر بگذری بسوے چمن اے بہار ناز
گل رنگ و بوے خویش کند فرش راہ تو
[ص ۳۷۶] کے بماند خالی از شور جنون میدان عشق
رفت مجنون ما بدولت طبل(۱) در صحرا زدیم

میرزا غیاث الدین منصور فکرت

میرزا غیاث الدین منصور فکرت تخلص (۲) از نجباے صفہان بودہ ۔ در عصر عالم گیر بسواد اعظم ہند آمد ۔ باخلاق حسنہ موصوف ، و بخوش فکری و بلند خیالی معروف بودہ :

نمی ماند سیاہی در دوات دیدہ آہو را
اگر دیباچہ بنویسم بیاض گردن او را
خمار افسردہ ام دارد ، شراب آتشینے کو
کہ خون مردہ را در پوست چون ہندو بسوزاند

محمد بیگ فرصت

[ص ۳۷۷] محمد بیگ فرصت از ایران بہند نیامدہ ۔ شاعر(۳) صاحب قدرت است ۔ در مجلس بادشاہ آن جا باریاب بود ۔

یک رمیدن برد از ہر دو جہانم بیرون
وحشتم کاش باندازۂ صحرا بخشند

۱- قلمزدہ : خیمہ

۲- کلمات الشعرا : از شرفاے ولایت بود ، در عہد عالمگیر بہ ہند آمدہ .... خوش خلق و خوش فکر بود ۔

۳- قلمزدہ : شاعری

محمد ابراهیم فیضان

محمد ابراهیم فیضان (۱) خلف آقا محمد حسین ناجی - فکر شعر درست داشت ، و نثر رنگیں می نوشت ، و خط نستعلیق نیز - فی الجمله از علم رسمی بهره یاب بود - من اشعاره :

مآل اختلاف از دست صنعت یک رقم باشد
تفاوت هاے کفر و دیں شگاف یک قلم باشد [ص ۳۷۸]

نصیبے (۲) گر بود همچوں صدف زرق از سما ریزد
چو قسمت نیست روزی از دهن چوں آسیا ریزد

بیهوده چه سوزی پئے دنیا جگر (۳) خویش
در خاک چو اخگر ببری مشت زر (۴) خویش

فایض عبهری

فایض عبهری (۵) (ابهری) شاعر صاحب قدرت است - من اشعاره :

چناں رنجور دارد ماه نو را رشک ابروے
که در یک ماه می گردد ز پهلوے به پهلوے

۱- کلمات الشعرا : آقا محمد ابراهیم فیضان خلف آقا محمد حسین ناجی ..... در فن انشا خود ثانی ندارد ...... خوش نویس هم بود -

نتائج الافکار : وفات ۱۱۲۴ھ

۲- کلمات : نصیبت

۳- اصل : جگر

۴- اصل : زرے

۵- نتائج‌الافکار : ملا محمد نصیر فایض ابهری... بعمر نود سالگی اربع و ثلثین و مائه و الف (۱۱۳۴ھ) مرحله پیماے سفر آخرت گشت -

سفینه هندی : ملا فائضا - محمد نصیر نام نامیٔ اوست ولد محمد قاسم ابهری ست ابهر قریهٔ است واقع دو فرسنگیٔ اصفهان .... در محاصرهٔ اصفهان بمرحمت الهی پیوست -

[ص ۳۷۹] ز بزم مدعی بیرون خرام اے مه که مشهور است
قمر بیش از دو شب در خانهٔ عقرب نمی باشد
شهرت نکند دست کرم بے کف سائل
یک دست محالست صدا داشته باشد

محمد دارا شکوه قادری

شاه محققاں ، سلطان اهل عرفان ، صاحب حال شاه بلند اقبال ، محمد دارا شکوه (۱) - خلف شاهجهان بادشاه - از بطن ارجمند بانو مخاطب به ممتاز محل صبیه ابو الحسن آصف خاں ، شب دو شنبه سلخ صفر سال هزار و بیست و چهار هجری [ص ۳۸۰] بر کنار ساگر تالاب دارالخیر اجمیر تولد یافت :

گل اولین گلستان شاهی

تاریخ ولادت آں والا گوهر است و بحسب اعتقادے که بسلسلهٔ عالیهٔ قادر یه داشت قادری تخلص می کرد - و در سال هزار و شصت و پنج هجری که عمرش از چهل تجاوز نموده بود ، سوائے عنایات دیگر بامور جلوس بر کرسی طلا که متصل تخت خلافت نصب کرده بودند ، بلند پایه گشته ، بخطاب شاه بلند اقبال امتیاز یافت - و در سال هزار و شصت و پنج هجری که عمرش از چهل تجاوز نموده بود ، سوائے عنایات دیگر بامور جلوس بر کرسی طلا که متصل تخت خلافت نصب کرده بردند ، بلند پایه گشته ، بخطاب شاه بلند اقبال امتیاز یافت - و در سال هزار و [ص ۳۸۱] شصت و هشت بانعام یک کرور روپیه نقد و جواهر و بمنصب شست هزاری چهل هزار سوار ، ازانجمله سی‌هزار سوار دو اسپه که تمام طلب بانعام هشتاد و سه کرور دام می شد ، و حاصل آں از قرار دوازده ماهه دو کرور و هفت لک پنجاه هزار روپیه بود ممتاز گردید - و بادشاه فرمود بابا طلب شما با خالصهٔ برابر شد - ملازمان حضور و صوبجات تیول سوارے پیاده و عمله و فعلهٔ کارخانجات از توپخانه و فیل خانه و اصطبل [ص ۳۸۲] وغیره که سر انجام هر یک از حد حصر افزون و از احاطهٔ شمار بیروں بود ، چهل و پنج هزار سوار چهار اسپه تا یک اسپه علوفه خوار موجودے منسلک بود -

---

۱- کلمات‌الشعرا میں دارا شکوه کا جو حال درج هے اخلاص نے اس سے کچھ استفاده نهیں کیا -

در رمضان سال مذکور بنزدیکی اکبر آباد با برادران مقابلهٔ جنگ افتاد - چون سلطنت ظاهری نصیب نبود ، ازان همه سر انجام مجردانه راه پیماے بادیهٔ تنهائی شد - باز بنده هاۓ بادشاه عالمگیر دستگیر نموده بدارالخلافه شاه جهان آباد آوردند [ص ۳۸۳] شب پنجشنبه بیست و دوم (۱) ذی حجه سال هزار و شصت و نه که عمر مبارکش بچهل و شش رسیده بود ، در گذر خضر بامر بادشاه عالم گیر شهد شهادت آشامید ، و بهمان لباس که در برداشت در مقبرهٔ همایون بادشاه مدفون گشت - مصرع :

زود دارا شهید اکبر شد

تاریخ شهادت است - آن بادشاهزاده از مریدان حقائق آگاه ملا شاه کشمیری بود و تصانیف متعدده دارد [ص ۳۸۴] مسمی بسکینه" الاولیا و نسخه موسوم بسفینه" الاولیا و رسالهٔ حق نما و نسخهٔ حسنات العارفین و نسخهٔ مجمع البحرین و دیوان غزلیات و رباعیات نیز -

رباعی :

معروف شدم تا که بعرفان گشتم   عارف شدم و ز خویش عریان گشتم
پیدا کردی مرا و لیکن من هم   پیدا کردم ترا و قربان گشتم

رباعی :

خواهی که شوی داخل ارباب نظر   از قال بحال بایدت کرد گذر
از گفتن توحید موحد نشوی   شیرین نشود دهان بنام شکر

[ص ۳۸۵]

رباعی :

بے مرگ کجا نام تو گردد زنده   بے بنده کجاست صاحبے زیبنده
از قید بود وجود مطلق ظاهر   صاحب نبود اگر نباشد بنده

رباعی :

عارف دل و جان تو مزین سازد   خارے که بود ز باش گلشن سازد
کامل همه را ز نقص بیرون آرد   یک شمع هزار شمع روشن سازد

۱- اصل : دویم

رباعی :

از مرگ نباشد اهل دل را آزار
در خواب نترسد چو شود دل بیدار
گر جان تو جسم را بینداخت چه باک [ص ۳۸۶]
چون کهنه بود پوست بیندازد مار

حاجی محمد جان قدسی

سر آمد شیرین کلامان زمان حاجی محمد جان قدسی تخلص (۱) مشهدی‌الاصل بورع و تقوای معروف ، و بحسن خلق و ستوده رای موصوف بوده ، و در سخن آفرینی و معنی بندی قدرت عالی داشت - در قصیده و غزل و رباعی داد فصاحت و بلاغت می داد ، علی الخصوص در قصیده و مثنوی نیز -

چنانچه شخصی در مدح آن خازن مخزن اسرار و غواص محیط افکار ، آئینه دار صور معانی ، پرده کشای شاهدان راز نهانی ، جاسوس اسرار [ص ۳۸۷] عالم بالا ، فانوس انوار تجلی می گوید - رباعی :

آن نفس مقدس که سماتش قدسی است
اسم و لقب و ذات و صفاتش قدسی است
مجموعه خوبی ، همه چیزش خوب است
زانرو همه چیز او چو ذاتش قدسی است

در سال پنجم جلوس شاه جهان بادشاه ، موافق سال هزار و چهل و یک هجری ، از وطن احرام هندوستان نمود ، و اشعار آبدار خود را بسمع خلیفهٔ زمان

۱- کلمات الشعراْ : خان زمان حاجی محمد جان قدسی ... سخنور صاحب قدرت بود در قصیده گوئی و غزل پردازی گوے بلاغت از اقران ربود ...... ظفر نامهٔ شاه جهان پادشاه . . . الخ . . . روز غزلے تازه گفته بود . . . الخ :

نتائج الافکار : وفات ، مصرع طالب کلیم :

دور از آن بلبل قدسی چمنم زندان شد
(۱۰۵۶ه)

رسانید و [ص ۳۸۸] بانعام نقد و خلعت سرفرازی یافته (۱) ، در زمرهٔ مداحان بندگان عالی جا یافت و ظفر نامهٔ شاه جهان بادشاه را بفصاحت لفظی و بلاغت معنوی نوشته ، و داد ادا بندی و معنی یابی داد ۔ چون دید که نام عبداللہ خان بہادر فیروز جنگ دریں بحر گنجایش ندارد ، بایں قسم گفته :

نهنگے که از غایت احتشام　　نگنجد به بحر از برز کیش نام

گویند قصیده در مدح عبد الله خان گفته بحضورش برد ، و همه قصیده را پیش او سر مجلس [ص ۳۸۹] خواند ۔ هر گاه فارغ شد عبداللہ خان برخاست و دستش گرفته بر مسند نشاند ، و خود بلباسے که در برداشت بر پالکی سوار شده از لشکر برآمد و خیمه و خر ایں جمیع اثاث البیت در وجه صله بحاجی بخشید ۔

بعد از چند روز حاجی قصیده در مدح بادشاه گفته بعرض رسانید ۔ بادشاه گفت حاجی صلهٔ که عبداللہ خان بتو داده است نمی توانم داد ۔ اما اقسام جواهر قیمتی طلبید و فرمود تا هفت بار دهانش پر از جواهر کردند ۔

[ص ۳۹۰] روزے غزل تازهٔ خود را پیش ملاے مکتب دار می خواند ، چون ایں بیت از زبان حاجی برآمد :

ساقی به صبوحی قدرے پیشتر از صبح
بر خیز که تا صبح شدن تاب ندارم

کودکے سر بالا کرد و گفت حضرت اگر بجاے قدرے ''نفسے'' گفته شود براے صبح بجاست (۲) ۔

گویند چون ایں شعر حاجی بسمع بادشاه رسید :

۱- ربیع الآخر ۱۰۴۲ھ میں صاحب قران ثانی کے سامنے قصیدہ پیش کیا اور انعام پایا (سرو آزاد ص ۶۱)

۲- ماخوذ از کلمات الشعراء

فتد چو مقری (۱) تسبیح در گلوش گره
موذنے که نگوید علی ولی الله

[ص ۳۹۱] بادشاه برهم شده از حاجی پرسید که این شعر از شماست ـ عرض کرد که (۲) من این شعر در هندوستان نگفته ام در صفهان گفته ام ـ

این چند بیت که دیوانیان هفت اقلیم را دستور سخن است دربن مختصر بزبان قلم آورد ـ من عزر نظامه :

من نمی گویم بچشمم نه قدم یا بر زمین
چشم من فرش است هر جا می نهی پا بر زمین
کند چو حرف گرفتاری مرا تحریر
بپاے خامه سزد گر رقم شود زنجیر
[ص ۳۹۲] گذشتنم ز تو باشد چو رشته از سوزن
که با حریر بود گرچه بگذرد ز حریر
در روزگار خصم هنرور هنو بس است
سوزد بجرم جوهر خود عاقبت چنار
زود به کردم من بے صبر داغ خویش را
اول شب میکشد مفلس چراغ خویش را
چو غنچهٔ گل صد برگ این سپهر دورنگ
بصد برهنه دهد یک قبا و آن هم تنگ
[ص ۳۹۳] جوانی رفت و داغے (۳) ماند بر (۴) دل یادگار از وے
چو آن سرخی که بر ناخن پس از رنگ حنا ماند

۱ـ مقری، سبحه بالضم ـ مهرهٔ کلانے که برسر تسبیح باشد و آن را امام تسبیح گویند (فرهنگ انند راج) تصحیح شعر از روے بهار عجم ص ۴۰۶

۲ـ قلمزده : جهان پناه من این زمانه

۳ـ اصل : داغ

۴ـ کلمات الشعرا : در

قصیده در منقبت امیر المومنین کرم الله وجه گفته - این دو بیت ازاں قصید است :

آب تیغ تو بر سر دشمن — همچو حکم اجل رواں باشد
قبضهٔ خنجرت جهانگیر است — گرچه یک مشت استخواں باشد

ابیات قصیده :

من آں نیم که کنم سرکشی ز تیغ جفا
چو شمع زنده سر خویش داده ام در پا
گماں برند خلائق مرا مرصع پوش
ز بسکه در بدنم خانه کرد سنگ بلا
[ص ۳۹۴] اگر بصورت پیکاں نیامدے غنچه
چگونه در دل مرغ چمن گرفتے جا
چو صبح تا نفسے راست کرده ام جائے
رسید تیغ بکف مهر طلعتے ز قفا
بلا کشان محبت به پیش شمشیرت
چو شمع و خامه سر و گردن اند سر تا پا
ز داغ لاله سیاهی نمی تواند شست
اگرچه صرف کند ابر مایهٔ دریا
کسے بقمیت من پے نبرد و عمر گذشت
چو گوهرے که شود پیر در ته دریا
[ص ۳۹۵] ز آب خود چو زمرد کسے که سبز شود
نه شان ابر شناسد نه شوکت دریا
مباش گو ، پۓ آرایش ضعیفاں چرخ
که نیست وسمه بر ابروے ماه نو زیبا
چناں ز تربیت کوهکن شود بے مهر
که جوے شیر سفید آرد از رگ خارا

بکوے تست نہارم وگرنہ چوں کعبہ
هزآر خانهٔ خالی فتاده در صحرا
کجا روم من ازیں در کہ ماهیاں در آب
بآستاں تو آرند رخ چو قبلہ نما

رباعی :

دانی ز چہ بے حجاب می خندد صبح
افگندہ ز رخ نقاب می خندد صبح
ایں غمکدہ چوں مقام خندیدن نیست [ص ۳۹٦]
بر خندهٔ آفتاب می خندد صبح

رباعی :

دنیا معشوق عاشق دیں نشود (۱)
شیدائی آں شیفتہ ایں نشود
بارے دل عاشق (۲) نشود جلوهٔ دهر
آئینہ ز عکس کوه سنگیں نشود

قانع

قانع معلوم نیست کہ کیست و کجائیست لیکن ایں شعر شعر احوال اوست :

چوں مرد مک چشم تو در عالم نیست
چرخے کہ خدنگ غمزہ را تیز کند

مرزا عبدالغنی بیگ قبول

سر زمرهٔ معنی بندان فحول مرزا عبد الغنی بیگ قبول شاگرد (۳) رشید

۱۔ نتائج الافکار : دنیا مطلوب طالب دین نشود
۲۔ نتائج الافکار : عارف
۳۔ قلمزده : از شاگردان

میرزا داراب جویا است - بدرویشی که در حقیقت شاهی است ساخته - مهمان دوست است و پیوسته بطبع حضور مشغول - الحال هندوستان از یمن قدوم آن سخن آفرین حکم صفاهان دارد - زمین سخن سبز کردهٔ اوست و بحر شعر آب دادهٔ او - و گلهاے معانی از طبع شگفته اش [ص ۳۹۸] شگفته - و غبار سخن سینهٔ طالبان سخن را به آبیاری نم قلم اعجاز رقم شسته :

یدالله چوں بیغمبرش فرو شد   نم فیض بد آنچه درکار او شد

[وقتیے که افاغنه بر صفاهان غالب آمدند زبان مبارک ایشان بدین شعر مترنم شد :

سرمه می گیرد ، فغاں زا دست آخر ، باک نیست
شورے از افغاں اگر در اصفهاں افتاده است

همان سالے که ایشان فرمودند ظالمان بجزاے اعمال خود رسیدند (۱)]

اشعار جواهر عیار قبول :

آش من پخت چو ترک چشمش
معنی طبخ نظر فهمیدم

حامی دین محمد حیدر خیبر کشاست
قلعهٔ شرع متین را شیر حاجی مرتضے است

اغیار راه آمدن ما گرفته اند
تا همچو سگ دراں سر کو پا گرفته اند

[ص ۳۹۹] گفتمش میکنی بمن نگہے
از سر ناز گفت باید دید

مانند تیغ زیر رکابے (۲) به بیں دنی
پیوسته در کمین نشسته برادر ست

۱- اضافه بر حاشیه

۲- تیغ زیر رکابے : تیغے که زیر دامن زین همراه اسپ سواری باشد

قبول : شود سوار چو آں ترک شوخ می ماند
به تیغ زیر رکابے نگاه پنهانش (فرهنگ اندراج)

نالہ ام چوں دید در طفلی پدر
گفت این بابا فغانی می شود
نیست در سر فکر روزی صاحب شمشیر را
باشد از ناخن کلید رزق در کف شیر را
نہ لازم است شجاعت نہ شرط احسانست
بکام هر کہ فلک گشت خان دورانست

[ص ۲۰۰] هر کہ مانند مہ نو لب نانے دارد
منتظر جانب خود چشم جہانے دارد
چرا هر دم بخونم تیغ کین بندی سرت گردم
اگر من واجب القتلم بران موے کمر رحمے
توان از خاکساری کرد جا در دیدهٔ مردم
قبول این معنیٔ نازک مرا از سرمہ روشن شد
قبول بسکہ کنی خویش را ز وصلش گم
ترا نشستہ بہ پہلوے یار نتوان دید
بپایش جبہہ سودم گاه وگہ ترک ادب کردم
ز روے او خجالت دارم از کارے کہ شب کردم

[ص ۲۰۱] سہہ انگشت از دم خر بود افزوں در درازیہا
مکرر شملهٔ دستار واعظ را وجب کردم
عبیر افشاند از بس دلبر عطار من بر خود
شمیم گربهٔ بید از بن هر موش می آید
بسکہ در سر هست زاهد را نہاں ذوق جماع
می نماید گنبد چل دختراں عمامہ اش
دقّت طبعم دو بالا گشت گردیدم چو پیر
قامت خم گشتہ آخر مصرع پیچیدہ شد

[ص ۲۰۲م] از طالعم شبے که میسر شراب شد
ما ریختیم (۱) شیشه بجام آفتاب شد
تا بسوے جامه زرتار خود بیند دنی
می کند فی الفور خود را کم چو کرم شب چراغ
غم روزی مخور که مردان را
سپر و تیغ آب و نان باشد
زاهد چو یافت سبحه ، ز بے گشت بے نصیب
یک جا نداد چرخ بکس آب و دانه را
من از گزیدن رخسار یار دانستم
که زنده می شود از گوشت نفس حیوانی

قصیده در مدح خان دوران صمصام الدوله گفته ـ در آن قصیده [ص ۲۰۳م] دو بیت در تعریف اسپ می فرماید :

این سبک رو کر ز دریا بگذرد نعل ز روش
تر نمی گردد ز آب بحر چون عکس هلال
یک نفس از مشرق آید کر بمغرب ، دور نیست
آن پری پیکر که از داسان زین دارد دوبال

قاسم دیوانه

شاعر فرزانه ، قاسم دیوانه (۲) شاگرد رشید مرزا محمد علی صائب تبریزی است ـ چنانچه در اظهار شاگردی خود گفته :

سزد از عقل بشاگردی من فخر کند
قاسم امروز که صائب بود استاد مرا (۳)

۱ـ سفینهٔ هندی : تاریکیم
۲ـ کلمات الشعرا : از شاگردان رشید مرزا صائب است
نتائج الافکار : وفات ۱۱۰۰ھ
۳ـ ڈیڑھ سطر قلم زد کی گئی ہے

من اشعاره :

[ص ۴۰۴] خویش را انگاشتم هیچ از بلا ایمن شدم
نیستی بر پیکر من کار جوشن می کند
می روی مستانه بر خاکم نمی دانی که من
در کفن همچون (۱) کبابے در نمک خوابیده ام
شبکے بکنج خلوت اگرم دهی اجازت
بمکم چنان لبت را که درو سخن نماند

محمد پناه قابل

محمد پناه قابل (۲) جوان قابل است ـ خود را از شاگردان مرزا بیدل صاحب می شمارد . من اشعاره :

[ص ۴۰۵] قابل دریں زمانه ز آدم نشان مخواه
چندیں هزار سال ز آدم گذشته است
اکنوں که دل نماند دلاسا چه فائده
زیں پیش داشت فائده حالا چه فائده
تا از خم ابروے تو تصویر کشیدم
شمشیر دگر بر سر شمشیر کشیدم
دوئی را رنگ وحدت می دهد یکتائیم قابل
دو مصرع گر بدیوانم نشیند فرد برخیزد

قادر

قادر معلوم نیست که کیست و کجائیست (۳) لیکن شاعر صاحب قدرت

۱- کلمات الشعرا : همچو

۲- تذکرۂ بے نظیر میں تخلص قابل [ڈاکٹر عبد الغنی کی رائے میں کامل هونا چاهئے ـ اورنٹیل کالج میگزین اگست ۱۹۵۲ء ، ص ۵۲] نتائج الافکار : وفات ۱۱۷۰ھ

۳- عبارت ماخوذ از کلمات الشعرا

می نماید و [ص ۹.۴] زبان سنجیده دارد :

سر نوشتے نیست جز خجلت جبین ساده را
چین پیشانی است موج آبرو آزاده را

قاسم خان قاسم

قاسم خان قاسم (۱) همزلف جهانگیر بادشاه - از شعر مناسبت رسائے داشت - گویند روزے بادشاه آب (۲) خاصه طلبید - در پیاله گلے که بغایت نازک بود (۳) آوردند - همیں که در دست گرفتند (۴) از جنبش آب پیاله (۵) بشکست - بادشاه ایں مصرع فی الفور (۶) فرمود -

کاسه نازک بود آب آرام نتوانست کرد

[ص ۷.۴] قاسم خان پیش مصرع رساند :

دید حالم را و چشمش ضبط اشک خود نکرد

من اشعاره :

بعد ازیں در عوض اشک دل آید بیروں
آب چوں کم شود از دجله گل آید بیروں

مردم ز رشک چند به بینم که جام مے
لب بر لبت گذارد و قالب تہی کند

۱- کلمات سے اس ترجمے کا ایک حصه لیا ہے جس کی نشان دہی مناسب مقام پر کی گئی ہے -

نتائج الافکار : وفات سنه اثنین اربعین و الف - (۱۰۴۲ھ)

۲- کلمات : خالص و خاصه

۳- کلمات میں '' بود'' نہیں ہے -

۴- کلمات : به دست گرفت

۵- کلمات : میں '' پیاله '' نہیں ہے -

۶- کلمات : میں ''فی الفور '' نہیں ہے -

مرزا ابو طالب کلیم کاشانی

عندلیب باغ نعیم ، مرزا ابو طالب کلیم کاشانی (۱) مولدش همدان است ، و نشو نما در هندوستان یافته - اول با میر جمله که متخلص بروح الامین بود بسر می برد - و باز بمدح شاه جهان بادشاه همه عمر [ص ۳۰۸] رطب‌اللسان ماند ، و بخطاب ملک الشعرائی امتیاز یافت - شاعر اعجاز رقم و مسیحا دم می توان گفت - هر چه گفته همه متین و دل نشین - و عبارتش روشن و معنیش رنگین - چندے بجهته نظم بادشاه نامه نیز آن چمن آرای گلشن سخن پرداخته بود - و آخر العمر در صوبهٔ کشمیر منزوی شد - و همانجا جلوه پیرائے عالم قدس گردید - چنانچه ملا طاهر غنی تاریخ رحلتش گفته :

حیف کز دیوار این گلشن پرید
طالبا آن بلبل باغ نعیم

رفت و آخر خامه را از دست داد [ص ۳۰۹]
بے عصا طے کرد این ره را کلیم

اشک حسرت چون نمی ریزد قلم
شد سخن از مردن طالب یتیم

هر دم از شوقش دل اهل سخن
چون زبان خامه می گردد دو نیم

عمرها از یاد او زیر زمین
خاک بر سر کرد قدسی و سلیم

عاقبت از اشتیاق یکدگر
گشته اند این هر سه در یکجا مقیم

گفت تاریخ وفات او غنی
طور معنی بود روشن از کلیم [۱۰۶۱ھ]

۱- ماخوذ از کلمات الشعراء

چندے ازاشعار آبدار آں اوستاد معنی بنداں بزبان قلم می آید ـ من اشعاره :

ز ناز سرمه مکش چشم بے ترحم را
نشسته گیر بخاک سیاه مردم را

جز حرف عشق نیست سراسر بیان ما
چون شمع یک سخن گذرد بر زبان ما

زیاں بیند ز رفعت آدم خام
نمی باید که باشد طفل بر بام

معشوق خورد سال بود سازگار تر
سروے که سر کشید دلش از چمن گرفت

دارم تب آں چنانکه سر انگشت را طبیب
برداشت ، تا ز دست من اندر دهن گرفت

[ص ۱۱م] گر ندارد غم ما دهر نرنجیم ازو
زانکه در خاطر ما نیز غم دنیا نیست

پیچیده تر ز طرهٔ او دود آه ماست
بر گشته تر ازاں مژه بخت سیاه ماست

بگذر ز نام و ننگ که رسوائی آورد
پیوسته روسیاه نگیں بهر نام بود

هرگز نگشت قابل رحم تو مدعی
پیوسته آب تیغ تو بر وے حرام بود

تا دل نظر بحال تو افگند شد اسیر
مسکیں خبر نداشت که ایں دانه دام بود

[ص ۱۲م] کار مژگان سیه مست تو شد کج روشی
هر که برخاست [ز] میخانه چنیں برخیزد

تا بکنج دل من جاے نه بیند اول
نیست ممکن که غبارے ز زمیں برخیزد
کاروان خط نمی دانم چه بار آورده ست
ایں قدر دانم که نرخ بوسه ارزاں می شود
بغیر اشک کسے حال دل نمی داند
همیشه طفل ز دیوانگاں خبر دارد
ز رشک طالع تردامناں داغم دریں گلشن
که شبنم خانه از گل، بلبل از خار آشیاں دارد

[ص ۲۱۳] روز و شب از بسکه محو آں میاں گردیده ام
موے می ترسم براند عاقبت از دیده ام
حدیث زلف تو از دل بلب چو می آید
بسان خامه سیه می کند زبان مرا
دست هر کس را بسان سبحه بوسیدم چه سود
هیچ کس نکشود آخر عقدهٔ کار مرا
ما ز گیرانی مژگان تو پابرجائیم
ورنه اول نکهت برده توانائی را
که دل برجا تواند داشت پیش چشم شهلایش
کشد ز آئنه بیروں عکس را مژگان گیرایش

[ص ۲۱۴] کند قمری خیال سرو بر خاک آشیاں بندد
که هر جا سایه افتد بر زمیں از قد رعنایش
شویم گرد بدنبال توسنت افتیم
دگر براے چه روزے ست خاکساری ما

مثنوی در تعریف برج مثمن قلعه دار الخلافه گفته ـ اکثر ابیات آن بنوشتن می آید :

مشمن که دید این چنیں دلپذیر
که در هفت اقلیم شد بے نظیر
مسرت فزا ، دلکشا ، دل نشیں
غبار درش آبروے زمیں
یکے گشت آئینه را پشت و رو
ز بس یک جهت شد بدیوار او
گرفتے اگر رونما از سپهر
نماندے بچرخ اختر و ماه و مهر
درش همچو محراب حاجت رواست
گر او از خدا این ز ظل خداست

[ص ۳۱۵] پناه زماں ، بادشاه زماں
جهاں بخش ، ثانی صاحبقراں
ز خاک درش ذرهٔ عالم است
ز بستان جاهش فلک شبنم است
بعهدش ضعیفاں چناں سرفراز
که رشته ز گوهر کند احتراز
همیشه درش باد عالم مآب
و زو زنده عالم ، چو ماهی در آب

قصیده در مدح شاهجهان بادشاه گفته - ازاں جمله چند بیت نگاشته می شود :

بهرکه پند نگیرد جفاے چرخ بجاست
بدست هرچه شکسته نشد بسنگ سزاست

[ص ۳۱۶] حسب کمال بود نے شرافت نسبی
بشیشه کس نزند طعنه کاصلش از خار است

بکاروبار جهان غیر یک نظر نکند
حباب‌وار کسے را که دیدهٔ بیناست

دماغ بر فلک و دل بزیر پاے بتان
ز ما چه می طلبی دل کجا دماغ کجاست

خطا نمی شود از استخوان ما تیرت
پر خدنگ جفایت مگر ز بال هماست

جز اشک و آه چه باشد بکلبهٔ عاشق
متاع خانهٔ ما چوں حباب آب و هواست

رباعی در تعریف تفنگ گفته :

در معرکه ایں تفنگ فریاد رس است
خصم افگن و گرم خوے و آتش نفس است

[ص ۱۷م] موقوف اشارتست در کشتن خصم
سویش نگہے ز گوشهٔ چشم بس است

خوندکار روم در تهنیت نامهٔ جلوس شاه جهان بادشاه نوشت که شما خود را شاهجهان لقب کرده اید هفت اقلیم داخل جهانست و شما بادشاهی همه ندارید - بهترین نامها نزد خدا عبدالله و عبدالرحمن است از نامها نامے اختیار نمایند - بعد مطالع همه مصلحت کردند که باید که خطاب را تغییر کرد - کلیم ازیں معنی مطلع شده ایں بیت گذرانید :

[ص ۱۸م] هندو جهان ز روے عدد چوں برابر است
بر شه خطاب شاه جهان زاں مقرر است

پادشاه همیں شعر در جواب نوشت و کلیم را بزر سنجیدن حکم فرمود(۱) وقتے که بر مزاج بادشاه عالم پناه حرارت تپ نمایاں شد دراں ایام کلیم ایں رباعی از نظر گذرانید - رباعی :

روزے که تن شاهجهان از تپ تافت
آں نیست که عیسیٰ بعلاجش نشتافت

۱- یه عبارت به ادنیٰ تصرف کلمات الشعرا (ترجمهٔ کلیم) سے ماخوذ ہے -

می رفت دعاے صحتش بسکه بچرخ
میخواست که آید بزمیں ، راه نیافت

مثنوی در تعریف [ص ۹۱م] اکبرآباد و گر خان آن جا گفته - اکثر ابیات آن مطبوع و دلکش است ، ازاں جا چند بیت بنوشتن می آید - مثنوی :

بپاے هر بناے اکبر آباد
بیک پا ایستاده روح فرهاد
ز صورت بسکه دارد سنگ تزئیں
نماید بیستون و نقش شریں
خیابانهاے بازارش دل افروز
بگشت عیش اهل حرفه هر روز
فتاده در دکان هر مهاجن
همه سرمایهٔ دریا و معدن
بروں آید اگر باشد خریدار
ز یک دکان او صد کاروان بار
بدکان اوفتاده بر سر هم [ص ۹۲م]
متاع شتر مرغ و جان آدم
بجاے دار و از دکان عطار
تواں صحت خریدن بهر بیمار
ببازارش ز خوبان گل اندام
شگفته گلبنے بینی بهر گام
قماش دلبری بزاز دارد
که بر دیباے چینی ناز دارد
قماشے (۱) کز برو ننهاده انگشت
همیشه جایش از عزت پس پشت

۱- اصل : قماش

بت صراف با صد عشوه و ناز
بنقد قلب ما کے بنگرد باز
بدستش نقد دل از هر که افتاد
درست از وے گرفت و خوردنش داد
[ص ۲۲۱ ه] به پیش روے او از خرمن زر
نیاید مشتری اندر برابر
بایں مغرور زر عاشق چه سازد
بایں هر فن کدامیں حیله بازد
ز تنبولی دلے دارم همه ریش
ز غم پیچیده همچوں سبزهٔ خویش
منه بر وعدهٔ تنبولیاں دل
که جز خون خوردن ازوے نیست حاصل
قرارے نیست در اقرار ایشاں
ورق گرداندن آید کار ایشاں
مه جوهر فروش آں آفت هوش
که گوهر گشته اورا حلقه در گوش
چه غم دارد اگر عاشق هلاکست
گهر را چه ' صدف گر سینه چاکست
[ص ۲۲۲ ه] بت خیاط شوخ [و] جامه زیب است
صنوبر قامتے عاشق فریب است
بتاں را خار در پیراهن از اوست
گریباں ها همه در دامن از اوست
بت زرگر بآں عاشق گدازی
سراپا راحت است و دلنوازی
عرق چوں از رخش در بوته ریزد
گل تر از میان شعله خیزد

ز حسن شستهٔ دوبی (۱) چه گویم
ازان بی پرده محبوبی چه گویم
تر و تازه شگفته آشنا روے
بسان سرو دائم بر لب جوے
چو آخر می شود سوداے بازار
بتان خانگی آیند درکار

[ص ۴۲۳] پٹھان و راجپوت و شیخ زاده
شکیب عاشقان برباد داده
همه افغان پسر عاشق نظاره
بدست زلف و در دستش کٹاره
غرور حسن با جهل نهانی
چو گردد جمع نتوان زندگانی
قضا روزے که نقش (۲) خیر و شر بست
بخوبی راجپوتان را کمر بست
بخوبی گرچه از گل عار دارند
گل از بهر چه با خود خار دارند
سپاهی زاده ها در پردهٔ شرم
بسان تیغ هم تندند و هم نرم
همه چون شعله خون گرم اند و مغرور
چو بوے گل همه رسوا و مستور

[ص ۴۲۴] اگر در خلوت و گر در بر جمع
بعاشق آشنا چون شعله با شمع

---

۱. دهوبی = دوبی ؟
۲. اصل : نقشے

چوگل خوشبوے و خوش روے وشگفته
متاع صبر عاشق پاک رفته
همیں بردل فریبی مردمش راست
در و دیوار آن محبوب دلهاست

شیخ سعد الله گلشن

حقایق و معارف آگاه ، شیخ سعد الله گلشن تخلص (۱) در خدمت شیخ الشیوخ شاه عبدالاحد سرهندی معروف بمیان گل وحدت تخلص ارادت صادق بهم رسانید - و در رکاب [ص ۲۵ م] ایشان بزیارت حرمین شریفین سعادت اندوز شد - بعد از چند سال در احمد آباد گجرات اوقات بسر برد - آخر العمر در دار الخلافه' شاه جهان آباد اقامت ورزید - ذات شریفش بسیار بوارستگی و بے تعینی موصوف است - خالی از شوق و نیاز و سوز و گداز نیست - در عالم غزل نازک بند و معنی یاب است - دیوان غزلش قریب لک بیت خواهد بود(۲) - من اشعاره :

[کلک من صورت کش صد معنی' رنگین اوست
گر کند گلشن تخلص بلبل طبعم رواست (۳)]
[ص ۲۶ م] ز هجرت کشت کار غم بآئین دگر دارم
که همچون خوشه روید صد دل تنگ از تن زارم
شدم تا در هوایت خانه بر دوش سبک روحی
چو بوے گل ندارد نقش ما بر خاک رفتارم
جفا جوے که من از شوق او عمریست دل تنگم
فسان تیغ نازش نیست جز گردیدن رنگم

۱- ترجمه کلمات الشعرا میں ھے لیکن اس سے استفاده نہیں کیا گیا -
۲- وفات گلشن ۱۱۴۱ھ - بحواله اورینٹل کالج میگزین و نتائج الافکار
۳- اضافه بر حاشیه

کے تردد تیز طبعاں را کند زیر و زبر
آمد و رفتے (۱) نمی باشد دم شمشیر را
خامشاں (۲) را نکند زخم زباں زیر و زبر
الف سینهٔ گندم به تهجی نرود
[ص ۴۲۷] از ازل چشم سیاهش کعبهٔ مقصود ماست
گرد او گشتن بود بر ذمهٔ ما فرض عین
پاس عزت تشنهٔ دیدار را گلشن بلاست
همت استسقای طبلی ز آبرو آئینه را
مکن باور بحرف قطع الفت کرده شوخے من
که چوں مقراض ایں ظالم زباں زیر زباں دارد
ز بس کرده موزونیش گل ز هر مو
درخت رباعی ست (۳) آں چار ابرو
که کرد کار جوانی بموسم پیری
نماز شام نگردد بوقت صبح ادا
[ص ۴۲۸] تیره از چرب زبانی دل روشن گردد
ایں چراغیست که بے نور ز روغن گردد
ایں مطلع شاه گلشن در سخنوران مشهور است :
بصد دقت تواں فهمید معنی هاے ناز او
که شرح حکمت العین است مژگان دراز او

رباعی:

عمریست که محو دل بیدار خودیم حیرت زدهٔ جلوهٔ اسرار خودیم
کے صورت حال ما شود پرده نشیں چوں آئنه خود رخنهٔ دیوار خودیم

۱- اصل : رفت (تصحیح از تذکرهٔ بے نظیر)
۲- اصل : خاموشاں
۳- اصل : درختے

رباعی:

در عالم گریه بے نوایم چوں شمع
در سوی گداختن رسایم چوں شمع
تا از دل من داغ تمنا گل کرد [ص ۲۹م]
در سوختن انگشت نمایم چوں شمع

مرزا کامران گویا

مرزا کامران گویا برادر مرزا داراب جویا ـ طبع شعر درست داشت و ذهنش بابهام و ادا بسیار مائل بود (۱) و خوب و متین می گفت :

[ز هجر مردم و گویند یار می آید
بکار من که نیاند چه کار می آید (۲)]
خوبش را با او شبے می خواستم
از برائے مطلبے می خواستم
از عروس دهر تا دل بر کنیم
همت مردانه می خواهیم ما

شیخ عصمت الله کامل

شیخ عصمت الله کامل (۳) [ص ۳۰م] متوطن مراد آباد ـ زبان شعر درست داشت ـ اکثر همراه منصب داران قلیل البضاعت اوقات بسر می برد و قوت لا بموت حاصل می کرد ـ من اشعاره :

طور را برق تجلی سوخت خامش شد کلیم
سرمه سا چشمے که خواهد برد نالیدن ز من

۱- قلمزده : استاد . . . . [ایک سطر]

۲- اضافه بر حاشیه

۳- مخزن الغرائب (قلمی) حاشیے پر : متوطن مراد آباد از منصبداران بوده علم شعر نیکو می دانست ـ ازوست ـ (یہی دو شعر)

منصب حیرت آرزوے من است
شوق آئینه داری دارم

مرزا گرامی همدانی

سخنور نامی مرزا گرامی همدانی (۱) خلف و شاگرد مرزا عبدالغنی بیگ قبول، گرامی تخلص(۲) [پیر و مرشد سخن سنجانست، مردیست قلندرمزاج(۳)] از [ص ۲۳۱] دنیا و ما فیها رسته [آن قدر خرق عادات از ایشان بظهور آمده اند که بنوشتن نباید (۴)] و تلاش معانیهاے غریب دارد - و شعر را بطرزے می خواند که سامع صورت معنی را برای العین مشاهده می نماید - و جلوه ابکار افکار بچشم سیر معاینه کند - من اشعاره:

پوستیں پوش هر که شد داند
دارم اشعار کاتبی از بر
[گراں بها ترش از در همیں نه دنداں ست
دو سرخ لعل لب او فزوں ز مرجان ست(۵)]
از بس ظلمت سرا ے داغ جانے بر نمی آید
چو شب مهماں رود باید چراغ برد همراهش
[ص ۲۳۲] نے (۶) همیں تنها شه بحر و بر است
شاه مرداں شیر حوض کوثر است

۱- نتائج الافکار: وفات ۱۱۵۶ھ

۲- قلمزده عبارت: . . . درویش مزاج قلندر وضع و از اهل (ص ۱۲۳) دنیا وا رسته - اشعار با رتبه می گوید-

۳- اضافه بر حاشیه

۴- اضافه بر حاشیه

۵- اضافه بر حاشیه

۶- اصل: نه

لغت کبیر اردو

مؤلفہ

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم

(قسط ۹)

آرام گاہ — (مث) ۱- آرام کی جگہ ' سونے کی جگہ ' خواب گاہ - م: آرام گاھوں میں ان کی کسی کا شور غل پہنچ سکے بھلا کیا مجال ! - ۲ - راحت و آسائش کا مقام ، تفریح گاہ ' منزل گاہ - م : دریا کے کنارے جا بجا آرام گاھیں ' شکار گاھیں ' کوشکیں بادشاھوں کی بنی ہوئی ھیں - ۳ - قبر کی جگہ ، مدفن - م : روضے کی تیاری سے پیشتر برھان پور ممتاز محل کی آرام گاہ رہا -
[آرام + گاہ ≕ جگہ]

آرامی — سامی زبانوں کی شمالی شاخ جس میں سریانی اور کلدانی داخل ھیں -

آرائش — (آرا ِاش) (مث) (لفظاً) وہ ساز و سامان یا نقش و نگار جو کسی چیز کا حسن اور رونق بڑھانے کے لیے ھوں' بناؤ سنگار زیور اور لباس - ع :

ان کو شوقِ آرائش دل ھے بدگماں اپنا

(مومن)

۳ - فرش فروش ' جھاڑ فانوس ' شیشہ آلات ' تصاویر ' پردے وغیرہ - سجاوٹ' جیسے مکان کی آرائش' ۴- سنہری یا رنگین نقوش و تحریر ' بیل بوٹے ' گل پھول حاشیے اور متن کے ' جیسے سرورق کی آرائش ' ۵ -کاغذ کے رنگ برنگ کے نقلی گلدستے ' ابرق کے کنول' روشنی کی ٹٹیاں وغیرہ جو ساچق اور برات کے ساتھ اس کی رونق ھیں ' باغ بہاری - م : پھولوں کی آرائش لیے ہوے چلے جاتے تھے (۲ - رسوم ھند ، ص ۱۱۳) م : یہاں شہر میں لوگوں کا قاعدہ ھے کہ آرائش چوروں و شہدوں کے سپرد کر دیتے ھیں (فسانۂ آزاد ، ج ۴ - ص ۴۸۰) ٦ - ھر شے جو زیب و زینت اور حسن کا باعث ھو جیسے گھوڑے کے بال اور دم اس کی آرائش ھیں ان کو کتر دینا گھوڑے کو لنڈمنڈ کردینا ھے (الف) لفظی صنعتیں ' صنائع و بدائع ' تشبیہہ و استعارہ '

سجع و قافیہ وغیرہ کا حسن و بہتات ۔ جیسے آرائش سخن (ب) استرکاری ، سفید گل کاری ، رنگ و روغن ، چھت گیری ، سائبان وغیرہ ۔ م : تعمیر کا کام پورا ہوچکا صرف آرائش باقی ہے ۔ (ج) روشوں کی باقاعدگی ، درختوں کی ترتیب ، سبز باڑوں اور سبزے کی قطع و برید ، جیسے چمن کی آرائش ۔ (د) جلوس میں گھوڑے وغیرہ ، جیسے سواری کی آرائش ۔ [ف : آرائش ۔ آراستن کا حاصل مصدر ۔ پہلوی : آرائی ش ن]

— پسند (ص) بناؤ سنگھار کا شوقین ۔ [ف : آرائش + پسند (پسندیدن کا امر)]

— کا تخت (مذ) کھپاچ کا ڈھانچ ، مربع یا مستطیل ، جس پر کاغذ ، پنی اور ابرک وغیرہ منڈھی ہوئی ، اوپر کاغذی پھولوں کے رنگ برنگ درختوں اور گل دستوں سے آراستہ ہوتا اور برات کے ساتھ چلتا ہے ۔ باغ بہاری عبارت اسی سے ہے ۔ دیکھو ' آرائش ' معنی نمبر ۵ ۔ م : یہاں شہر میں لوگوں کا قاعدہ ہے کہ آرائش چوروں و شہدوں کے سپرد کردیتے ہیں پھر ممکن نہیں کہ آرائش کے تخت لٹ سکیں ۔ (ف آ ۔ ج ۳ ۔ ص ۳۸۰)

— کا چمن (مذ) وہ باغ بہاری کاغذ کی جو براتوں کے ساتھ آرائش کے لیے ہوتی ہے ۔

کیا تاراج یوں پیری نے حسن نوجوانی کو
بوقت صبح آرائش کا ہووے جوں چمن اجڑا

(مصحفی)

— کرنا (ف م) ۱ ۔ آراستہ کرنا ، سجانا ، ٹھیک ٹھاک کرنا ، درست کرنا ۔

جھاڑو جھٹکو گھر کی آرائش کرو اے باندیو
آج ہیں رنگیں کے آنے کی یہاں تیاریاں

(رنگین)

۲ - زیب و زینت دینا ' خوشنمائی کرنا ' حسن دینا ۔
م : عورت کا حسن بالوں سے ہے ' مرد کی آرائش خدا نے ڈاڑھی مونچھ سے کی ہے - ۳ - (ف ل) بناؤ کرنا ' بننا ٹھننا - م : محرم کے دنوں میں آرائش نہیں کرتیں ۔

— لٹنا (ف ل) برات کے ساتھ جو باغ باڑی ' کاغذی پھولوں ' درختوں ' گلدستوں وغیرہ کی ہوتی ہے اس کا برات کے جلوس کے ختم ہونے پر لٹنا ایک عام دستور ہے ۔

— لوٹنا (ف م) ' آرائش لٹنا ' کا متعدی ۔

آرائش شادی کے بدل گھر کو یہ لوٹا
چھوڑا کسی سمدھن کے نہ پھر رخت بدن کا

(سودا)

— والا (مذ) ۱ - براتوں کے لیے سامان آرائش (معنی نمبر ۵) جلوس تیار و فراہم کرنے والا - م : برات ہم سجائیں گے مگر آرائش والے کو بلاؤ چانڈو بازوں کا تخت ضرور ہو - (فسانۂ آزاد ج ۳ - ص ٦٦٠)

آرائشی (ص) ۱ - حسن و رونق بڑھانے کا ' زیب و زینت کا ' خوبصورتی خوشنمائی کا ' سجانے کا - جیسے آرائشی سامان ۔
۲ - دکھاوے اور دکھانے کا ' ظاہری ' نمائشی ' بیکار ' بے مصرف - م : آرائشی باتوں سے انہیں نفرت تھی ' ایسے کلام کو جھوٹا سمجھتے تھے ۔
[ف : آرائش + ی (نسبتی و وضعی)]

آر پار (مذ) ۱- یہ کنارہ اور وہ کنارہ ، دونوں کنارے ، وار پار ، اور چھور - م : سمندر کا کچھ آر پار نظر نہ آتا تھا ۔
۲- (مف) ادھر سے چبھ کر ادھر نکلا ہوا ، پرویا ہوا ، بندھا ، سفتہ ، ترازو - نوک دار چیز کے لیے مستعمل جیسے تیر آر پار ہو گیا ، کیل آر پار ہو گئی ، برما آر پار ہو گیا ۔

[س : آوار + پار — آوار = ندی کا ادھر کا کنارہ - پار = اس طرف کا کنارہ]

ـــ دکھائی دینا (ف م) دونوں جانب دکھانا ، نظر کو درمیان میں نہ روکنا ، نگاہ میں حائل نہ ہونا ، شفاف ہونا - م : شیشہ آر پار دکھائی دیتا ہے -

ـــ کرنا (ف م) ۱- چبھو کے نوک پرلی جانب نکال دینا ، پورا بھونک دینا ، بیندھ دینا - م : خنجر ایسا مارا کہ آر پار کردیا -

ـــ ہونا (ف ل) چبھ کر نوک پر لی جانب نکل جانا، وار سے پار ہونا ، پورا بھک جانا ، پار ہونا - م : خنجر کا ہاتھ ایسا مارا کہ آر پار ہوگیا - ۲- چوری جانا ، تیر ہو جانا - م : کوئی چیز آر پار ہوئی تو تم ذمے دار ہوگے -

آرتا (مذ) ۱- ہندوؤں میں شادی کی ایک رسم - جب دولہا دلہن کے گھر پہنچتا ہے تو اس کی رشتہ‌دار عورتیں (بھاوجیں بہنیں خالہ وغیرہ) پیتل یا کانسی کا ایک تھال جس کے مختلف خانوں میں چاول ، روٹی ، تلک کا گلال وغیرہ ہوتے ہیں اور بیچ میں آٹے کا چراغ گھی کا ہوتا ہے جس میں چار بتیاں روشن ہوتی ہیں ، دولہا کے سر کے گرد پھراتی ہیں اور گاتی جاتی ہیں - م : بہن خوشحالو نے ایک تھالی میں آٹے کا چراغ بنا کر اس میں چار بتیاں روشن کیں اور کروڑی مل دولہا کا آرتا کیا- (۲ - رسوم ہند ، ص ۱۰۹) - ۲ - وہ گیت یا بھجن جو آرتی میں گائے جائیں - [گیت] جن کا کرس سہیلی آرتا لیے کے تھال پرات -

(مصادر : اتارنا ، پھرانا ، کرنا ، بدنا)

[س : آراترک - پراکرت : ارتہہ - ہندی : آرتی]

آرتی (مث) ۱ - (ہندو) دیوتا کی پوجا کی رسم - ایک پیتل کے تھال کو جس میں پانچ بتیوں کا چراغ ، آٹا ، بخور وغیرہ ہوتے ہیں ، دیوتا کے سر کے گرد پھراتے ہیں

اور باجے اور گھنٹیوں کے ساتھ اس کی تعریف و توصیف میں بھجن گاتے ہیں -

آرتی مچ رہی کہیں ٹھن ٹھن
گھنگروؤں کی کہیں یہ تھی چھن چھن

(نظیر)

۲ - وہ چومکھ چراغ جو دیوتا کی مورتی کے آگے پھرا یا جاتا ہے - م - کئی بتیوں کا چراغ جسے آرتی کہتے ہیں - (۲ رسوم ہند - ص ۳۶) [س : دیکھو 'آرتا']

[مصادر : لینا ، آنا ، ہونا]

— کرنا (ف م) آرتی کی رسم ادا کرنا -

— لینا بت کے منہ کے سامنے پھرائی ہوئی (پوجا کی) لو پر ہاتھ پھیر کر اپنے منھ پر پھیر لینا ، عاقبت میں سرخ روئی اور عقل کو روشنی حاصل ہونے کے لیے ایسا کرتے ہیں -

— مورتی ۱- بت کے سامنے شمع گردانی - ۲- پوجا پاٹ ، صنم پرستی - م : آرتی مورتی کے بعد اپنے گھروں کو جاتے اور کام کاج میں مصروف ہوتے ہیں -

[ہ : آرتی + مورتی]

— ہونا بت کے منھ کے سامنے شمع پھرانا - م : آرتی دو دفعہ ہوتی ہے صبح بھی اور شام بھی -

آرتنگ (آ ر ت ن گ) (مذ) ۱- نقاشوں کے کام کرنے کا مسطح تختہ یا موٹے مقوے کا پٹھا - (ف : دیکھو 'ارتنگ')

آرٹ ۱- علم و علوم درسیات فنون - جیسے بچلر آف آرٹس م : آرٹ کا زمانہ گیا اب سائنس کا دور ہے - ۲- فن ، ہنر ، صنعت ، فنیت - م : بڑھئی کا آرٹ اور لوہار کا آرٹ ایک ہے وہ لوہے سے اور یہ لکڑی سے کام لیتا ہے - ۳- صنعت و فن کی نزاکت ، ہنر کی باریکی ، نزاکت ، باریکی ، کمال - م : مصوری کے آرٹ کو سمجھنا

بہت مشکل ہے - ۳- انسانی صنعت و کاری گری ' صناعی - م : نیچر کو آرٹ سنوارتا بلکہ اس میں چار چاند لگا دیتا ہے - (انگ : آرٹ Art)

آرجار — (مث) ۱- آمد و رفت ، آهر جاهر - ۲- بار بار آنا جانا - ۳- راہ آمد و رفت ، پامالی - م : اس جگہ قبر آر جار میں رہے گی - (رکھنا ، کرنا) [ہ: ' آنا جانا ' کا بگاڑ]

آرد یا آرّد — ۱- آٹا ' چون - ۲- سفوف - ع :

نہ پائی ایک دن بھی آرد گندم کی ارزانی (منیر)

[ف : ارد - کاشانی : آورت - پہلوی : آرد ، آرد ' اردہ - اوستا : اشہ - کردی : آر ' آرت - ارت ' بلوچی: آرت ' ارتھ ' ارمنی : اتم - مادے کی رو سے آرّد اور آٹا ایک معلوم ہوتے ہیں] -

اُردل — (مث) اردلی ' همراهی' رفاقت - م : جوهر چند مردمان همراهی نوبهار اپنی آردل میں لے کر روانہ هوا - (۸- بوستان خیال' صفحہ ۱۰۹) زیادہ تر ' اردل ' (الف غیر ممدودہ سے) بولا جاتا ہے - [انگ : آرڈرلی Orderly]

اُردی هار — (مذ) موتیوں کا بارہ لڑا بنا هوا ایک قسم کا هار - [ہ]

آرزو — (مث) ۱- ارمان ' خواهش ' تمنا ' حسرت - ع :

آرزو ہے کہ تم ادهر دیکھو ! (میر)

۲- حسرت کشی ' امید و انتظار ' آس -

یہ کس مست کے آنے کی آرزو ہے
کہ ساقی لیے ساغر مشک بو ہے (گویا)

آرزوے وصل میں هو جانے کا اپنا وصال
هجر هی میں زندگی کے دن بسر هو جائیں گے (امانت)

۳- مقصد ' مدعا ' منشا

ھچکیاں لے لے کے شیشے کی طرح دم توڑیں ہم
کیا یہی ہے ساقیٔ پیماں شکن کی آرزو
(ناسخ)

۴۔ منت ' سماجت ' خوشامد ' چاؤ۔ م : کس آرزو سے تو بلایا اور کس درجے سے نکالا ! ۵۔ حرص و ہوس ' لالچ ' طمع ۔

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کردیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتا
(میر)

(بر آنا ' بر لانا ' پانا ' آنا ' ہونا)

[ف : آرزو ۔ غالباً آزور = آز + ور ۔ دیکھو 'آز']

— بر آنا (ف ل) مراد پوری ہونا ' مطلب حاصل ہونا ' کام بن جانا ۔

بر آئی آرزوے غیر میرے مرنے سے
حسد سے اس کے ہوں مردوں میں زندہ میں درگور
(ابو المعانی)

— بر لانا (ف م) ۱۔ امید و تمنا پوری ہونا ' مراد دینا ۔ م : خدا سب کی آرزوئیں بر لائے ۔

— پانا (ف م) ۱۔ مقصد حاصل کرنا ' کامیاب ہونا ' مراد کو پہنچنا ۔ م : الٰہی سب اپنی اپنی آرزو پائیں ان کے ہمارے بھی مقصد بر آئیں ۔

۲۔ مقصود و مدعا سے دو چار ہونا یا واقف ہونا ۔

اس شہ حسن کا ہوا طالب
دل نے یہ آرزو کہاں پائی

— کرنا (ف م) ۱۔ خواہش و تمنا کرنا ' چاہنا ۔

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے (ذوق)

۲۔ خوشامد کرنا ، گڑگڑانا ، التجا کرنا ، منت کرنا ۔
م : جو آرزوئیں کرکے مانگتے تھے اُن کو تو نہ دی ، نا قدروں میں بیٹی بیاہ دی ۔

— لانا (ف م) التجا پیش کر آنا ، حاجت لے کر آنا ۔

نہ لائے آرزو سفلوں کے پاس کوئی شریف
اس آرزو سے تو بہتر ہے غرق چہ ہونا ۔

— مند (ص) ۱۔ حسرت زدہ ۔ م : آخری دیدار کے آرزومند ھی رہ گئے ۔ ۲۔ خواھش مند ، مشتاق ، متمنی ، طالب ۔

آرزومند ھیں یوں اُس کے خریدار کئی
جیسے ھو ایک انار اور ھوں بیمار کئی (معروف)

[ف : آرزو + مند (لاحقہ فاعلی)]

— مندی (مث) ۱۔ شوق و اشتیاق ۔ (کرنا ، ھونا) [ف : آرزومند + ی (مصدری)]

— نکالنا (ف م) ۱۔ مراد پوری کرنا ، مقصد برلانا ۔ م : جو کوئی کسی کی آرزو نکالے خدا اُس کی بھی مراد پوری کرے (کی کے ساتھ) ۔ ۲۔ حسرت مٹانا ، ارمان نکالنا ۔

ڈھب پہ اپنے اُسے لگا لوں گا
حسرت و آرزو نکالوں گا (مومن)

— نکلنا (ف ل) ' آرزو نکالنا ' کا لازم ۔

آرسی (مث) (ف) ۱۔ منہ دیکھنے کا شیشہ ، درپن ، آئینہ ۔

ھوئی ہے آرسی جوگن ترے مکھ کے تصور میں
بھبوتی مکھ پہ کیا دم مارتی ہے خاکساری کا
(ولی)

۲- انگوٹھے میں پہننے کی طلائی یا نقرئی انگوٹھی جس کے نگ کا خانہ معمول سے بڑا اور اس میں ایک گول آئینہ جڑا ہوتا ہے، عورتوں کا زیور ہے جس میں وہ ہر وقت اپنا سنگھار دیکھ کر مانگ پٹی درست کرسکتی ہیں، آئینہ دار انگوٹھی۔

انگوٹھے کی لے سامنے آرسی
وہ صورت کو دیکھ اپنی گلزار سی (میر حسن)

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے (مثل)
[ہ: آدرش - پ: آدنس، آینس]

— دکھانا (ف م) ۱- آئینہ میں منھ دکھانا، ۲- (استعارتا) قائل معقول کرنا، شرمندہ کرنا۔

بگڑ کے دیکھو تو کیا صورتیں بناتے ہو
یہ آرسی تمھیں آئینہ ہی دکھائے گا؟

— (تو) دیکھو (ف م) آئینے میں اپنی صورت تو ملاحظہ کرو، مکھڑا دیکھو درپن میں تاکہ تم کو معلوم ہو کہ یہ چیز یا دعوا تم پر زیبا ہے یا نہیں، یا تمھاری صورت اس وقت کیسی بن رہی ہے۔ ایسے موقع پر بولتے ہیں جبکہ مخاطب صریحاً کسی چیز کے ناقابل یا کسی دعوے کا نا اہل ہو یا لڑنے بحثنے کے جوش میں اُس کا منہ کچھ بنایا بگڑا ہوا ہو اور وہ اُس سے بے خبر ہو۔ ع:

ابر سا روتا جو میں نکلا تو بولا طنز سے
آرسی جا دیکھ گھر برسے ہے منہ پر نور کیا!
(میر)

— مصحف (مذ) ۱- (لفظاً) آئینہ اور قرآن شریف۔ ۲- مسلمانوں میں ایک رسم شادی سے متعلق جو دلھن کے مکان پر

بعد نکاح کے زنانخانے میں ادا ہوتی ہے ۔ دلہن کو دولہا کے بالمقابل لا کر بٹھاتے ہیں ' یہ پہلا موقع ہوتا ہے کہ دلہن دولہا روبرو ہوتے ہیں ' اس طرح کہ پہلے اُن کے درمیان قرآن (مصحف) لا کر کھولا جاتا ہے ازاں بعد آئینہ درمیان میں رکھ کر دولہا کو دلہن کا منہ آئینہ میں دکھایا جاتا ہے ' دلہن کی آنکھیں شرم سے بند ہوتی ہیں ' دولہا سے بتاکید کلمات اطاعت کہلائے جاتے ہیں ، جیسے ''بیوی میں تمہارا غلام ہوں آنکھیں کھولو '' کہلوایا جاتا ہے ۔ قرآن درمیان دے کر دلہن کی صورت آئینے میں دولہا کو دکھانا ۔ جلوہ ۔
[از : آرسی + ع : مصحف =(قرآن)]

- مصحف دکھانا } (فمم) ۱ ۔ قرآن درمیان دے کر دولہا کو دلہن کی صورت نکاح کے بعد پہلی بار آئینے میں دکھانا ' دلہن دولہا کا بعد نکاح کے تعارف کرانا ۔ مرادف: جلوہ کرانا ' جلوے کی رسم ۔

دکھا مصحف اور آرسی کو نکال
دھرا بیچ میں سرپہ آنچل کو ڈال

(میر حسن)

- مصحف دیکھنا } (ف ل) ماقبل کا لازم دیکھو ' آرسی مصحف دکھانا ' جس کا یہ لازم ہے ۔

جلد دیکھیں آرسی مصحف کہیں دولہا دلہن
مانگتی ہوں یہ دعا پڑھ پڑھ کے میں قرآن روز

(جان صاحب)

[کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نکاح ہو جاتا ہے مگر وداع میں مہینوں برسوں لگتے ہیں ' جان صاحب کا یہ شعر ایسے ہی موقع کا ہے]

آرقا (مذ) ایک قسم کے پودے کا چارہ جو مسور کے درخت

کے مشابہ ہوتا ہے اور جسے گھوڑے اور بیل بہت رغبت سے کھاتے ہیں - [دیکھو ' رزقہ ']

آرگن (مذ) دیکھو ' ارگن ' -

[ف : آرغن ' آرغنن ' ارغنون ' یونانی : Organon]

آرمیدہ (ص) ۱ - قرار سے ساکن ع :

دو دو قدم وہ چلتا ہوا جاتا آرمیدہ

۲ - آرام کے ساتھ ' آرام پائے ' ع :

دوزخ کے آرمیدہ ' ارم کے رمیدہ ہوں (داغ)

[ف : دیکھو ' آرام ']

آرن (مذ) ارھا کی تصغیر - دیکو ' آرا ' -

آرنج (مذ) ۱- پہنچے سے کہنی تک کا حصہ (شاد استعمال) - ۲ - تقریباً ایک ہاتھ یا ڈیڑھ فٹ کا طول - ہاتھ - م : اس نے دیکھا کہ حشام کوھی کا پچانوے آرنج کا قد ہے- [۳ - طلسم ' صفحہ ۸۰۵]

[ف : آرنج ' ارنج ' آرن ' وارنج ' وارن ' ارش - پہلوی : ارتن ' ارت ن - اوستا : رآت ن = دوبالشت کی پیمائش - س : آرت نِ]

آرنی (مث) مدراس کے علاقے کی چوڑے عرض کی باریک قسم کی عمدہ ململ - [ہ]

اروغ (مذ ' شاذ) ڈکار -

کل اک حریص نے تخفیف وقت پر خوری
عجب کیا ظفر آروغ کو اروغ کیا

[ف: آروغ ' آرغ ' آروق ' اروغیدن ' روغ - یونانی : Epvyn اے ری گو ' یا ereugomai سے - لاطینی : Ructo-are, Ructare, Erugo-ore اس کے مادے

کا تعلق فارسی لفظ روغن سے بھی پایا جاتا ہے) ۔
[س :آروگیہ]

آروھی — (مث) اصطلاح میں ایک سُر سے درمیانی سُر ادا کرتے ہوئے ٹیپ کے سُر کی طرف جانے یا آواز چڑھانے کو آروھی کہتے ہیں، یہ موسیقی دانوں کی مشہور اصطلاح ہے ۔ عام زبان میں اس کو چڑھاؤ کہیں گے یعنی پست آواز سے بلند آواز کی طرف جانا ۔ (موسیقی)
[ہ ۔ س: آروھی ۔ س: آروھی، آروھہ]

— برن — (مذ) اگر کوئی گویا ایک تان ایسی لے جس میں سر تیزی کے ساتھ کھرج کی طرف سے ٹیپ کی طرف جائیں تو اس کو آروھی برن کہتے ہیں ، مثلاً سا رے گا ما پا ۔ (موسیقی) [ہ: آروھی + برن (= ذات، قسم، خلقت، خاصیت)]

آرہ — (مذ) دیکھو 'آرا' ۔ م : آرہ سر پر چل گیا تو بھی مدار ہی مدار ۔

آری — (مث) 'آرا' کی تصغیر ۔ آرے سے چھوٹا ایک دستے کا دندانے دار آلہ لوہے کا، لکڑی کو چیرنے اور دو پارہ کرنے کے لئے ہر بڑھئی کے پاس رہتا ہے ۔ [دیکھو 'آرا']

آرے — (مذ) جمع 'آرا' اور 'آرہ' کی ، جیسے آرے چلانے میں ۔

— چلادینا — ۱ ۔ زندہ چیر دینا ۔ ۲ ۔ نہایت ظلم ڈھانا، سفاکی کرنا :
کنگھی سے اس کی مانگ جو سیدھی کی غیر نے
میں کیا کہوں کہ مجھ پہ تو آرے چلا دیے

— چل جانا یا چلنا — (ف ل) ظلم ڈھائے جانا :

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

(غالب)

— سے چروانا (ف م) ۱- دیکھو "آرے سے چیرنا" جس کا یہ متعدی ہے۔ ۲- سراپا آرے سے دو پارہ کرا دینا - م : بادشاہ کی بیٹی کا نام لیا تو بادشاہ آرے سے چروا دے گا -

— سے چیرنا (ف م) ۱- (لفظاً) آرے سے دو پارہ کرنا - ۲- سخت دردناک سزا دینا - م : بادشاہ نے اگر سن لیا تو آرے سے چیر دے گا - (کہانیاں) -

دیکھوں تو کہاں تک وہ تلطف نہیں کرتا
آرے سے بھی گر چیرے تو میں اُف نہیں کرتا
(شیفتہ)

آرے بلے (مف) ۱- ہاں ہوں ، چون وچرا :

غلامی کا ظفر فخر جہاں کی
لکھا ہم نے تو بے آرے بلے خط (ظفر)

۲- ٹالم ٹول ، لیت ولعل - م : آرے بلے میں مہینوں گزار دئے -

نے کوئی واں یار جاتا ہے نہ کوئی آشنا
کرتے اُس کے لانے میں آرے بلے دونوں ہی ہیں (جرات)

(کرنا ، ہونا) - [ف : آرے = سچ ہے ، ہاں - آور = یقین ، سچ ، یقینی - "آوری" = بھروسے کے قابل - دف : آور ، اے ور ، اے وری - "آری" دراصل آوری ہے جس طرح آورد کو آرد بولتے ہیں - آ ، پہلوی : اِ (= پارسی ادی - س : ادھی حرف جار بمعنی میں وغیرہ) + ور - پارسی معنی : ور - اوستا : ور - س : ور بمعنی یقین دلانا]

آری بھرت (مث) - زردوزی - کپڑے پر زری کڑھت کی صنعت - [ہ]

آریا (مذ) کھیرے کی قسم سے ایک ترکاری ، صورت میں کھیا ترئی سے مشابہ ، کچا کھاتے ہیں - [ہ]

آریا ۱- وہ قوم جو شمال و مغرب یعنی ایران و افغانستان کی راہ سے جوق در جوق آکر پنجاب میں بستی اور

وهاں سے تمام هندوستان میں پھیلتی رهی ، آج سے تقریباً پندرہ سو برس پیشتر تک یہ سلسلہ جاری رها - زبان اُن کی قدیم آریائی تھی اور کتاب ان کی وید ، مذهب ان کا عناصر پرستی - آگ ، پانی ، هوا ، چاند ، سورج ، مظاهر قدرت کے بھجن گاتے تھے - برهمن ، چھتری وغیرہ اعلی ذات کے هندو انھیں کی اولاد هیں اور یورپ کی بعض قومیں انھیں میں سے هیں - ۲- هندو مذهب کے ایک زمانۂ حال کے مجدد سوامی دیانند سرسوتی کے پیروؤں کا لقب جو سوامی جی کی هدایات مندرجہ ستیارتھ پرکاش پر چلتے اور هندو مذهب کی چھوت چھات ، ذات پات کی تفریق ، بت پوجا اور اُن بدعات کو جو خالص آریا (دیکھو معنی نمبر ۱) مذهب میں داخل هو گئی هیں نهیں مانتے - غیر هندو کو بھی شدھ کر کے اپنی ذات میں شریک کر لیتے هیں - اُن کے عقاید میں تناسخ کا اعتقاد ، مادے اور روح کی قدامت ، گائے کا تقدس وغیرہ خاص چیزیں هیں -

[س : آریہ بمعنی شریف یا شریف نسل کا - ار - ی س (AR - Yas) = سچا ، مهربان - زند : ایریا = معزز]

— سماج ۱- سوامی دیانند سرسوتی کا قائم کردہ جدید هندو مذهب جس کو وہ ویدوں کی عبارت و الفاظ کی تشریح و تاویل کر کے قدیم آریا مذهب ثابت کرتے هیں - ضد سناتن دهرم کا - ۲- اطلاق اکثر اُس مکان پر جهاں آریا سماج کے جلسے اور تعلیم هوتی هے - م : آریا سماج میں مناظرہ هے - [ہ - س : آریا + سماج ، دیکھو 'سماج']

— سماجک دیکھو 'آریا سماجی' - [س : سماج + ک (وصفی)]

— سماجی ۱- آریا سماج سے منسوب و متعلق - ۲- آریا سماج کا

پیرو یا حامی ، آریا سماجک ، دیانندی ۔ [ف : آریا سماج + ی (نسبتی)]

— ورت (مذ) ۱۔ پنجاب کا وہ علاقہ جہاں قدیم آریا لوگ پہلے پہل (دیکھو 'آریا' معنی نمبر ۱) آباد ہوئے اور وہاں سے ہندوستان کے ہر خطے میں بڑھ کر پھیلتے رہے ۔ ہندوؤں کے آباو اجداد کا ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد پہلا مسکن ۔ ۲۔ تمام ملک ہندوستان (بر خلاف معنی لمبز ۱) جو صحیح تر ہے ۔ ع :

اے مقدس آریا ورت آئی کیا تجھ پر بلا

(زمزمہ قیصری ۔ حالی)

[آریا + ورت (س : ورت ی = حلقہ ، گھیرا ۔ ورت ق = محیط)]

آریائی آریا قوم سے متعلق و منسوب ۔ [آریا + ی (نسبتی)]

آڑ (مث) ۱۔ بیچ میں حائل ہونے ، پیچھے چھپا لینے والی چیز ۔ پردہ ، ٹٹی ، اوٹ ، اوجھل ۔ ع :

چھپا کے دیکھے ہے تکیے کی آڑ میں کاغذ (ظفر)

۲۔ حیلہ ، بہانہ ، ذریعہ ۔ م : اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے تو اس کی آڑ میں لوگوں کو راہ خدا سے روکتے ہیں (ت ق نذ ، صفحہ ۱۰۲۱) م : آج کل فقیری بھی ایک آڑ ہے دنیا کمانے کی ۔ ۳۔ حفاظت ، روک ، پناہ ۔ م : آگے برآمدہ ڈال دو کہ دھوپ کی آڑ ہوجائے ۔ ۴۔ پشت پناہ ، سپر ، معاون ، مددگار ۔

جب ایسا بھائی ظلم کی تیغوں میں آڑ ہو
پھر کس طرح نہ بھائی کی چھاتی پہاڑ ہو

(انیس)

۵- کفیل ، ضامن - م : قرض تو مل جائے گا مگر کسی کو آڑ دینا پڑے گا ۔ ٦- ضمانت ، کفالت - م : مکان کی آڑ پر دو ہزار نکلوائے ۔ ۷- آڑی کڑی یا شہ تیر ، اڑواڑ ، سہارا - م : کونے سے کونے تک آڑ دے کر چھت کو تھاما تھا ۔ ۸- آڑی لکیر ، قشقے کی لکیر - ۹- روک ، باڑھ ، مینڈ ۔ م : آڑ کو پھلانگ کر گھس آیا - ۱۰- بندش ، ممانعت ، منائی - م : جنگل سے لکڑی لینے ، بھیڑ بکری چرانے پر بھی آڑ لگا دی - ۱۱- دشواری ، دقت ، مشکل - م : اپنے معاملے میں اب بھی ایک آڑ ہے - ۱۲- کھیت کے اندر کی آڑی آڑی ڈولیں - م: آڑ میں مکئی بودی کہ جوار کے ساتھ بھٹے بھی ہوجائیں - ۱۳- سد راہ ، حائل ، مزاحم ، مخل - م : کسی کا مطلب بنتا دیکھیں تو ہم کیوں بیچ میں آڑ ہوں - ۱۴- رکاوٹ ، روک ، مانع -

کچھ منہ سے پھوٹیے تو سہی پھر نہیں کہ ہاں
آپس میں ہے حجاب کی جو آڑ توڑیے
(انشا)

۱۵- ترچھا پن ، ٹیڑھ ، کجی - م : آڑ سیدھ اس کی دیکھ لو - ۱٦- برتنوں کی کور سیدھی کرنے اور گڑھے گومڑے نکالنے کا مخروطی شکل کا ہتوڑا ، اڑواڑ ، ہتوڑا ، ۱۷- (مزامیر) ہاتھی دانت کی چھوٹی سی تختی جس پر رودے یعنی سارنگی کے تاروں کے سرے تانے جاتے ہیں ، رودے کے تاروں کی گھوڑی ، تار دان ، ٹیک - ۱۸- وہ لکڑی جو کواڑوں کو کھلنے سے روکنے کے لیے پس پشت ہوتی ہے ، دروازے کی لکڑی ، ہوڑا ، اگل - ۱۹- پشت پناہی ، معاونت ، مدد - م: اس کی آڑ پر تھانیدار ہے اپنا کون ہے ؟ ۲۰- پردے میں اوجھل ، اوٹ - م : درخت کی آڑ ہوگیا - گھونگٹ کی آڑ باتیں ہوتی ہیں - ۲۱- (مف) بیچ دے کر ،

وقفہ سے ۔ م : ایک دن آڑ بخار آ جاتا ہے ۔
۲۔ سایہ میں ، نیچے ۔ م : چھتری کی آڑ ہو جاؤ دھوپ میں کیوں چلتے ہو ۔
[٥ : آڑ ۔ س : آ + وریا ۔ ورن]

— باندھنا (ف م) ۱۔ روک پردہ وغیرہ حائل کرنا ۔ م : دھوپ جدھر سے آتی ہے اُدھر کچھ آڑ باندھ دو ۔ ۲۔ باری مقرر کردینا ، وقفے کا معمول کرلینا ۔ م : آڑ باندھ کر ایک دن بیچ آتا رہا ۔

— بند (مذ) آگا پیچھا چھپانے اور لنگوٹ کسنے کا کپڑا، لنگوٹا، لنگوٹ ، کاچھا ، لنگر ۔

[هف : آڑ + بند (ف : بستن = باندھا)]

— پاڑ (مث) ۱۔ آڑ تابع مہمل ہے ، پاڑ وغیرہ جس پر بیٹھ کر معمار اپنا کام کرتے ھیں ۔ م : آڑ پاڑ سب کھول پھینکی ۔ ۲۔ (پورب) برائے نام ذمہ داری (نور اللغات)

— پر (مف) ۱۔ مدد پر ، حمایت پر ، پشتی پر ۔ م : آپ اُن کی آڑ پر تھے ورنہ میاں کو مزا چکھا دیتا ۔ ۲۔ کفالت پر ، رھن پر ۔ م : چیز کی آڑ پر تو قرض مل سکتا ہے ویسے نہیں ملتا ۔

— پکڑنا (ف م) ۱۔ پناہ لینا ، پیچھے چھپنا ، اوٹ ھونا ۔ م : منافقوں نے بڑی سختی کے ساتھ اختلاف کیا کہ نہیں شہر کے اندر مکانات کی آڑ پکڑ کر لڑنا مناسب ہے ۔ (امہات الامہ) ۔ م : دیوار کی آڑ پکڑے گولیاں چلا رہے تھے ۔ ۲۔ حمایت و پناہ چاھنا ، پشت پناہ بنانا ، سہارا لینا ۔ م : جس کی آڑ پکڑی اس نے دھتکار دیا ۔ ۳۔ حیلہ بنانا ، بہانہ گرداننا ۔ م : هم کسی کو نہیں دیکھتے جو دنیا کی لڑائیوں میں دین کی آڑ نہ پکڑتا ہو ۔ (ح ۔ ف ، صفحہ ۳)

— پھانس ۱- پھنس پھنساؤ ، دقت ، چپقلش - م : اس آڑ پھانس میں سے ہو کر جانے سے فائدہ ، سیدھے رستے کیوں نہ جائیں - ۲- کاٹ پھانس ، بھانجی - م : سر رشتہ دار نے کچھ آڑ پھانس مار دی ، حکم منسوخ ہو گیا - ۳- (پورب) حیلہ ، فریب -

— کر دینا (ف م) ۱- ٹٹی وغیرہ کھڑی کرلینا - ۲- آگے پردہ یا اوجھل کرنا - م : انگنائی ایک ھے بیچ میں آڑ کردی ھے - ۳- حفاظت ، روک ، ممانعت - م : ھوا کی آڑ کردی -

— لگانا (ف م) ۱- ٹٹی یا ٹٹی کے بجائے کوئی چیز کھڑی کرنا، روک قائم کرنا - ع :

کیا آپ نے لگائی ھے تکیے کی آڑ خوب (انشا)

۲- آڑی لکڑی ، بلی وغیرہ کا سہارا دینا ، اڑواڑ دینا - م : مضبوط آڑ لگاؤ کہ چھت کو تھامے - ۳- کواڑوں کے پیچھے ھوڑا دینا ، آگل لگانا ، بلاّ لگانا - م : کواڑ بھیڑ کر آڑ لگانی بھول گئی -

— لینا (فم) ۱- دیکھو 'آڑ پکڑنا' - ۲- ضمانت یا ضامن چاھنا ، رھن دھرانا - م : بنیا ھے مکان زمین کچھ آڑ لے گا تب معاملہ کرے گا -

— مارنا (ف م) ۱- بھانجی مار دینا - م : دشمنوں نے آڑ مار کر کام بگاڑ دیا - ۲- آگل لگانا ، ھوڑا دینا - م : کواڑ کنڈی دے کر آڑ بھی مار دی تھی -

— میں (مف) ۱- اوٹ میں ، اوجھل میں ، پردے میں ، پیچھے - ع :

یہ شکار کھیلے ھیں بر ملا انھی ٹٹیوں کی تو آڑ میں (انشا)

۲- حمایت میں ، پناہ میں - م : اپنے خسر کی آڑ میں

ہیں اور خسر ہیں داروغہ پولیس کے۔ ۳۔ حیلے سے، بہانے سے۔ م: قومی چندوں کی آڑ میں خوب ہاتھ رنگے جاتے ہیں۔ ۴۔ کفالت، ضمانت کے طور پر، رہن میں۔ م: مکان بھی بنیے کی آڑ میں ہے۔

— میں آجانا یا آنا (ف ل) ۱۔ اوٹ میں ہوجانا، اوجھل ہوجانا، چھپ جانا۔ م: چاند درختوں کی آڑ میں آ گیا۔ ۲۔ ضمانت، حفاظت، پناہ میں چلا جانا۔ م: ایسے زبردست کی آڑ میں آ گیا کہ اب اُس کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ ۳۔ بیچ میں آجانا، حائل ہوجانا، سامنے پڑنا، آگے آنا۔ م: زمین پوری آڑ میں آجائے تو پورا گرہن پڑتا ہے۔ ۴۔ رہن کی ضمانت یا کفالت ہوجانا، مرہون و مکفول ہوجانا۔ م: رہنے کا مکان تک بنیے کی آڑ میں آ گیا۔ ۵۔ مانع و مزاحم ہونا، سد راہ ہونا، زد میں آنا۔ م: حملہ کیا تھا ایک سیلاب تھا کہ جو چیز آڑ میں آ گئی بہہ گئی۔ ۶۔ بیچ بچاؤ کرنا، مداخلت کرنا، بیچ میں بولنا، دخل دینا۔ م: آپ آڑ میں آ گئے آپ کا لحاظ کر گیا۔

— ہوجانا (ف ل) ۱۔ بیچ میں، حائل، پردہ، ٹٹی یا اوٹ ہونا۔ م: آڑ ہو کر کیوں کھڑے ہو گئے سامنے سے ہٹو۔ ۲۔ پناہ میں، پیچھے ہوجانا، چھپ جانا۔ م: دیوار کی آڑ ہو گئے۔ ۳۔ کفیل و ضامن ہونا، ۴۔ حمایتی بننا۔ م: ایسے کی کون آڑ ہو۔ ۵۔ حیلہ بہانہ ہونا۔ م: تم نے تو ایک بات کہہ دی، انہیں نادہندی کے لیے آڑ ہو گئی۔ ۶۔ فریب پوشیدہ ہونا، پیچ ہونا، دھوکا ہونا۔ م: ڈرتے ہیں کہ شاید اس میں بھی کچھ آڑ ہو۔ ۷۔ گروی ہونا، مکفول ہونا، مرہون ہونا۔ م: رہنے کا مکان بھی آڑ ہے۔ ۸۔ مانع و مزاحم ہونا، دخیل ہونا۔ م: یہ جانیں وہ جانیں ہم کیوں بیچ میں آڑ ہوں۔

آڑا (ص) سیدھا کا خلاف۔ ۱۔ ترچھا، کج۔ م: تیر آڑا

ھو دیا تھا اس لیے نشانے پر نہ بیٹھا - ۲- ایک زاویے سے اس کے مقابل زاویے تک ، قطراً - م : چارپائی کو آڑا بنتے ھیں -

جتانا اپنا جو ھو بانکپن تو پھر کیوں کر
نہ تھان قطع کرے لے کے دلربا آڑے (ظفر)

۳- کروٹ سے - م : پلنگ پر آڑا ھو جا کہ دوسرا بھی لیٹ سکے - ۴- بائیں سے دائیں کو دراز ، مستوی، پڑا - م : ایک خط آڑا اُس پر ایک کھڑا اسی کو چلیپا کہتے ھیں - ۵- عرض میں ، عرضاً - م : سانپ سڑک پر آڑا پڑا ھوا تھا - ۶- ترچھا ھوتا ، بل کھاتا ، م : سانپ آڑا چلتا ھے - ۷- کپڑے کو موڑ دے کر تھیلا کر کے قطع کیا ھوا ، ترچھی تراش کا ، آریبوان ، آریب کا - جیسے آڑا پاجامہ - ۸- (مذ) ایک قسم کا ریشمی کپڑا (شاذ)

کوئی سیدھی بات صاحب کی نظر آتی نہیں
آپ کی پوشاک کو کپڑا بھی آڑا چاھیے (ناسخ)

۹- ٹیڑھا ترچھا ، تلخ و تند ، خلاف صاف سیدھے کا -

دیے جواب نہ اُس نے جو قاصدا آڑے
کچھ آ گیا ترا شاید لیا دیا آڑے (ظفر)

[آڑا - س : ارال = ترچھا]

— آجانا (ف ل) دیکھو 'آڑے آجانا' - سپر بن جانا ' کام دے جانا -

مر ھی گئے تھے ھجر کی شب لیک بچ گئے
کیا جانے کب کا آ گیا آڑا لیا دیا
(معروف)

— آتارنا (ف م) ۱ - کپڑے کو ترچھا پھاڑنا - ۲ - پتنگ کو ایک طرف بچا کر لیچیے لانا - (لکھنؤ)

— آڑا — (صف) ۱ - آڑا کی تکرار - ۲ - چکلان میں ' عرضاً - م : سڑک پر آڑا آڑا کیا پڑا ہوا ہے سانپ تو نہیں ہے ؟ ' ۳ - لہراتا ' بل کھاتا ' آڑا ترچھا ہوتا - م : دریا بھی آڑا آڑا بہتا ہے - ۴ - بچتا بچاتا کتراتا - م : آڑا آڑا جاتا ہے کہ کہیں سامنے سے نظر نہ پڑ جائے - ۵ - خلاف عرضاً اور طولاً کا ' ایک کونے سے مقابل کے کونے تک اورمتواتر متوازی ' ترچھا ترچھا - م : چارپائی کو بان سے آڑا آڑا بنتے ہیں - م : شیر کی کھال پر آڑے آڑے نشان ہوتے ہیں -

— پاجامہ — (مذ) کپڑے کو عرضاً و طولاً موڑ کر تھیلا سی کر قطع کیا ہوا پاجامہ جس کی موریاں ٹانکوں میں پھنسی رہتی ہیں اور ٹخنوں سے اوپر چنتیں پڑتی ہیں - خلاف سیدھے پاجامے کا ' جو بغیر تھیلا کیے قطع کیا جاتا اور ٹخنوں پر سادہ رہتا ہے - آریب کا ' آربیواں ' چوڑی دار پائنچوں کا پاجامہ ' پھنسا ہوا پاجامہ ' پھنسواں پاجامہ -

— پڑنا — (ف ل) ۱ - چت پٹ کے خلاف ڈالا جانا ' پہلو سے پڑنا - م : شہتیر آڑا پڑے تو مضبوط رہتا ہے - ۲ - عرض میں لمبا لیٹ جانا - م : دروازے میں آڑا پڑ گیا - ۳ - چکلان میں پڑنا ' عرضاً ڈالا جانا - م : تانا سیدھا اور بانا آڑا پڑتا ہے - ۴ - منحرف ہو کر اکڑنا ، بچل جانا - م : نشانہ ذرا آڑا پڑا -

— ترچھا — (ص - صف) ۱ - موڑ کھاتا ' مڑتا مڑتا ' ٹیڑھا بانکا ' بل کھاتا ' لہراتا ' کج مج - م : دریا بھی سانپ کی طرح آڑا ترچھا بہتا ہے - ۲ - الٹا سیدھا ، اوٹ پٹانگ ' لٹ پٹا - م : جلدی میں جیسا بندھ سکا آڑا ترچھا عمامہ باندھ ' جوتا پہن ساتھ ہو لیے -

— ترچھا ہونا — (ف ل) بگڑنا ' ناراض ہونا ' خشمگیں ہونا -

سیٹھ جی اتنے آڑے ترچھے نہ ہو
واجبی نین سکھ کا مول کرو (قلق)

— ٹیڑھا (ص) دیکھو 'آڑا ترچھا' اور 'آڑا سیدھا' ۔

— چڑھانا (ف م) ۱ ۔ پتنگ کو ہوا یا حریف سے بچا کر بڑھانا ۔ ۲ ۔ حریف کی پتنگ پر اپنی پتنگ کو ترچھا لے جانا ۔ (پتنگ بازی)

— چوتالہ (مذ) طبلے کی تالوں میں ایک تال کا نام جس کے ۱۴ ماترے ہیں ۔ (موسیقی)

— خط (مذ) ۱ ۔ پڑی لکیر ' خط مستوی ۔ م : کھڑے خط پر ایک آڑا خط اسی کو چلیپا کہتے ہیں ۔ ۲ ۔ کسی جانب کو مائل لکیر ' ترچھی دھاری ۔ م : جن لفظوں پر سرخی سے آڑا خط ہے وہ خارج کر دیے گئے ہیں ۔

— سیدھا (ص مف) ۱ ۔ لفظاً ' کج و راست ۔ م : آڑا سیدھا کر کے کپّے میں سے آخر سارا گھی انڈیل لیا ۔ ۲ ۔ غلط صحیح ' طرح بیطرح ۔ م : آڑا سیدھا جیسا بندھ سکا عمامہ باندھ لیا (دیکھو 'آڑا ترچھا' بھی)

— کھینچ جانا (ف م) ڈور پر ڈور ڈال کر کھینچائی کرنا یا رخ موڑ کر ترچھا کھینچنا ۔ (پتنگ بازی)

— لگالینا (لکھنؤ) جو پتنگ کسی طرف کو زیادہ جھکا ہو اُس کو ڈور دے کر روکنا ' ہوا کی تہہ پر لے جانا ۔

— سانتا (ف ل) (لکھنو) پتنگ کا کسی طرف مائل یا منحرف ہونا ۔ (پتنگ بازی) ۔ (دھلی) کنی کھانا ۔

آڑا گوڑا (مذ) دیکھو 'آڑ گوڑ' ۔

آڑا گوڑی (مذ) ۱ ۔ دیکھو 'آڑ گوڑ' ۔ ۲ ۔ کشتی کا ایک داؤ (نور اللغات) [ہ : دیکھو 'آڑ گوڑ']

— دینا (ف م) (پورب) آڑ لگا دینا (کشتی)

— لگانا (ف م) (پورب) اڑنگا لگانا (کشتی)

— مارنا (ف م) (پورب) اڑنگا لگانا (کشتی)

آڑت (مث) آڑھت ۔ ۱ ۔ لین دین کے معاملات ' حساب

کتاب ' معرفت داری - م : جس بیوپاری سے آن کی آڑت ہے اس سے ہماری آڑت نہیں - ۲- مال رکھنے ' تلوانے ' بکوانے ' نقد کرانے کی اجرت - تلوائی ' بکوائی وغیرہ ' دستوری - م : پانچ روپیہ سیکڑہ آڑت کے کاٹ لیے - ۳- مال لا کر ڈالنے ' آتارنے ' ٹھیرنے کی جگہ - آڑتیے کا مکان ' گنج وغیرہ - م : آڑت پر اترے وهیں مال ڈالا - ۴ - تجارتی تعلقات ' چٹھی پتری ' هنڈوی - م : بمبئی ' کلکتہ ' مدراس ' سب جگہ آڑت ہے - ۵ - کمیشن ' ایجنٹی ' دلالی - م : آڑهت میں هی بہترین کمائی هو جاتی ہے - ۶- راز کا معاملہ ' سازش ' گٹھت م : اللہ هی جانے دونوں کی آپس میں کیا آڑت ہے - ۷- خفیہ آشنائی ' تعلق ' اخلاص - م : دونوں جوان تھے ایک جگہ رهنا سہنا ' کچھ آڑت هو گئی هو تو تعجب نہیں -

[ہ : آڑت ' آڑهت - س : اڈهیتا = دولت - س : آڈهک = اناج کا ماپ (بعض نے اس کا مادہ ''اڈ'' دیا ہے جس کے معنی کوشش و تدبیر کے هیں - مسٹر بیمس)]

— آٹھانا (ف م) ۱ - بنج بیوپار کا ٹھیا برخاست کر دینا ' بنج بیوپار چھوڑ دینا - م : آڑت اٹھا دی رئیس بن بیٹھے -

— توڑنا (ف م) ۱ - بیوپار کے تعلقات ' لین دین کے معاملات قطع کرنا - م : نادهندی دیکھ کر بنئے نے آڑت توڑدی - ۲ - دیکھو 'آڑت اٹھانا' -

— جمانا (ف م) ۱ - بنج بیوپار کھول کر بیٹھنا ' کوٹھی قائم کرنا - م : منیب نے استعفا دے کر اپنی آڑت الگ جمالی ہے - ۲- دخل دینا ' گھسنا ' ساجھا لڑانے کی کوشش کرنا ' ٹپس جمانا - م : جہاں ان کا کچھ تعلق نہیں وهاں بھی آڑت جمانے کو موجود هوجاتے هیں -

— ڈالنا (ف م) دیکھو 'آڑت لگانا' -

— کرنا دیکھو 'آڑت لگانا' -

— لتھت — (مث) ساز باز - م : آپس میں کچھ آڑت گٹھت ہو گئی۔

— لگانا — (ف م) ۱- تجارتی تعلقات ، لین دین ، حساب کتاب باہم قائم کرنا ، معرفت داری پیدا کرنا ، مال بیوپار ڈالنا ، میل کھاتا کرنا - م : جاپان میں کسی اچھے سے آڑت لگائی ہے مال پر مال چلا آتا ہے - ۲- دلالی یا اجرت عائد کرنا یا لینا - م : مال نقد بکوادے گا مگر پانچ روپے سیکڑہ آڑت لگائے گا - ۳- مال بیوپار کا ٹھیا قائم کرنا - م : بازار سے اٹھ کر اب گنج میں آڑت لگائی ہے - ۴- دوستی ، آشنائی ، رسائی یا تعلق پیدا کرنا ، ہاتھ مارنا - م : کہاں آڑت لگائی جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں -

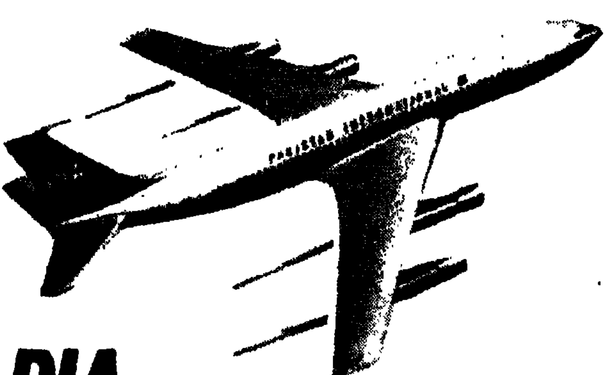
آڑتن — (مث) 'آڑتی' کی تانیث -

آڑتی — (مذ) ۱- اصل میں وہ بنیا جس کے ہاں زمیندار ، کاشتکار معمولاً اپنی پیداوار غلہ وغیرہ گانو سے لے جا کر منڈی یا گنج میں ڈالتے اور جس کے پاس سے اور خریدار آ کر مال طلب کرتے ، منگواتے ہیں - یہ اپنا حق الخدمت دونوں سے وصول کرتا ہے اور سیٹھ ہوجاتا ہے - درمیانی معاملات دار ، معرفت دار ، آڑتیا - ۲- (مجازاً) ہر ایک کاروبار کا درمیانی شخص جو کسی اجرت یا نفع پر اس قسم کی خدمت انجام دے - م : ترترکاری ، میووں کے آڑتی سبزی منڈی میں رہتے ہیں - ۳- مال بکوانے ، تلوانے ، جانچنے والا - م : مال خراب ہوا کم نکلا تو آڑتی کو کل دوش نہ دینا ، دیکھ بھال لو اور اپنے سامنے تلوالو - ۴- مال کی آمد برآمد کے متعلق چٹھی چپاتی کرنے والا ، گماشتہ - م : آڑتی سے ایک ہزار تھان کا آرڈر کرا دیا - ۵- ہنڈی پرچہ چلانے ہٹانے والا ، کوٹھی وال ، سیٹھ ، ساہوکار - م : آڑتی اپنا حق لے کر تاریخ سے پہلے بھی ہنڈی کے دام دے دیتا ہے - ۶- (مجازاً) اہل تعلق ، حمایتی ، جانب دار

"غالباً کوئی دوسری ایئرلائن ایسی نہیں جو ایک نئے ملک کی تعمیر و ترقی میں اتنی بھرپور امداد دینے میں پی آئی اے کا مقابلہ کر سکے"

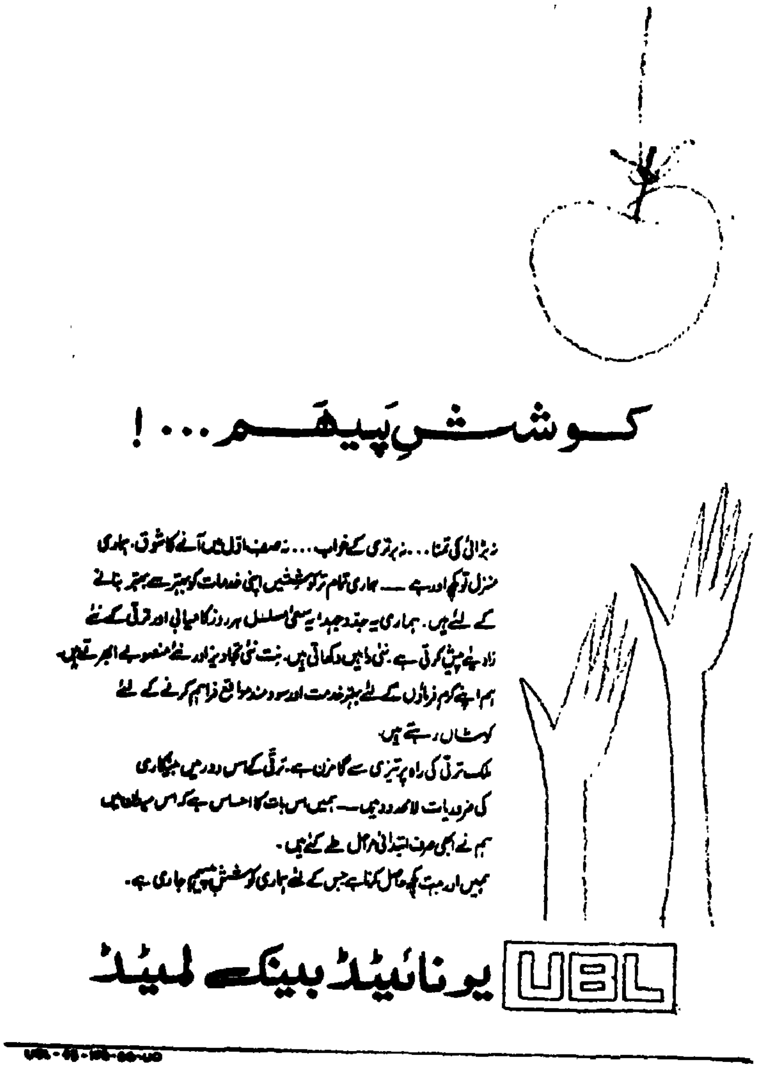
— اینڈریو ولسن
ڈیفنس اور ایوی ایشن کارسپانڈنٹ
اخبار "آبزرور" لندن

وہ اپنے حالیہ شائع شدہ مضمون میں کہتے ہیں:-
"پی آئی اے کے موجودہ ہوائی بیڑے پر نظر ڈالنے سے ہمیں صرف اس کی وسعت ہی پر حیرت نہیں ہوتی بلکہ اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کس طرح اس نے ہمیشہ قابل اعتماد آرام دہ اور اعلیٰ کارکردگی کے طیاروں کے حصول میں برابر کوشش کی ہے جو مختلف پروازوں میں استعمال کئے جا سکیں۔"
"ایک طرف تو پی آئی اے نے اندرونی اور بین الاقوامی پروازوں کا جال بچھا کر ملک کے مواصلاتی نظام کی ترقی میں مدد دی تو دوسری طرف اس نے ملک کی ٹیکنالوجی کے لئے بھی ایک نیا دڈال کر اتنی ہی اہم خدمت انجام دی ہے۔"
"اسکی کارکردگی کی سب سے نمایاں مثال کراچی ایئرپورٹ پر انجینیرنگ کا کارخانہ ہے جہاں گرد و غبار سے محفوظ ایئرکنڈیشنڈ ورکشاپ میں عظیم جیٹ ٹربائن سے لیکر چھوٹے الیکٹرونک پرزوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے جن پر جدید طیاروں کے تحفظ کا انحصار ہے۔"
"اور اسی طرح پی آئی اے نے جدید منیجریل ٹیکنیک کی بھی نئی بنا ڈالی ہے۔"
"اگر یہ سچ ہے کہ ترقی یافتہ مواصلاتی نظام سیاسی اور جغرافیائی بندشوں کو توڑ دیتے ہیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ پی آئی اے اور پاکستان نے اس امر کی سچائی کو منوا دیا ہے۔"



PIA پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز




کوششِ پیہم ...!
نہ بڑائی کی تمنا ... نہ برتری کے خواب ... نہ صفِ اوّل میں آنے کا شوق۔ ہماری
منزل تو کچھ اور ہے — ہماری تمام تر کوششیں اپنی خدمات کو بہتر سے بہتر بنانے
کے لئے ہیں۔ ہماری یہ جدوجہد، یہ سعیِ مسلسل ہر روز کامیابی اور ترقی کے نئے
زاویے پیش کرتی ہے۔ نئی راہیں دکھاتی ہیں۔ نت نئی تجاویز اور نئے منصوبے ابھرتے ہیں۔
ہم اپنے کرم فرماؤں کے لئے بہتر خدمت اور سود مند مواقع فراہم کرنے کے لئے
کوشاں رہتے ہیں۔
ملک ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن ہے۔ ترقی کے اس دور میں بینکاری
کی ضروریات لامحدود ہیں — ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ اس سلسلے میں
ہم نے ابھی صرف ابتدائی مراحل طے کئے ہیں۔
ہمیں اور بہت کچھ حاصل کرنا ہے جس کے لئے ہماری کوششِ پیہم جاری ہے۔
UBL یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

سہ ماہی

اردو

جلد - ۴۴ شمارہ - ۴

اکتوبر ، نومبر ، دسمبر

۱۹۶۸ع

انجمن ترقّی اردو بابائے اردو روڈ

کراچی-۱

فہرست مضامین

مسلسل مضامین

سرورق

بھاگ متی

تصویر مملوکہ انجمن ترقی اردو پاکستان

طابع : انجمن پریس ، لارنس روڈ کراچی

ناشر : انجمن ترقی اردو ، بابائے اردو روڈ کراچی

قیمت فی پرچہ : تین روپے پچاس پیسے

قیمت سالانہ : بارہ روپے

ھمارا جمالیاتی ورثہ — مصوری

ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی

مسلمانوں نے اصنام تراشی بلکہ ھر جاندار کی تصویر سازی سے احتراز کیا ھے، لیکن مصوری کو انھوں نے ھمیشہ لطف اندوزی و فرحت اور مفہوم کی ادائی کا آسان ذریعہ تصور کیا ھے۔ اسی لیے نہ صرف مصوری کو اختیار کیا ھے بلکہ اسے انتہائے کمال کو پہنچایا ھے۔ جمالیات کے سلسلے میں مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ تمام عالم سے جداگانہ ھی نہیں ارفع اور بالا رھا ھے۔

مسلمانوں کے بالکل ابتدائی دور میں خلفائے بنو امیہ کے زمانے میں جب بیرونی فتوحات سے اسلامی سلطنت میں توسیع ھوئی، اس وقت سے خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ساسانی اور بازنطینی روایات پر اپنا سکہ جاری کیا، جس پر اسی کی تصویر تھی اور جو اس وقت مصلحتاً ضروری سمجھا گیا تھا۔ بقول ابن سعد (صاحب طبقات) قاضی شریح کی مہر پر دو شیر اور بیچ میں درخت منقوش تھے۔ اس ابتدائی دور میں محض جمالیاتی طور پر فرحت اور مسرت حاصل کرنے کے لیے کپڑوں اور ظروف پر کئی قسم کے رنگوں سے نقاشی کی جاتی تھی۔ اس زمانے کی نقاشی کے مطالعے سے ھمیں آج اس زمانے کے تمدن اور اطوارِ زندگی کا سراغ ملتا ھے۔ مسلمانوں نے ان مصور اشیا کی جمالیاتی خصوصیات کے لحاظ سے ان کے نام بھی وضع کئے۔ مرط مرجل اس چادر کو کہا جاتا تھا جس پر محل اور آدمیوں کی تصاویر ھوں۔ محلات کے نام بھی ان کی جمالیاتی کیفیت اور نقاشی کے اعتبار سے رکھے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے شہر قزوین میں جب ابتدائی دور میں پہلی مسجد بنائی تو اس کے لیے ایسے ستون استعمال کئے جن کے سروں پر بیلوں کے نقوش کندہ تھے۔ اس کی جمالیاتی خصوصیت کی وجہ سے اس کا نام "مسجد ثور" یعنی بیلوں والی مسجد رکھا

گیا ۔ مسلمانوں نے ایسے حسین ماحول کے جمالیاتی اثرات کو ذہنی پریشانیوں کا علاج بھی تصور کیا ہے ، جس کی اکثر تاریخی شہادتیں ملتی ہیں ۔ مثال کے طور پر حکیم بدرالدین قاضی بعلبکی نے اپنی کتاب مفرح النفس میں بیان کیا ہے کہ تمام اطبا ، حکما اور فضلائے عصر کا اتفاق ہے کہ خوبصورت اور نازک چہرے کے دیکھنے سے نفس کو ایک گونہ فرحت و مسرت حاصل ہوتی ہے اور ان سے امراض سوداویہ اور پریشان کن افکار دور ہوتے ہیں ۔ اس لیے مشرق وسطیٰ میں جب حمام بنائے جاتے تھے تو ان کی دیواروں کو نازک تصویروں سے مصور کیا جاتا تھا ۔ ان حماموں کی دیواروں پر عشقیہ نظاروں ، حسین تصویروں ، گل و غنچہ ، صفوف اسپ اور وحوش کے شکار کے مناظر ہوتے تھے ۔ حکیم رازی نے لکھا ہے کہ مصور شکلوں کو تناسب اور مقدار کو ملحوظ رکھ کر دیدہ زیب رنگوں مثلاً سرخ ، سبز ، زرد اور سفید کے ساتھ مصور کیا جائے تو وہ یقینی طور پر مفید اور مفرح القلوب ثابت ہوں گی اور تمام ہموم و غموم کو دور کرکے خوشی کا سامان پیدا کریں گی ، کیوں کہ نفس انسانی اس قسم کے صور حسینہ کو دیکھ کر بہرہ اندوز ہوتا ہے ۔

ہماری جمالیاتی تاریخ مصوری بہت دلچسپ ہے اور ہماری مصوری ہماری ثقافت کا بہت اہم باب ہے ۔ ہم یہاں مختصر طور پر مسلمانوں کی مصوری کے بڑے بڑے کارناموں کا ذکر اجمالی طور پر کرتے ہیں ۔ مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں تمام مشرق وسطیٰ ، مشرق قریب اور وسط ایشیا کو فتح کر لیا تھا ۔ مسلمانوں کی افواج کے امیر زیاد بن صالح نے جب سمرقند کو ۷۰۰ء میں فتح کیا تو اس لڑائی کے قیدیوں میں کچھ چینی قیدی بھی ہاتھ آئے ۔ ان میں سے بعض کاغذ بنانا جانتے تھے ، ان سے یوسف بن عمرو عرب نے کاغذ بنانا سیکھا ۔ اسے مکہ میں قرطاس سے تعبیر کیا گیا ۔ اسی وقت سے مسودات کو کاغذ پر لکھنا شروع کیا گیا ۔ یہ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے مسلمانوں کے سامنے قرآن کریم کی حفاظت ان کا جزو ایمان تھی اور اسے محض لکھا ہی نہیں گیا بلکہ اس کو مذہّب و منقش بھی کیا گیا ، جو مسلمانوں کے ادراک مصوری کی بین شہادت ہے ۔ ابن ندیم نے جہاں ابتدائی اسماء الکتاب قرآن کریم کا ذکر کیا ہے ، وہاں ان لوگوں کا ذکر بھی کیا ہے جو قرآن کریم کے نسخوں کو منقش اور مذہّب کرتے تھے ۔ ان میں سے ابراہیم الصغیر ابو موسیٰ بن عمار المستطی، محمد بن محمد ابو عبداللہ الخزاعی وغیرہ شہرت رکھتے

تھے - ان میں سے اکثر حافظ قرآن ہوتے تھے اور قرآن کو لکھنے ، اسے مطلا ، منقش اور مذھب کرنے کو توشۂ آخرت تصور کرتے تھے - یہی وجہ تھی کہ وہ نہایت شوق اور محنت سے اس کام کو انجام دیتے تھے - مسلمانوں نے جمالیاتی اعتبار سے اس قسم کے نقش و نگار میں ایک خاص امتیاز پیدا کیا ہے جو دوسری قوموں میں نہیں ہے اور جسے آج متفقہ طور پر یورپ میں Arabesque کہتے ہیں - اسے عربی لفظ "وقواق" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دنیائے مصوری میں اسے ایک مسلمہ جدت قرار دیا گیا ہے۔

اس زمانے کے ذرا بعد وہ عہد آیا جب مسلمانوں نے اپنی علمی کتابوں کو مزید مفید بنانے کے لیے ان کو مصور کرنے کی طرف توجہ کی ، کیوں کہ اس کے بغیر ان کی تفہیم کسی قدر مشکل تھی - اگرچہ تصویر کشی ایک غیر اسلامی عمل ہے ، مگر علمی میدان میں اس کی ضرورت محسوس کر کے طب ، جغرافیہ ، قراۃ ، ریاضی ، نجوم ، جرثقیل اور موسیقی کی کتابوں کو مفید نقشوں اور تصاویر کے ساتھ تیار کیا گیا - اگر ہم اس عہد کی کسی تصنیف کے مخطوطے کو جو ان علوم سے تعلق رکھتی ہے اٹھاکر دیکھیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں مسلمانوں نے اس فن کو کتنے عروج پر پہنچا دیا تھا -

ان کتابوں کے مصور صفحات کا نظارہ ان کی جمالیاتی قدر و قیمت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ طب عرب میں حنین بن اسحاق متوفی ۲۹۸ھ کی "کتاب العین" کے مصور نسخوں کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے، جو زبردست تاریخی اہمیت رکھتے ہیں - اسی طرح فن شجاعت یا سپاہ گری میں 'کتاب الانیق فی المجانیق ' کے مصور نسخے کو بھی تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ ان دو مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسی علمی کتابوں کی افادیت میں اضافہ کرنے اور انھیں اہم بنانے کے لیے ان کتابوں مصور کرنا لازمی ہی نہیں تھا بلکہ ان کو بغیر تصاویر کے سمجھنا بھی دشوار تھا -

ادب و قصص کی کتب کی تصاویر کا سلسلہ یوں تو ابتدائی اسلامی عہد میں شروع ہو گیا تھا مگر ان کے قدیم ترین نسخے جو ہمیں ملتے ہیں وہ زیادہ تر چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے ہیں - اتفاق سے قابوس نامہ (اندارز نامہ) کا ایک مصور نسخہ امریکہ میں پرانی اشیا کے ایک تاجر کے ذریعے حال ہی میں دستیاب ہوا ہے، جسے راقم نے بھی ریاست اوھیو کے سن شائن

عجائب گھر میں دیکھا ہے۔ قابوس بن دشمگیر نے دسویں صدی عیسوی میں اسے بطور پند و نصائح لکھا تھا ۔ اس مصور نسخے کے اصلی یا جعلی ہونے سے متعلق مختلف آراء ہیں ، اگرچہ ابھی تک زیادہ قیاس یہی ہے کہ یہ جعلی ہے۔ بہر حال یہ نسخہ ۴۸۳ھ کا لکھا ہوا ہے اور اس کی رنگین تصویریں قابل دید ہیں۔ میرے نزدیک یہ نسخہ مشکوک ہے۔ بغداد میں عہد عباسیہ میں علوم و فنون کو بہت فروغ ہوا تھا ۔ یہاں الف لیلہ اور کلیلہ و دمنہ اور مقامات حریری جیسے علمی و ادبی شہ پارے بھی مصور کئے گئے تھے، جو اس عہد کی یادگار سمجھے جاتے ہیں۔ کلیلہ و دمنہ کے مصور نسخے اب بھی ملتے ہیں۔ خدیویہ کتب خانہ مصر میں عربی کی مشہور کتاب آغانی کا مصور نسخہ بھی موجود ہے۔ عربوں کی ثقافت اور فن کے عروج کو سمجھنے کے لیے یہی ایک ذریعہ ہے۔ حسن اتفاق سے میونک (جرمنی) کی نمائش ۱۹۱۳ء میں چند اوراق الف لیلہ کے بھی رکھے گئے تھے، جن میں اس گھڑی کا نقشہ بھی تھا جو ہارون الرشید نے چارلس پنجم کو تحفتاً ارسال کی تھی ۔ ان اوراق میں اس زمانے کے بازاروں کے منظر اور علم موسیقی سے متعلق بعض بہت اہم یادداشتیں تھیں۔ عام طور پر کلیلہ و دمنہ کو ہندی الاصل کتاب ہتو پدیش کا چربہ خیال کیا جاتا ہے، جو عبداللہ بن مقفع کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اسے مصور کرنے کی طرف بہت توجہ کی گئی تھی ۔ اس کا ایک نسخہ ۱۹۱۳ء میں پیرس میں نمائش کے لیے آیا تھا جو ۶۴۲ھ کا لکھا ہوا تھا ۔ اس میں تصاویر بھی تھیں جو عراقی دبستان مصوری سے تعلق رکھتی تھیں ۔ ایک اور مصور نسخہ پیرس میں ۷۲۳ھ کا تھا جو بغداد ہی میں لکھا گیا تھا ۔ اس عہد میں مقامات حریری کے مصور نسخے تیار ہوئے ۔ مدارس اسلامیہ میں یہ کتاب باقاعدہ پڑھائی جاتی تھی اور قدرے سریع الفہم تصور کی جاتی تھی ۔ انسان ان کتابوں سے جمالیاتی اعتبار سے بھی خوب حظ اٹھا سکتا تھا ، چنانچہ ان کتب کے متعدد مصور نسخے یورپ کے کتب خانوں مثلاً برٹش میوزیم لندن، کتب خانہ ملی پیرس، اور واٹنا میں موجود ہیں جنھیں راقم نے دیکھا ہے۔ پیرس کا نسخہ یحییٰ بن محمود الواسطی نے ۶۳۴ھ میں تیار کیا تھا ۔ مگر لندن کا نسخہ جو ۷۲۳ھ کا لکھا ہوا ہے، اسے ابوالفضل بن ابی اسحاق نے مصور کیا ہے۔ یہ تینوں نسخے خالصتاً عراقی دبستان مصوری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر کسی قسم کا چینی یا ایرانی اثر نہیں ہے۔ اسی طرح جامع التواریخ رشید الدین فضل اللہ کا ایک مصور نسخہ ایڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں ہے جو ۷۰۰ھ کا لکھا ہوا ہے، اس کا بقیہ حصہ لندن میں

ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے۔ اس میں متعدد تصاویر ہیں۔ اس تاریخ کے مصور نسخے جن کو بڑی حد تک اسی مذکورہ نسخے کے اجزا تصور کرنا چاہیے، کتب خانہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اور رامپور کے کتب خانہ رضائیہ میں ہیں، انھیں راقم نے دیکھا ہے۔ ان میں واضح طور پر وسط ایشیائی ماحول ہے، اسی لیے ہم ان کی مصوری کو وسط ایشیائی دبستان کی مصوری کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان تصاویر پر کسی قدر چینی مصوری کے اثرات بھی ہیں کیوں کہ یہ حصہ ملک چین کی سرحد سے ملا ہوا ہے۔

وسط ایشیا میں فردوسی کے شاہنامہ نے اسلامی مصوری میں ایک نیا رزمیہ رنگ پیدا کر دیا تھا۔ اس کو مصوروں نے ہر دور میں مصور کیا ہے۔ یہ کتاب جو سلطان محمود غزنوی کے عہد کا ایک زرین ادبی کارنامہ ہے، مصوروں کے لیے جولانیٔ طبع کا مرکز رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصوروں کو اس میں ایسے واقعات ملے ہیں جنھیں مصور کرنے میں بڑی سہولت تھی۔ اس میں بنے بنائے موضوعات ملتے ہیں۔ نیز شاہنامہ ایرانی ثقافت کا ایک بہترین نمونہ ہے، یعنی قدیم ایرانی قوم کی یہ مصور تاریخ ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ مصوری کے معیار کے ساتھ ساتھ ہمارا جمالیاتی نقطۂ نگاہ بھی اسی طرح ترقی کرتا رہا۔ چنانچہ آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں فنون میں خاصی ترقی ہوچکی تھی۔ خصوصاً ایرانی مصوری میں شاہنامۂ فردوسی کے علاوہ دوسرے مستند شعرا کے کلام کو مصور کرنے کی طرف بھی مصوروں نے توجہ کی، جن میں خمسۂ نظامی، کلیات امیر خسرو، کلیات عطار، کلیات سعدی، کلیات خواجو کرمانی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کو ایرانی مصوروں نے مصور کر کے جمالیاتی اعتبار سے دنیا میں مسلمانوں کا ایک خاص امتیاز قائم کر دیا۔ ان میں ہم دیکھتے ہیں کہ درختوں، پہاڑوں اور قدرتی نظاروں کی تصاویر زیادہ نظر آتی ہیں۔ یعنی آٹھویں اور نویں صدی ہجری کا وسط ایشیائی ماحول بدرجۂ اتم نظر آتا ہے۔ اس زمانے میں بغداد نقاشی کا مرکز نہیں رہا تھا اور تبریز اور سمرقند وغیرہ کے علاقے بڑے مرکز بن گئے تھے۔ تیموری فتوحات نے پھر ایک مرتبہ شیراز و بغداد کی بجائے ہرات کو علوم وفنون کا مرکز بنا دیا تھا۔ یہاں مصوری میں ایسے ایسے کارنامے ظہورپذیر ہوئے کہ دنیا ان کی مثال نہیں پیش کر سکتی۔

اس سے پہلے کہ اس عہد کے کارناموں پر روشنی ڈالی جائے، خواجو

کرمانی کی کلیات کے اس خاص نسخے کا ذکر کیا جاتا ہے جو برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ مشہور و معروف خطاط جیسے عام طور پر موجد خط نستعلیق بیان کیا جاتا ہے، میر علی تبریزی کے فن کا شاہکار ہے جو ۷۹۸ھ میں لکھا گیا تھا۔ اس نسخے کی تصویریں مصور جنید کی بنائی ہوئی ہیں ، جو اپنے دستخط ' جنید نقاش سلطانی ' کے الفاظ میں کرتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بغداد میں سلطان احمد جلائر کے دربار میں تھا۔ یہ نقاش استاد شمس الدین کا شاگرد تھا جو سلطان عویص جلائر کے ہاں مصور تھا۔ اس کا ایک اور شاگرد استاد عبدالحی تھا۔ اس عہد کے مصوری کے نمونوں کی جمالیاتی کیفیت ان کے رنگوں، متنوع لباسوں، ماحول کی سجاوٹ اور تناسب و ترتیب سے واضح ہے۔ مگر در و دیوار کی آرائش سے واضح ہوتا ہے کہ ان کو قدرت نے جمالیات کا خاص ملکہ عطا کیا تھا۔ اس سلسلے میں کلیات خواجو کی تصویر ''ہمائے ہمایوں'' جس میں ایک شادی کی تقریب پیش کی گئی ہے، مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔ اس مخطوطے کی تمام تصاویر میں اعلیٰ پائے کے نقش و نگار نظر آتے ہیں جو اس زمانے کی ثقافت کا زندہ نمونہ ہیں۔ ان شکلوں میں حسن ترتیب بکمال نظر آتا ہے جو عراق و عجم کے ذوق جمالیات اور مصوری کے فن کی ارتقائی خصوصیات کا آینہ دار ہے۔

۸۷۶ھ میں تیمور کے گھرانے میں سلطان حسین بائیقرا تخت نشین ہوا۔ شیر علی شیر نوائی جیسا علوم و فنون کا سرپرست اس کا وزیر اعلیٰ تھا۔ اس کے دربار میں مولانا نورالدین عبدالرحمان جامی جیسے شاعر، مولانا نبائی جیسے ماہر فن، مولانا سلطان علی مشہدی قبلۃ الکتاب جیسے کاتب اور استاد کمال الدین بہزاد جیسے مصور جمع تھے۔ تاریخ میں ایسے ماہر اور اپنے اپنے فن کی امام ہستیاں کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہوئی تھیں۔ ان یگانۂ روزگار فاضلوں نے ایک دوسرے کے تعاون سے وہ کارنامے انجام دئے، جو تاریخ علوم و فنون میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ بہزاد نے زمانۂ طفولیت میں استاد سید روح اللہ میرک نقاش سے تعلیم حاصل کی جو مولانا ولی اللہ کا شاگرد تھا، دوسری طرف اسے پیر سید احمد تبریزی سے بھی تلمذ حاصل تھا۔ وہ ۸۴۴ھ میں ہرات میں پیدا ہوا تھا اور وہیں پرورش پائی تھی۔ ابھی تک ایرانی مصوری میں چینی اثرات موجود تھے، مگر بہزاد ہی ایک ایسا مصور گزرا ہے جس نے ان اثرات کو ختم کر کے ایرانی مصوری کو خالصتاً مقامی کر دیا۔ بہزاد اور اس کے تلامذہ نے جن میں آقا میرک قاسم علی، رستم علی، میر مصور، شیخ زادہ،

ملا یوسف، مظفر علی وغیرہ قابل ذکر ہیں، ایرانی مصوری کا ایک نیا دبستان قائم کیا ۔ بہزاد کے کارناموں میں بے شمار اس قابل ہیں کہ ان کو الگ الگ بیان کیا جائے ۔ مگر میں یہاں محض گلستان سعدی کے اس نسخے پر اکتفا کرتا ہوں جو دارالکتب مصریہ میں موجود ہے اور جسے راقم نے چند برس قبل دیکھا تھا ۔ اسے سلطان علی مشہدی نے لکھنا شروع کیا تھا اور شمس الدین کرمانی نے مکمل کیا تھا ۔ اس کی تمام تصاویر بہزاد کی بنائی ہوئی ہیں ۔ ان تصاویر میں سے ایک میں بہزاد نے یوسف زلیخا کے مشہور واقعے کو بھی مصور کیا ہے ۔ بہزاد کی اس تصویر کا مشاہدہ واضح کرتا ہے کہ بہزاد نے محل کے تمام پردوں اور دریچوں کو اس طرح مصور کیا ہے کہ ہر حصہ الگ الگ نظر آتا ہے اور پھر اس میں دو شخص یعنی یوسف اور زلیخا ہی کار فرما نظر آتے ہیں ۔ عام طور پر مشرقی مصوری پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں یورپی مصوری کی طرح جسامت واضح نہیں ہوسکتی، لیکن اس تصویر میں جسامت بالکل واضح ہے ۔ اسی طرح بہزاد نے دو اونٹوں کو آپس میں لڑتے دکھا کر اونٹ کی خصلت کو واضح کیا ہے ۔

سلطان حسین بائیقرا کے بعد صفویوں کا دور دورہ ہوا اور حکومت کا مرکز بجائے ہرات کے پھر تبریز ہوگیا ۔ صفویوں نے بھی علوم و فنون کی قدردانی میں بڑے بڑے کارنامے انجام دئے ۔ اسماعیل صفوی بہزاد کو اپنے ہمراہ تبریز لے گیا اور وہاں اسے کتب خانے کا مہتمم مقرر کیا اور تمام مصوروں کو اس کے ماتحت کردیا ۔ تقریباً سو سال کی عمر میں ۹۴۲ھ میں بہزاد نے وہیں وفات پائی ۔ اس کی تاریخ وفات "خاک قبر بہزاد" سے نکلتی ہے ۔ اس کی وفات کے وقت ایرانی مصوری اپنے عروج پر تھی اور اس کا سہرا بہزاد کے سر ہے ۔

ہرات کے مٹ جانے سے تبریز میں صفویوں کے ہاں مصوری کو فروغ ہوا اور ساتھ ہی بخارا میں شیبستانیوں کے ہاں وہی ہراتی روایات فن قائم رہیں ۔ ان میں خاص کر میر علی ہروی کاتب اور محمود مذہب جیسے مصور قابل ذکر ہیں، جنھوں نے والیٔ بخارا کے تحت کام کر کے گراں بہا کارنامے انجام دیے ۔

اسی زمانے میں فرغانہ میں ظہیرالدین بابر نے حالات سے مجبور ہو کر ہندوستان کا رخ کیا ۔ جہاں اس نے ۹۳۲ھ میں ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست فاش دے کر سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھی ۔ بابر صرف

سپاہی نہ تھا ، آپ علوم وفنون سے بھی دلچسپی تھی جس کا سب سے بڑا ثبوت اس کی توزک ہے ۔ اس کا ایک مصور نسخہ ۱۵۹۳ء میں مکمل ہوا جسے بطور خاص شہزادہ نصیرالدین ہمایوں کے لیے فارسی میں تیار کروایا گیا تھا ۔ یہ نسخہ ریاست الور میں موجود ہے۔ بابر کے بعد ہمایوں تحت نشین ہوا تو وہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایران چلا گیا ، جب قسمت نے یاوری کی تو وہ ایران سے اپنے ہمراہ فن کاروں کو لے کر وارد ہند ہوا ۔ ان میں قابل ذکر خواجہ عبدالصمد شیریں قلم اور میر سید علی تبریزی وغیرہ ہیں جنھوں نے بہزاد کی روایات پر چل کر مصوری میں کمال پیدا کیا تھا ۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ داستان امیر حمزہ کو مصور کرنا تھا ۔ ہمایوں نے ان سے خود بھی مصوری کی تعلیم حاصل کی اور اپنے لڑکے اکبر کو مصوری کی تعلیم دینے پر مامور کیا ۔

اکبر ۱۵۵۶ء میں باپ کا جانشین ہوا ۔ اکبر کی عمر ابھی چودہ برس کے قریب تھی کہ تیموری تاج اس کے سر پر رکھا گیا ، اس کے اتالیق منعم خاں اور بیرم خاں وغیرہ نے اس کی عملداری کو مضبوط کرنے کی طرف توجہ کی ۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اکبر کے نازک شانے سارے شاید حکومت کا بار گراں نہ اٹھا سکتے۔ انہوں نے اپنے کم سن آقا کی ذمہ داریوں کو اپنے سر لے لیا ۔ اکبر نے ابتدائی مہموں سے فرصت حاصل کرتے فوراً علوم و فنون کی طرف توجہ کی ۔ بچپن ہی سے اسے مصوری اور قصے سننے کی طرف رغبت تھی ۔ میر سید علی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد شیریں قلم برابر اپنا کام کررہے تھے۔ اگرچہ وہ ابتدا میں کچھ ملول تھے مگر ان کے فن سے نوجوان بادشاہ کی دلچسپی نے ان کی ہمتیں بڑھا دیں ۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے داستان امیرحمزہ کو مصور کیا ۔ اکبر کی آرٹ اکاڈیمی میں ان دو ایرانی مصوروں کے علاوہ کئی ہندو مصور بھی بطور تلمیذ شریک ہوئے جن کو بہزاد قلم کے مصور کہا جاتا ہے ۔

اکبر کو جمالیاتی کیفیات کا صحیح اندازہ کرنے اور ان سے حظ اٹھانے میں خاص ملکہ حاصل تھا ۔ وہ دینی معاملات میں بھی ملکی مصلحتوں کی بنا پر نہایت درجہ وسیع المشرب تھا ۔ اس نے اپنے اس رویے سے ہر فرقے کو اپنی محبت سے مسخر کر لیا تھا ، خصوصاً راجپوتوں کو بہت قرب حاصل ہوا ۔ آرٹ اکیڈمی میں سب قسم کے مصور مل کر کام کرتے تھے ۔ ابوالفضل نے ایک ہندو مصور دسونتھ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک کہار کا لڑکا تھا ۔ اکبر نے اپنی دور رس جمالیاتی نگاہ سے اس کو دیکھا ، جب کہ وہ ابھی کم

سن بچہ ہی تھا اور دیوار پر نقش و نگار بنا رہا تھا ، جیسا کہ عام طور پر بچے بنایا کرتے ہیں، اکبر کی مردم شناس نظر تاڑ گئی کہ اس لڑکے میں اعلیٰ مصور بننے کے جوہر موجود ہیں۔ چنانچہ اس نے اسے خواجہ عبدالصمد کے سپرد کیا تو اس کی تعلیم سے وہ بے مثال مصور نکلا ۔ دسونتھ اپنے فطری جذبۂ مصوری میں اس قدر منہمک ہوگیا کہ نوجوانی ہی میں اپنا دماغی توازن کھو کر ختم ہوگیا ۔ اس کے کارنامے بذات خود اس کے اعلیٰ فن کار ہونے کی نشان دہی کرتے ہیں ۔ اکبر کو مصوری کا اس قدر شوق تھا کہ اس نے فتح پور سیکری میں دیواروں پر ان مصوروں سے تصاویر بنوائیں جن کے نشان آج تک باقی ہیں ۔

اکبر مصوری کے جمالیاتی پہلو سے اس قدر متاثر ہوا کہ دلائل کے ذریعے ہمیشہ یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ مصوری اسلام کی تعلیم کے خلاف نہیں ہے بلکہ معرفت الٰہی حاصل کرنے کے جہاں اور دوسرے طریقے ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے ۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے ، جب بعض سعادت مند لوگ انجمن خاص میں موجود تھے ، کہا تھا :

> " بہت سے لوگ مصوری کے پیشے کو برا بتلاتے ہیں ۔ مجھے یہ گوارا نہیں ۔ میرے خیال میں مصور خدا شناسی میں دوسروں سے بڑھ کر ہے ۔ جب وہ کسی جانور کی تصویر بناتا ہے اور ہر حصے کو الگ الگ کھینچتا ہے، مگر روح اور جسم میں رابطہ پیدا کرنے سے عاجز ہے تو وہ خالق حقیقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنے عجز سے معرفت الٰہی حاصل کرتا ہے ۔ یعنی اللہ کو ہی واحد خالق سمجھنے کا یہ ایک ذریعہ ہے ۔ "

اکبر نے اپنی سرپرستی میں علاوہ داستان امیرحمزہ کے سنسکرت کتابوں کے فارسی میں ترجمے کرائے اور ان کو مصور بھی کرایا ۔ ان کے اکثر نسخے آج بھی رزم نامہ کے نام سے ملتے ہیں ۔ اکبر نے بابر نامہ ، انوار سہیلی و طوطی نامہ وغیرہ جیسی اہم کتابوں کو مصور کرایا ۔ اس عہد کے امرا میں عبدالرحیم خانخاناں خاص طور پر قابل ذکر ہے جس نے اپنے ہاں الگ ایک شعبہ قلمی اور مصور کتابوں کے تیار کرنے کا قائم کیا تھا ۔ اکثر فن کار اس کے ہاں کام کرتے تھے ، جن میں میاں ندیم اور عبدالرحیم عنبریں قلم قابل ذکر ہیں ۔

اکبر کے بعد اس کے بیٹے جہانگیر کے ہاتھ میں زمام حکومت آئی ۔ وہ بچپن سے علم و فن کی گود میں پلا تھا اور جمالیات کا پتلا تھا ۔ شہزادگی کے

زمانے ہی سے اسے مصوری کا شوق تھا ۔ آقا رضا ہراتی اس کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتا تھا ۔ جہانگیر طبعاً حسن پرست تھا اور خوبی و زیبائی کا سچا قدردان تھا ۔ وہ تصویر بنانا نہیں جانتا تھا لیکن جمالیاتی اعتبار سے بہت بڑا نقاد فن تھا اور اچھے برے کو فنی اعتبار سے خوب پرکھتا تھا ۔ اس کی مہارت اور نظر کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی تصویر متعدد درباری مصور مل کر بناتے تو وہ بتلا سکتا تھا کہ کون سا حصہ کس کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے ۔ اس نے تزک میں سے وضاحت سے خود بیان کر دیا ہے ۔ اسے ایرانی دبستان مصوری سے خاص رغبت تھی اور اس نے وہاں کی اکثر تصاویر کو پسند کیا اور ان کی نقول بھی بنوائیں ۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے ایک مصور بشن داس کو اپنے سفیر خان عالم کے ہمراہ ایران روانہ کیا تاکہ شاہ عباس کی شبیہہ بنا کر لائے ۔ جہانگیر نے اپنے درباری مصوروں کو ان کے اعلیٰ نمونوں سے متاثر ہوکر خطاب بھی دئے ، چنانچہ اس نے ابوالحسن بن آقا رضا کو نادرالزماں کا خطاب اور منصور کو جو عام طور پر جانوروں کی تصاویر بنانے میں مہارت رکھتا تھا ، نادرالعصر کا خطاب عطا کیا ۔ اس کے دربار میں فرخ بیگ قلماق نادر سمرقندی ، محمد مراد ہاشم اور منوہر جیسے مصور بہت اعلیٰ کام کرتے تھے ۔ جہانگیر اکثر ان کو انعام و اکرام سے نوازتا اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا ۔ وہ بھی خوب عمدگی سے اپنے آقا کے اشارے پر اس کی مرضی کے مطابق تصاویر بناتے تھے ۔

اس زمانے کی مصوری میں ہمیں رومانیت زیادہ نظر آتی ہے ۔ قدرتی مناظر کی طرف بھی رجحان نظر آتا ہے ۔ جہانگیر کے مرقع کا عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے ، جس کا بیشتر حصہ برلن میں اور پونہ کے ایک پارسی امیر کبیر مسٹر اردشیر کے پاس راقم نے دیکھا ہے اور کچھ حصے بعض متفرق مجموعوں میں ہیں ۔ اس عہد میں شبیہات امرا کی طرف بھی توجہ مبذول ہوئی تھی ۔ اس ضمن میں جہانگیر کے ایک مصاحب عنایت خاں کی تصویر کا ذکر لازمی ہے جو پیالہ' افیون پیتا تھا اور مصور نے اسے بستر مرگ پر دکھایا ہے ۔ جہانگیر نے خود اس کی تصویر بنوائی تھی ۔ لیکن شبیہہ کشی کا ارتقا' شاہجہان کے عہد میں ہوا ۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ جہانگیر کو اہل فرنگ کی مصوری سے بھی دلچسپی تھی ۔ جس کا ذکر ہمیں اس عہد کے برطانوی سفیر سر ٹامس رو کے بیان میں ملتا ہے کہ اس نے کس طرح جہانگیر

کو سیاسی طور پر خوش کرنے کے لیے یورپی تصاویر اس کی خدمت میں پیش کی تھیں ۔ ان تصویروں کو جہانگیر کے درباری مصوروں نے اس طرح نقل کیا کہ وہ خود اصل اور نقل میں فرق نہیں کر سکا ۔ دیواروں پر اس عہد کے مصوروں نے تصاویر بنائیں جس کی مثال ہمیں لاہور کے قلعہ کی شمالی دیوار کی کاشی کاری میں نظر آتی ہے۔ غرضیکہ اکبر اور جہانگیر کے عہد کی مصوری میں وہی فرق ہے جو ان دونوں کے حالات اور سیرت میں ہے۔

جہانگیر کے بعد شاہ جہاں کا زمانہ سلطنت مغلیہ کی انتہائی اقبال‌مندی اور عروج کا عہد تھا ۔ شاہ جہاں کو اپنے باپ دادا کی طرح فنون لطیفہ سے جو خاص لگاؤ تھا اس کا مظاہرہ فن تعمیر سے زیادہ عیاں ہے ۔ اس نے تاج محل جیسا شاہ‌کار پیدا کیا جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ وہ نہایت عمدگی سے اکبر اور جہانگیر کا زمانہ دیکھے ہوئے تھا اور پھر منوہر، نادر سمرقندی ، انوپ چتر اور ہاشم جیسے با کمال مصور موجود تھے ۔ ایسے فطرت نگاری کے علاوہ شبیہ کاری کا زیادہ شوق تھا ۔ ان مصوروں نے جو مرقعے تیار کیے ان میں اس کے اپنے امرا کی شبیہیں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں ۔ چنانچہ شاہ جہاں کے عہد کی تصاویر میں سے اس کی تاج پوشی اور درباری امرا کے پیش ہونے سے متعلق تصاویر بہت اہم حیثیت رکھتی ہیں ۔ مرقع شاہ جہانی آج بھی محفوظ ہے ۔

شاہ جہاں کے لڑکے داراشکوہ کو بھی مصوری سے خاص رغبت تھی اور وہ تصوف کی طرف بھی مائل تھا ۔ وہ اکبر کی طرح ہندو پرور بھی تھا اور اسی کی طرح مذہب و سیاست ، علم و حکمت اور فنون و صنائع ، غرضیکہ زندگی کے سب شعبوں میں امتزاجی رجحانات کا حامی تھا ۔ اس کی اس خوش مذاقی کا ثبوت اس مرقع سے ہوتا ہے جو انڈیا آفس لندن میں اس کے نام سے موجود ہے۔ یہ مرقع اس نے اپنی چہیتی بیوی نادرہ بیگم (بنت شہزادہ پرویز بن جہانگیر بادشاہ) کو نذر کیا تھا۔ مگر قدرت کو منظور نہ تھا کہ شاہ جہاں کا یہ سب سے بڑا لڑکا داراشکوہ اس کا جانشین ہوتا ۔ چنانچہ حالات ایسے ہو گئے کہ اورنگ زیب کامیاب ہوا اور تخت و تاج کا مالک بنا ، اسے مصوری سے مطلق شوق نہ تھا ۔ البتہ اس نے سیاسی طور پر بعض درباری مصوروں سے ضروری شبیہات کو بنوا کر حالات کا جائزہ لیا ، جن میں اس کے اپنے لڑکے محمد سلطان کی شبیہہ بھی شامل ہے ۔ عالم‌گیر نے خطاطی میں کمال پیدا کیا اور فن تعمیر

سے دلچسپی لی، لاہور کی شاہی مسجد کو بنوایا جو دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ اورنگ زیب کے عہد میں فنون لطیفہ کو درباری قیود سے آزادی حاصل ہو گئی تھی اور فن کار اپنے اپنے انداز سے آزادانہ کام کرنے لگے۔ یعنی فنون امیرانہ ماحول سے نکل کر عوامی فضا میں آ گئے۔ اورنگ زیب کے بعد فن مصوری نے بالکل نئی صورت اختیار کر لی مگر فنیت کی حد تک اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔

قدیم گجراتی ادب

غلام حسین مصطفیٰ

ہندوستان کے جس علاقے کو آج گجرات کہتے ہیں زمانہ قدیم میں اس صوبے کا اصلی نام "لاٹ انارٹ" تھا اور کوہ آبو کے قریب "سری مال" اس صوبے کا پایہٗ تخت تھا۔ یہاں کے قدیم باشندے ناگ، چودھرا، ڈبلا، گونڈ اور بھیل کہلاتے تھے اور جو زبان یہ لوگ استعمال کیا کرتے تھے اسے "لاٹی" کہا جاتا تھا۔

پنجاب کی جنگ جو اور دلیر قوم گوجر کا ایک قافلہ سندھ، مالوہ اور راجپوتانہ کے صوبوں کو فتح کرتا ہوا صوبہ گجرات پر بھی قابض ہوگیا تھا۔ سابقہ دور کے مورخوں نے اس کی طرف قطعی خیال نہیں کیا کہ یہ گوجر کون تھے اور کس جگہ سے آکر پنجاب میں انھوں نے رہائش اختیار کی تھی۔ وہ آریائی تھے یا غیر آریائی، کوئی تاریخ ہم کو اس کے متعلق صحیح تفصیل نہیں بتاتی۔ بہرحال مختلف تاریخوں کے مطالعے سے اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس بہادر اور جری قوم کے نام سے آٹھویں صدی میں اس علاقے کا نام "گوجراترمنڈل" یا "گوجر اتربھومی" رکھا گیا تھا۔

بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ پراکرت زبان میں یہ گوجر "دیس گجرتا" کے نام سے مشہور ہوئے، سب سے پہلے البیرونی نے (۹۷۰ء۔ ۱۰۳۰ء) "کتاب الہند" میں اس صوبے کا نام "گجرات" لکھا۔

پانچ ہزار سال پہلے جب حالات نے پلٹا کھایا، آریائی قوم وسط ایشیا سے نکل کر یورپ اور ایشیا کے براعظموں میں جاکر آباد ہوگئی، وہاں اس دور کے ویدوں کی لکھی ہوئی "ویدک" زبان مروج تھی اور یہی سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ ویدک تورانی زبان کی دوسری شاخ تھی۔ جب آریائی قوم نے

مقامی باشندوں سے اپنے تعلقات بڑھانے چاہے تو ان کو سب سے پہلے لسانی دقت محسوس ہوئی ، چنانچہ انہوں نے ویدک زبان اور مقامی زبان کے ڈھانچے میں ردوبدل کرکے ایک نئی زبان کو رواج دیا جس کا نام ''سنسکرت'' رکھا ، اس لفظ کے معنی ''مہذب'' کے ہیں ۔

جب سنسکرت زبان نے مکمل زبان کی شکل اختیار کرلی تو یہ اس زمانے میں آج کی اردو کی طرح سارے ہندوستان کی ملکی زبان بن گئی تھی ۔ پھر رفتہ رفتہ یہ سنسکرت ملک کے دوسرے حصوں کی مختلف زبانوں کے غلبے ، طویق استعمال اور لب و لہجہ سے بدلنے اور بگڑنے لگی ۔ پھر ایک نئی زبان ''پراکرت'' نے جنم لیا ۔ اس دور میں چار زبانیں بولی اور سمجھی جاتی تھیں ۔ (۱) مہاراشٹری ۔ (۲) شورسینی ۔ (۳) ناگدھی ۔ (۴) پالی ۔

پراکرتوں سے ایک اور نئی زبان پیدا ہوئی جو ''اپ بھرنش'' اور ''گجرات بھرنش'' کے نام سے مشہور ہوئی ۔ ان دونوں زبانوں کی مدد سے (۹۰۰ء - ۱۲۵۰ء) ''گجراتی'' زبان نے جنم لیا ۔ اس زمانے کے مشہور و معروف شاعر پرمانند (۱۷۱۰ء - ۱۷۲۰ء) نے جن کو شاعر اعظم کا خطاب مل چکا تھا ، اپنی ایک نظم ''رسم اسکندھ'' میں ناگ و من کا قصہ لکھا ہے ۔ اس میں شاعر مذکور نے سب سے پہلے اس زبان کو ''گجراتی'' کے نام سے موسوم کیا ہے ۔ آجکل گجراتی بولنے والوں کی تعداد تقریباً سوا کروڑ ہے ۔ جس میں نواسی فیصد ہندو ، نو فیصد مسلمان اور دو فیصد پارسی اور دوسری قومیں ہیں ۔

گجراتی زبان جس علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے وہ علاقہ شمال میں سروھی(مارواڑ) ، جنوب میں بمبئی ، مشرق میں نندربار (خانوسینی) اور مغرب میں کچھ کاٹھیا واڑ کا سمندری علاقہ ہے ۔ کاٹھیاواڑ جسے شوراسٹر کہتے ہیں ، مرکزی لحاظ سے گجراتی زبان کا مخصوص علاقہ رہا ہے ۔ اس پورے علاقے کے علاوہ گجراتی زبان اور گجراتی تمدن کا اثر آج بھی سندھ کے ضلع تھرپاکر میں نظر آتا ہے ۔ گجراتی زبان کے بولنے لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد دنیا کے تقریباً ہر ملک میں موجود ہے ۔ اس لیے ایک شاعر نے مکمل طور سے حالات کا جائزہ لینے کے بعد کہا تھا کہ '' جہاں علاقہ' گجرات کا یا گجراتی سمجھنے اور بولنے والا رہائش اختیار کئے ہوئے ہے وہاں گجراتی زبان ہمیشہ موجود رہے گی ''

قدیم ہندوستان کی مختلف زبانوں پر جس طرح بیرونی زبانوں کا اثر پڑا اور ان میں مختلف طریقوں سے تبدیلی آتی رہی ، اسی طرح گجراتی پر بھی بیرونی زبانوں پرتگالی ، ڈچ ، فرانسیسی ، چینی ، ترکی اور انگریزی کا خاصا اثر ہوا جس کے باعث ان زبانوں کے بہت سے الفاظ اس میں گھل مل گئے اور وہ تمام الفاظ عام طور پر استعمال کئے جانے لگے ۔ گجراتی زبان بولنے والوں کی اکثریت ہمیشہ سے تاجر پیشہ رہی ہے اسی وجہ سے یہ دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ لچکدار ہے اور پسندیدہ بھی ۔ جب مسلمان بادشاہوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا تو پھر گجراتی زبان میں مندرجہ بالا زبانوں کے مروج الفاظ کے علاوہ عربی اور فارسی کے بھی بہت سے الفاظ شامل ہو گئے ۔

ہندوستانی لسانیات کے ماہر جان بیمس نے لکھا ہے کہ گجراتی زبان کے ایک سو حروف میں ۲۳ خالص سنسکرت ، ۶۶ اپ بھرنش اور ۱۱ بیرونی زبان کے حروف ہیں ۔

علاقہ گجرات میں جب بھرگر اور چیرون آریائی قبیلوں کی آمد شروع ہوئی تو وہ رفتہ رفتہ حالات پر قابو پاتے گئے یہاں تک کہ اس پورے علاقے پر مکمل طور سے اپنا قبضہ جما لیا اور ہر طرح کا انتظام خود سنبھال کر حکومت کرنے لگے ۔ سیورونس ، چندرگپت اور سمندرگپت کے زمانے میں آریائی کلچر اپنے پورے شباب پر تھا ۔ اس دور کے ادب اور زندگی کے تقریباً ہر شعبے پر جین فرقے کا گہرا اثر نظر آتا ہے ۔ ان کے مذہبی قصے ، کتابیں اور دیگر طبع شدہ لٹریچر جو مختلف کتب خانوں میں آج بھی موجود ہے ، وقت کی موجودہ زبان سے کافی متاثر نظر آتا ہے ۔ اس قسم کی کتابوں میں سب سے پہلی پراکرت زبان کے مشہور ادیب پادالیپتھ کی کتاب ترنگا نولا یا ترنگاوتی ہے ۔ اس مصنف کی اصل کتاب (جو پراکرت زبان میں لکھی گئی تھی) اب کہیں نہیں ملتی ۔ لیکن ڈاکٹر ارنسٹ کو اس کتاب کا ایک نسخہ بعد تلاش بسیار ملا تھا ، موصوف نے تحقیق کے بعد اس نسخے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی زبان پراکرت ہے ، کتاب میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ رومانی اور غیر حقیقی ہے ۔ قصے کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے ۔

کوسامی کے نگر سیٹھ کی لڑکی جس کا نام ترنگاوتی ہے ۔ جوان ، خوبصورت ، پڑھی لکھی اور ہنر میں اپنی ساتھیوں میں سب سے آگے تھی ۔

لڑکیوں میں جس قدر صفات ہونی چاہئیں تقریباً تمام اس میں موجود تھیں۔ وہ ایک دن اپنے محل کے باغیچے میں ''چکوا چکوی'' پرندوں کو دیکھ رہی تھی اور اس پرلطف منظر سے بہت مسرور نظر آرہی تھی۔ کیف و سرور کے عالم میں وہ اس قدر مدھوش ہوگئی کہ اس کو اپنے اردگرد کی کچھ خبر نہ ہوئی، یہاں تک کہ باغیچے کی ٹھنڈی ہوا نے اس پر غشی طاری کردی اور وہ سوگئی۔ چند لمحوں بعد اس کی سہیلیاں اس کی تلاش میں نکلیں اور جیسے ہی اس کے پاس پہنچیں ایک لڑکی نے بڑھ کر اس کو بیدار کیا۔ کھوئی کھوئی سی ترنگاوتی کی نگاہیں کسی کی تلاش میں تھیں۔ سہیلیوں کے اصرار پر پچھلے جنم کی کہانی ترنگاوتی نے بیان کرنی شروع کی کہ پچھلے جنم میں وہ بھی چکوی پرندہ تھی اور اپنے محبوب کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ ایک روز ایک شکاری اس علاقے میں آکر شکار کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا تھا کہ اتفاق سے محبوب چکوے کا ادھر سے گزر ہوا اور شکاری نے فوراً اس کو تیر کا نشانہ بنایا، چکوا تڑپ تڑپ کر مر گیا، شکاری نے چکوے کے مردہ جسم کے لیے چتا بنائی اور اسے نذر آتش کر دیا۔ ترنگاوتی کی نگاہیں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں، آخر میں ستی ہونے کے لیے چکوی اپنے محبوب چکوے کے جسم کے ساتھ جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔

پھر ترنگاوتی کو پچھلی زندگی کا خیال آتا ہے اور وہ اپنے محبوب چکوے کے غم میں کھو جاتی ہے۔ ہوش میں آتے ہی چکوے کا خیال اس کو پریشان کرتا ہے اور وہ اس کی تلاش میں چاروں طرف بھاگی بھاگی پھرتی ہے، انجام کار ناامید ہوکر اپنے محبوب اور پچھلے جنم کی مصوری کرنے لگتی ہے۔ اس نے تصویریں بنا بنا کر اپنے پاس جمع کرنی شروع کیں۔ اس طرح وہ اپنے دل کی پیاس بجھا کر کچھ مطمئن سی ہوجاتی تھی۔ وہ اکثر یہ تصویریں دوسروں کو دکھانے کے لیے بھی پیش کرتی تھی۔ تصویروں کے بغور مطالعے سے چکوا چکوی کی پوری زندگی کی جھلک نمایاں نظر آتی تھی۔

اسی گاؤں میں ایک ساہوکار کا لڑکا بھی رہتا تھا اور اس کی بھی تقریباً اسی طرح کی کہانی تھی۔ ان تصویروں کے دیکھنے کا اس کو اشتیاق ہوا۔ جب کامیابی حاصل ہوگئی اور ان تصویروں کو اس نے دیکھ لیا تو اس کو بھی اپنا پچھلا جنم یاد آگیا اور وہ بیہوش ہو گیا۔ ادھر ترنگاوتی اس کو بیہوش دیکھ کر میں خیالات غرق ہوجاتی ہے اور چکوے کا تصور اس کے دل و دماغ پر اس طرح

چھپا جاتا ہے کہ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوجاتی ہے کہ یہ کہیں وہی چکوا تو نہیں جس کو چتا میں جلایا گیا تھا۔ ابھی وہ انہی خیالات میں محو تھی کہ ساہوکار کے لڑکے کو ہوش آ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کی۔ یہ ملاقات رنگ لائی اور دونوں اس گاؤں سے بھاگ گئے۔ چھپتے چھپاتے ایک جنگل میں پہنچے، وہاں ڈاکوؤں کی نظر ان پر پڑی انھوں نے ان دونوں کو گھیرے میں لے کر پکڑ لیا اور کالی دیوی پر بھینٹ چڑھانے کے لئے ان کو لے گئے۔ راستے میں ایک ڈاکو نے اس جوڑے سے مخاطب ہوکر ان کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ واقعات سے جب اس کو آگاہی ہوئی تو ڈاکو یہ سمجھا کہ جس شکاری کا اس واقعے سے تعلق ہے، وہ خود ہی ہے۔ اپنے تمام ساتھیوں کو یہ ڈاکو تنہائی میں لے جا کر کچھ کہتا ہے اور اس کے بعد ان دونوں کو آزاد کر دیا جاتا ہے۔

آزادی حاصل کرنے کے بعد یہ دونوں واپس اپنے ماں باپ کے پاس آجاتے ہیں اور ان کے والدین ان کی واپسی پر خوشی خوشی ان کا استقبال کرتے ہیں۔ اس واقعے کے ایک سال بعد اس گاؤں میں ایک سادھو آتا ہے اور ان کے پچھلے جنم کی کہانی ہر ایک کو سناتا پھرتا ہے۔ ترنگاوتی اور ساہوکار کا لڑکا جو ازدواجی زندگی میں منسلک ہوچکے تھے، ان کو بھی اس سادھو کی (جو پہلے شکاری اور ڈاکو تھا) عجیب داستان سن کر حیرت ہوئی اور دونوں پر ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری ہوئی، یہاں تک کہ انھوں نے اپنے ازدواجی تعلقات توڑ کر جین مذہب کو قبول کرلیا اور الگ الگ قوم کی خدمت میں لگ گئے۔

اس قصے میں اس وقت کے ادب اور زندگی کی صحیح تصویر نظر آتی ہے۔ اس زمانے کے بعد گپت خاندان کا دور ختم ہوجاتا ہے، اور اس کے تھوڑے عرصے بعد سنہ ۷۶۵ء میں نبد راج کا دور شروع ہوا۔ اس نے جاوڑا، انہل، واڑ پٹن نام کے شہر بسائے جن میں عوام کو مذہبی تبلیغ کی پوری پوری آزادی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ جے سین سدھراج کے زمانے میں یہ ایک عظیم الشان سلطنت بن گئی۔

اس دور (سنہ ۱۰۸۹ء) میں ایک ساہوکار کے گھر ایک لڑکا تولد ہوا، اس کا نام جوتشیوں کے مشورے سے "چانگا" رکھا گیا۔ چانگا کی عمر جب آٹھ سال کی ہوئی، اس کی ماں نے اسے ایک سادھو کے حوالے کر دیا تاکہ وہ قاعدے کے مطابق بہترین تعلیم حاصل کر سکے۔ یہ وہی چانگا ہے جو تاریخ میں جین سادھو ہیم چندر سوری آچاریا کے نام سے مشہور ہے۔ اسی سادھو نے اپنے

زمانے میں گجرات کے راجاؤں اور گجرات کے تفصیلی حالات اور ادب پر متعدد کتابیں لکھ کر اس زمانے کے لوگوں پر گہرا اثر ڈالا تھا - ادبی نقطۂ نگاہ سے اس کی تصانیف بہترین سمجھی جاتی ہیں - اس کی نظم کے متعلق چند مورخین کا خیال ہے کہ نظم میں حقیقت سے گریز کیا گیا ہے اور تخیل کی ایسی بلند پروازی دکھائی گئی ہے کہ قیاس سے بھی بعید معلوم ہوتی ہے- بہر حال یہ سادھو اپنے دور کا کامیاب مصنف کہلایا -

۱۲۹۶ء سے ۱۴۰۰ء تک کا زمانہ گجراتی ادب میں انتشار کا زمانہ تھا- قدیم گجراتی زبان آہستہ آہستہ ترقی کر رہی تھی - ایک طرف مارواڑ کے راجا کے درباری شاعر پدما ناتھ (سنہ ۱۴۵۶ء) اور اس کے زمانے کے دوسرے شعرا اپنی شاعری میں راجا مہاراجاؤں کے جنگ و جدل کے قصے نظم کر رہے تھے اور دوسری طرف لوگ گیتوں اور شادی بیاہ کے گیتوں کے ذریعے عوامی معاشرت کی تصویر کشی ہو رہی تھی - اس دور سے آج تک عوام نے اس طرح کے ادب کی مکمل طور سے حفاظت کی ہے -

سوم سندر جس نے سب سے پہلے گجراتی میں عشق و محبت کے گیت لکھے ، ایک جین سادھو تھا - ''رنگ ساگر نیمی خاگ'' اور ''وسنت ولدسی'' اس کی مشہور کتابیں ہیں- ان کتابوں میں ایک محبت کی دیوانی دوشیزہ کی کہانی نظم کی گئی ہے- یہ کہانی سوم سندر کے زمانے کے حالات اور واقعات کی یاد دلاتی ہے-

بھالانا شاعر نے بان بٹ کی مشہور کتاب ''کادمبری'' کو گجراتی زبان میں منتقل کیا- اس نے اپنی تصانیف میں گجراتی زندگی کی صحیح تصویریں کھینچی ہیں اور جذبات و واقعات اور ازدواجی زندگی کے خاکے بہت دلکش انداز سے پیش کئے ہیں - اس کی تصانیف نے بہت شہرت حاصل کی اور عوام میں بہت مقبول ہوئیں -

پدما ناتھ جو ذات کا برہمن تھا، گجرات کا پہلا جوشیلا شاعر ہے- اس کی مشہور تصنیف ''کھانڑادے پربند'' گجراتی کا پہلا رزمیہ ہے- اس طویل نظم میں جھالور کے مہاراجا کھانڑ اور اسی خاندان کے مہاراجا کرن اور علاءالدین خلجی کے درمیان جو جنگ ہوئی تھی اس کا نقشہ اس انداز سے کھینچا ہے کہ صحیح صحیح واقعات آنکھوں کے سامنے آئینے کی طرح واضح ہو جاتے ہیں اور دل پر بہت اثر کرتے ہیں-

کرن نے جو چوہان کا راجا تھا ، اپنے وزیر مادھو کی بھائی کے ساتھ برا سلوک کیا جس سے ملدھو کا دل بہت متاثر ہوا اور انتقام لینے کی غرض سے وہ دلی روانہ ہو گیا۔ ۱۲۹۷ء میں علاءالدین خلجی کی کرن سے ملاقات ہوتی ہے اور کرن ، علاءالدین خلجی کو گجرات فتح کرنے کا مشورہ دے کر اس کو اس بات پر تیار کر لیتا ہے کہ گجرات کو فتح کر کے دم لینا ہوگا ۔ لہذا جنگ کے ارادے سے ان کی روانگی ہوتی ہے۔ چوہان خاندان کا راجا کھانڑ اپنے مٹھی بھر لشکر کے ساتھ میدان جنگ میں آجاتا ہے۔ اس جنگ میں بے شمار آدمی کام آئے ، مزید کمک کے لیے راجپوتنیاں میدان جنگ میں لڑائی کے جوہر دکھانے کے لیے نکل کھڑی ہوئیں اور اپنے شوہروں کی طرح اس جنگ میں کام آئیں ۔ کھانڑ اور اس کا لڑکا ویرم بھی لڑتے ہوئے مارے گئے۔ یہ جنگ جس میں گھر کے گھر تباہ ہوگئے ، بارہ سال تک لڑی جاتی رہی ۔

پدما ناتھ نے محبت کے ایک فرضی افسانے کو اپنی مذکورہ تصنیف میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سلطان علاءالدین خلجی کی بیٹی فیروزہ کو کھانٹر کے لڑکے ویرم سے محبت ہو جاتی ہے اور یہ فیروزہ آٹھ سال تک دونوں حکومتوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرتی رہی مگر ہر مرتبہ اس کو ناکامی ہوتی ہے۔ اخر ویرم جب جنگ میں مارا گیا تو فیروزہ نے اس کا سر دلی منگوانے کا حکم بھیج دیا ۔ جیسے ہی اس کے حکم کی تعمیل ہوئی اور سر سامنے آیا تو محبت کی متوالی شہزادی نے سر کو ہاتھ میں لیا اور دریائے جمنا میں چھلانگ لگا کر خود کشی کر لی ۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی فتح ہوئی ۔

اس جنگ کے بعد گجرات میں سب سے پہلے مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی ۔ اسی دور میں دلی میں علاءالدین خلجی کے درباری شاعر امیر خسرو نے بھی اس قصے کو لکھا ہے۔ لیکن وہ اس برھمن شاعر پدما ناتھ کے بیان کردہ قصے سے مختلف ہے ' انھوں نے لکھا ہے کہ علاءالدین خلجی کو کرن کی بیوی منہل دیوی اور اس کی لڑکی سے محبت ہوگئی تھی ۔

قدیم گجراتی ادب میں پدما ناتھ اور سوم سندر کے علاوہ جو شاعر گزرا وہ نرسی مہتا (۱۴۰۰ء سے ۱۴۸۰ء) تھا ۔ وہ اپنے دور کا بہت ھی مقبول شاعر مانا جاتا ہے ۔ اسی دور میں اور بھی چار شعرا کے نام قابل ذکر ھیں ۔ اساعیتھ (۱۳۶۱ء) سری دھردیاس (۱۳۹۸ء) بھیم (۱۴۱۰ء) عبدالرحمان (۱۴۲۰ء) ۔

عبدالرحمان گجراتی ادب میں پہلا مسلمان شاعر گزرا ہے۔ اس نے '' سند یشکھ داس '' نامی کتاب لکھی ، جس میں کھمایت کی حقیقت اور ازدواجی زندگی کے نمونے پیش کیے گئے ہیں ۔ اس دور میں مذہبی رنگ عروج پرتھا ۔ خصوصاً غربی سمندر کے چھوٹے چھوٹے جزیرے بہت زیادہ متاثر تھے ۔

دسویں صدی سے تیرھویں صدی تک ہندوستان میں بھگتی ادب کا خوب زور رہا ، مورخین نے بھگتی ادب کے اس دور کو عروجی دور کہا ہے ۔ اسی زمانے میں رادھا کرشنا کی محبت میں شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں جو بہت مقبول ہوئیں اور آج بھی بعض علاقوں میں یہ نظمیں لاتعداد لوگوں کو زبانی یاد ہیں ۔

راماننند کا جو فرقہ پیدا ہوا ، اس کا اثر عام طور پر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اور خصوصاً گجرات پر زیادہ ہوا ۔ سولھویں صدی میں نرسی مہتا اور میراں بائی بھگتی کے مشہور شعرا گجرات میں گزرے ہیں ۔ انھوں نے انسان دوستی کا پیغام ، گجرات اور قرب وجوار کے علاقوں میں مسلسل گھوم پھر کر سنایا ۔ ان دونوں شاعروں نے لامذہبیت کے خلاف آخری دم تک جد و جہد جاری رکھی ۔ نرسی کے دادا سرکاری محکمے میں دیوان تھے اور میراں بائی ایک بھگت کی (جو اعلا خانداں سے تعلق رکھتے تھے) پوتی تھی ۔ یہ خاندان اپنی قابلیت اور اخلاق میں یکتا تھا ۔ میراں کے دادا بھگتی زبان کے ماہر تھے ۔ اس دور کے عوام نے ان کی تصانیف پر غور نہیں کیا اور نہ کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش کی ، جس کے باعث حالات ان کے موافق نہ رہے اور چند غلط اثرات کی وجہ سے ان کو سزا ہو گئی اور وہ جیل بھیج دیئے گئے ۔ رہائی کے بعد وہ اس شہر کو خیرباد کہہ کر مستقل سکونت کے خیال سے مارواڑ چلے گئے ۔ یہاں آنے کے بعد ان میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ اپنے دیرینہ مشن کو قائم رکھتے ۔

نرسی مہتا کی شاعری جو آج کل کی کتابوں میں ہم کو ملتی ہے وہ ان کی اصل زبان میں نہیں ہے ۔ ان کے زمانے میں پرانی گجراتی زبان بولی جاتی تھی ۔ جب نرسی مہتا کتھا کرشن کی بھگتی میں کھو جاتے تھے تو ہاتھوں میں کھڑتال لے کر بھجن الاپنا شروع کر دیتے تھے ۔ یہی ان کا خاص مشغلہ تھا، اس موقع پر جب کہ وہ بھجن گانے میں مشغول ہوتے تو ان کے قریب بیٹھے ہوئے ان

کے شاگرد بھجنوں کو یاد کرلیا کرتے تھے، اس طرح یہ بھجن عام مقبولیت حاصل کر گئے - سالہا سال تک لوگوں کی زبان پر ان بھجنوں کا چرچا رہا اور برابر گائے جاتے رہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ گجراتی زبان جیسے جیسے بدلتی رہی، ان بھجنوں میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ کرشن کی بھگتی کی محویت میں گم ہوکر نرسی نے ایک موقع پر کہا :

سانبھڑرے　توں　سجنی　موری*
میرے تو گردھر گوپال دوسرا نہ کوئی

نرسی کی نظموں میں بھی دلکشی اور مسحور کن لوچ نظر آتا ہے - نظم " ماڑارے ورنی پالکی " میں وہ انسان کے آخری سفر یعنی موت کا بیان ، شادی بیاہ کی زبان میں ظاہر کرتا ہے - کبھی منصور حلاج کی طرح اپنے کلام میں اپنے خیالات اس طرح پیش کرتا ہے "تج ہو تج ہوں " یعنی میں وہی ہوں ' میں وہی ہوں -

نرسی کے ساتھ ھی میران بائی کا نام گجراتی ادب میں اہمیت رکھتا ہے - میراں چتوڑ کے راجا کی بہو تھی - دستور کے مطابق مورتی کی پوجا پاٹ عام تھی۔ مگر میراں بائی کو مورتیوں کی پوجا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے اس نے پرانے سسرال کے خاندانی دیو کی مورتی کے آگے پوجا کرنے سے انکار کردیا - کیوں کہ اس کا کہنا تھا کہ " گووند پران کر مار " - میراں کے نزدیک یہ مورتیاں اس کے دل و دماغ کی صحیح ترجمانی نہیں کرتی تھیں - جس کے باعث وہ ایسے مشاغل اختیار کرنا چاہتی تھی کہ عوام حقیقت کی جیتی جاگتی تصویر اپنے دل کے اپنے میں رکھ لیں اور اس پر عمل پیرا ہوں مگر مہاراجا چتوڑ میراں کے اس خیال سے نفرت کرنے لگا تھا ، اسی وجہ سے یہاں اس کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی - اس کا ہم خیال کوئی نہیں تھا - مجبوراً میراں بائی کو اسی ایک خیال کی وجہ سے چتوڑ چھوڑنا پڑا اور وہ اپنے میکے واپس آ گئی - یہاں بھی اس کے بھائی اور چچا نے اس کے اسی خیال کے پیش نظر اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا - چناں چہ وہ پریشان ہو کر کاشی چلی گئی۔ وہاں بھی دماغی سکون میسر نہ آنے کے باعث بندرابن میں قیام پزیر ہوئی ، حالات نے میراں کو یہاں بھی نہ جمنے دیا اور اس نے مجبوراً گجرات کے مشہور شہر ڈاکور میں رہائش اختیار کی - زندگی کے انقلابات نے اس کے دل اور دماغ

---

* یعنی اے میری محبوبہ تو سن! میرے لیے تو سب کچھ ہے، یہ جگہ کوئی دوسرا حاصل نہیں کر سکتا -

پر اس درجہ اثر کیا تھا کہ مزید تکالیف اٹھانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ آخر وہ ڈاکور میں کرشنا کے مندر میں ۱۴ سال تک رہی ۔ زندگی کا قیمتی اور آخری وقت اس نے یہیں گزارا ۔ اس دوران میراں کا چچا اور بھائی مندر میں اس کے پاس آئے اور واپس گھر چلنے کو کہا ۔ گفتگو طول پکڑ گئی مگر میراں گھر جانے سے مستقل انکار کرتی رہی ، جب اس کو زیادہ تنگ کیا گیا تو وہ مندر کی ایک مورتی کے قریب پہنچی اور واپس نہ لوٹ سکی ۔ اس کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ میراں جیسے ہی کرشن کی مورتی کے قریب پناہ لینے پہنچی ، اسی وقت وہ مورتی میں جذب ہو کر رہ گئی ۔

اس زمانے کی گجراتی اور برج بھاشا میں زیادہ فرق نہیں تھا ۔ نرسی کی طرح میراں بائی کے بھجنوں کو بھی اس کے شاگرد یاد کر لیا کرتے تھے اور اس طرح بھجن عام طور پر گائے جاتے تھے ۔ عرصہ دراز کے بعد اس کے بھجنوں میں لفظی تبدیلیاں ہونے لگیں ، پھر بھی عوام کے دلوں کو موہ لینے والے واقعات نے اور بھجنوں کی شستگی زبان نے لوگوں کے دلوں بہت اچھا پر اثر کیا ۔

آج سے تقریبا پچاس سال پہلے یہ مشہور تھا کہ گجراتی زبان کی ابتدا نرسی اور میراں بائی سے ہوئی تھی ور اس زمانے میں صرف مذہبی ادب کو زیادہ فروغ ہوا تھا ۔ اس دور کو بھکتی کا زمانہ کہا جاتا ہے ۔ مگر یہ زیادہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ ہمیں اس زمانے کی چند قلمی کتابیں ایسی ملی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بھکتی ادب کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف ، قصیدوں ، افسانوں اور مختلف فنون پر مشتمل کتابیں بھی لکھی گئی تھیں ۔ جن میں بن شری دھرکا ، راناسل چھند ، بھیم کا ہربودہ ، بتیرلسیی اور شاھرن وغیرہ قابل ذکر ہیں ، جو بعض کتب خانوں میں موجود ہیں ۔

نرسی اور میراں بائی کے زمانے میں بڑودہ میں ماکر نامی ایک وشنو شاعر گزرا ہے ، جو آکھیاں لکھ کر برھمنوں کو دے دیا کرتا تھا اور یہ برھمن جگہ جگہ ان کو گاتے پھرتے اور اسی سے روزی کمایا کرتے تھے ۔ آکھیاں لکھنے والوں میں ادھو اور وشنوداس بھی تھے مگر انھوں نے کافی کوشش کے باوجود ادب میں کوئی بہتر مقام حاصل نہیں کیا اور نہ ان کی آکھیاں عوام میں مقبول ہو سکیں ۔

۱۶۰۰ء میں بچھراج نے ''رس منجری'' کے نام سے افسانوں کی ایک کتاب لکھی جس نے ادب میں خاص مقام حاصل کیا ۔ ویسے اس کی اور تصانیف بھی ہیں

مگر اس کی شہرت افسانوں کی اسی کتاب سے وابستہ ہے - ۱۶۵۳ء میں نیچ ذات سے تعلق رکھنے والا وکسنا نامی ایک شاعر گزرا ہے۔ اس نے بچپن سے ایک سادھو کے ساتھ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا اور عالم شباب میں "سکھ دیو آکھیاں" نامی ایک کتاب لکھی - اس کی ادب نوازی کو مورخین نے بہت سراہا ہے اور جگہ جگہ اس کی تعریف بھی کی ہے۔

اکھا شاعر (۱۶۷۱ء تا ۱۷۳۰ء) احمد آباد میں گزرا ہے - وہ سنار کا پیشہ کرتا تھا اور ایمانداری میں بہت مشہور تھا - جہانگیر کے زمانے میں احمد آباد کی ٹکسال میں یہ اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اس کو صرف اسی لیے اتنے بڑے عہدے پر رکھا گیا تھا کہ ملنسار ، خوش اخلاق ، صاحب ذوق اور ایماندار تھا - مگر اس کا دل اس ملازمت میں نہ لگا اور وہ دنیاوی جھمیلوں سے تنگ آکر مرشد کی تلاش میں نکل گیا - چند خود غرض اور مکار لوگوں نے فقیر کے روپ میں اس کو اپنا بنانے کی کوشش کی - چوں کہ یہ بلا کا ذہین تھا اس لیے ان کی چکنی چپڑی باتوں میں نہیں آیا - اس نے حالات سے متاثر ہو کر ایسے لوگوں کے لیے ایک طویل نظم لکھی جس میں اس نے ان فقیروں کی بداعمالیوں کو بے نقاب کیا ہے - ایک جگہ ایسے فقیرں کے متعلق لکھا ہے : " تصوف کا انھیں علم نہیں اور نہ ان میں سمجھنے کی اہلیت ہے ، ایسے آدمیوں نے مرشد کا لباس پہن لیا ہے ، یہ لوگ مرشد تو بڑی ہمت سے بن جاتے ہیں مگر ان کی مثال ایسی ہے کہ خود ان کے گلوں میں تو وزنی پتھر بندھا ہوا ہے اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ میں تمھیں اس دریا کے پار نکل دوں گا - "

آکھا نے ان فقیروں کے متعلق بڑی تعداد میں نظمیں اور ۷۴۶ چھپے لکھے ہیں - اس کی ویدانتی شاعری میں ابہام زیادہ نظر آتا ہے - اس کی لکھی ہوئی چار کتابوں میں " آکھے گیتا " بہت مشہور ہے -

پر مانند گجراتی زبان کا عظیم شاعر تھا اور عوام نے اس کو " شاعر اعظم" کا لقب دیا تھا - پرمانند نے اپنی محنت اور مشقت سے گجراتی زبان کو سنوار کر اسے نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا - یہ کام اس نے ایسے وقت میں انجام دیا جب (۱۶۹۲ تا ۱۷۹۰ء) راج درباروں میں گجراتی زبان کی کوئی قدر نہ تھی ، اسی وجہ سے اس زمانے میں یہ مثل زبان زد خاص و عام تھی :

اے تیے کے سولہ آنے   الھے گھوئے کے انے بار

اکڑم تکڑم آنھٹی آنے		سو سال پیسہ چار

اس مثل سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور میں اردو بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی ، یعنی پچھتر فیصد ۔ مارواڑی بولنے والوں کی تعداد اردو سے کم یعنی پندرہ فیصد ، مرہٹی بولنے والوں کی تعداد اردو اور مارواڑی سے کم یعنی چھ فیصد اور گجراتی بولنے والوں کی تعداد اردو مارواڑی اور مرہٹی سے کم یعنی چار فیصد تھی ۔ اس تناسب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسے دور میں جب کہ گجراتی بولنے والوں کی تعداد برائے نام تھی ، شاعراعظم پرمانند نے انتہائی کوشش اور جانفشانی سے ادب میں ایک خاص مقام پیدا کیا ۔ اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ جب تک گجراتی زبان کو عروج پر نہ پہنچا دوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا ۔ ان کوششوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ پرمانند روزانہ حسب معمول رات کو پیتل کا گھڑا لے کر بازار میں جا بیٹھتا اور انگوٹھی سے گھڑے پر چوٹ لگا کر اسی تال میں گیت گایا کرتا تھا ۔ ان گیتوں میں وہ مذہبی روایات بیان کیا کرتا اور مذہب کی طرف لوگوں کو ترغیب دیتا تھا ۔ لوگ ان گیتوں کو بہت شوق سے سنتے تھے اور مذہبی معلومات سے فیضیاب ہوتے تھے ۔ اس کی آ کھیان جن کی تعداد کئی سو ہے ، آج بھی دیہاتوں میں لوگ گا کر اپنے دل کی تسکین کرتے ہیں ۔ پرمانند کا دور اپنی مثال آپ ہے اور جو مقصد اس نے اپنی زندگی میں متعین کیا تھا ، اس نے کافی حد تک اس میں کامیابی حاصل کر کے نام پیدا کیا ۔

پرمانند کے بعد سامل (۱۷۴۰ء) نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے شروع کئے اور سنسکرت کے افسانے گجراتی زبان میں پیش کرنے کا سلسلہ جاری کیا ۔ اس طرح گجراتی زبان کو عوام میں مقبول بنایا ۔ سامل کے افسانے سننے کے لیے لوگ دور دور کے دیہاتوں سے بھی آیا کرتے تھے ۔ سامل کے افسانوں کی تعریف سن کر ایک متمول دیہاتی نے اس کی محفلوں میں آنا شروع کیا ، وہ اس حد تک متاثر ہوا کہ اسے اپنے ساتھ دیہات میں لے جا کر کھیتی باڑی کے لیے زمین دے دی اور افسانے لکھنے کے لیے ہر طرح کی سہولت اور امداد بہم پہنچائی ۔ سکون و اطمینان کی حالت میں سامل نے گجراتی زبان کو عام کرنے میں جس قدر جدو جہد کی ہے وہ سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے ۔

سامل کو نسوانی کردار اچھے پیرائے میں پیش کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا ۔ وہ اپنے افسانوں میں عورتوں کے متعلق جس قدر واقعات تحریر کرتا تھا وہ حقیقتی معلوم ہوتے تھے اور پڑھنے والوں کے سامنے ماحول کی تصویر سی کھنچ جاتی تھی - افسانوں میں عورتوں کو بہادر اور جری دکھایا جاتا تھا تا کہ عورتوں کے دل مضبوط ہوسکیں ۔

سامل کے بعد ولبھ اور میواڑو وغیرہ شاعر گزرے ھیں مگر ادب میں ان کا کوئی مقام نہیں ھے۔ قدیم گجراتی کا سب سے آخری شاعر دیا رام (۱۸۲۰ء) گزرا ھے۔ اس نے اپنی زندگی کے پچھتر سال بھجن بھگتی کے گیت لکھنے میں صرف کئے ، اس نے اپنے بھجنوں میں لوگوں کو سیدھے راستے پر چلنے اور حق بات کہنے کی نصیحتیں کی ھیں -

دیارام کے زمانے میں بھگتی کے گیت جن شعرا نے گائے اور عوام میں مقبول ہوئے وہ یہ ھیں :

۱- پیتم داس ۔ اس دور کے حالات سے متاثر ہو کر اور پرانی تصانیف کے مطالعے کے بعد مستقبل کے معماروں میں نئی روح پھونکنے کا ارادہ کر کے اس نے میدان ادب میں اپنے گیتوں کی وجہ سے خاص مقام حاصل کیا ۔

۲- دھیر بھگت - بچپن سے اس کا دل گیتوں کی طرف راغب تھا ، تنہائی اور فرصت کے اوقات میں گیتوں کی جو کتاب بھی مل جاتی تھی اس کو وہ دل لگا کر پڑھا کرتا تھا ۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا ۔ اس نے جب خود گیت لکھنے شروع کئے تو ان دوستوں نے ھمت بڑھائی ۔

۳- بھوجا بھگت - اسے تعلیم حاصل کرنے کا شوق بہت زیادہ تھا ۔ مختلف استادوں سے مختلف فنون کی کتابیں پڑھیں ۔ مقامی لوگوں کے علاوہ دور دراز کے رہنے والے بھی اس کے گیت سننے کے لیے آیا کرتے تھے ۔ اس کے کلام میں جوش پیدا کرنے والا عنصر بنیادی حیثیت رکھتا ھے ، طرز ادا بھی جاذب توجہ ھے ۔ یہ شاعر عوام میں بہت مقبول تھا ۔

بادۂ کہن

شاہ عالم آفتاب کی غیر مطبوعہ غزل

عاجز ہوں تیرے ہاتھ سے ، کیا کام کروں میں
کر چاک گریباں ، تجھے بدنام کروں میں

رم رہتا ہے اے تند خو گو اب کے تو مجھ سے
پھر دیکھ تو کیسا ہی تجھے رام کروں میں

ہے دور جہاں میں مجھے سب شکوہ تجھی سے
کیوں کچھ گلۂ گردش ایام کروں میں

حیراں ہوں ترے ہجر میں کس طرح سے پیارے
شب روز کو اور صبح کے تئیں شام کروں میں

آوے جو تصرف میں مرے میکدہ ساقی
یک دم میں خموں کے خم انعام کروں میں

مجھ کو شہ عالم کیا اس رب نے ، نہ کیوں کر
اللہ کا شکرانۂ اکرام کروں میں

میرا افسانہ

ملا واحدی*

پیدائش اور بچپن :

میں ۱۷/ رمضان المبارک ۱۳۰۵ ھجری مطابق ۱۷/ مئی ۱۸۸۸ عیسوی کو، جمعے کے دن، صبح صادق کے وقت، بھائی میر سلطان علی والے مکان واقع کوچہ چیلاں، گلی مسجد کالے خاں میں پیدا ہوا۔ یہ مکان ۱۳۰۵ ھجری تک میرے والد کا تھا، پھر والد ماجد نے اپنے چچا زاد بھائی کے بیٹے میر سلطان علی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ گلی مسجد کالے خاں کے کل مکان فوجدار خانیوں کے تھے، صرف ایک کٹھرا حافظ غیاث الدین کی ملکیت تھا، جس میں چمار بستے تھے۔ ان چماروں سے ہمارا آپس داری کا سا معاملہ تھا۔ وہ ہمارے کام آتے تھے، ہم ان کے کام آتے تھے۔ کل مکانوں کو بیچ میں دروازے اور کھڑکیاں چھوڑ چھوڑ کر ایک دوسرے سے ملا رکھا تھا۔ گلی مسجد کالے خاں کے باھر کی بائیں جانب سڑک پر دور تک فوجدار خانیوں ھی کی جائداد تھی۔ کھڑکیاں اور دروازے ان تک بھی پہنچے تھے۔ گلی مسجد کالے خاں کے سامنے بھائی سید ابوالحسن کا عظیم الشان مکان تھا، اور وہ مکان، جسے میرے والد ماجد نے میری پیدائش کے بعد تعمیر کرایا تھا، اور میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو اسی میں دیکھا، اور پچاس سال مسلسل اسی میں رہا اور اسی سے ۱۹۴۷ع میں کراچی منتقل ہوا۔ یہ

---

* اردو کے صاحب طرز انشا پرداز ملا واحدی نے اپنی سوانح عمری لکھی ہے، جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کا ایک حصہ ادارہ "اردو" کی درخواست پر انھوں نے اشاعت کے لیے مرحمت فرمایا ہے۔

تھی محلے کا بڑا مکان تھا ، مگر بھائی سید ابوالحسن کے مکان کے برابر بڑا نہیں تھا ۔

۱۸۷۶ء میں میرے والدین کے ہاں سید محمد اقبال پیدا ہوئے تھے ۔ ۱۸۷۸ع میں اللہ نے انہیں واپس بلا لیا اور بارہ برس میرے والدین اولاد کو ترستے رہے ، حتیٰ کہ انہیں ایک لڑکی کو متبنیٰ کرنا پڑا ۔ یہ دور اولاد سے گھبرانے کا نہیں تھا ، اولاد کی قدر کا تھا ۔ دعائیں دی جاتی تھیں ، دودھوں نہاؤ ، پوتوں پھلو ، اولاد کے کٹھہرے بسیں ۔ بارہ برس تعویذ گنڈوں میں کٹے ۔ سنا ہے پھوپی حضرت بیگم کے شوہر ، پیر جی حافظ سید عبدالوہاب رات کے بارہ بجے جمنا میں جا کھڑے ہوتے تھے اور ختم پڑھتے تھے ۔ آخر ایک روز میرے والد کے پیرو مرشد حضرت مولانا شاہ فضل الرحمان صاحب گنج مرادآبادی رحمتہ اللہ علیہ نے دعا کی کہ یا اللہ محمد مصطفیٰ کو بیٹا عنایت کر ۔ اللہ تعالیٰ نے اسی سال مجھے دنیا میں بھیج دیا ۔

چوں کہ بہت ترسا کر بھیجا گیا تھا ، غیر معمولی خوشیاں منائی گئیں ، ناز و نعم کے ساتھ پرورش شروع ہوئی ۔ تعلیم کے لیے روپیہ جمع کیا جانے لگا ۔ ماں باپ اپنے اوپر خرچ نہ کرتے تھے ، مجھ پر خوب خرچ کرتے تھے ۔ والد ماجد کرشن ملز اور دلی کلاتھ ملز کے حصے خریدتے رہتے تھے تاکہ میری تعلیم میں کبھی رکاوٹ نہ پیدا ہو ۔

چمڑے کا سوٹ کیس اور ہولڈال تو بڑی چیزیں ہیں ، والد ماجد دلی سے باہر جاتے تھے یا باہر سے دلی تشریف لاتے تھے تو کپڑوں کے لیے ٹاٹ کا بیگ ہوتا تھا اور بستر سُتلی سے باندھا جاتا تھا ۔ گھر سے اسٹیشن اور اسٹیشن سے گھر بغل میں بستر دبائے اور ہاتھ میں کپڑوں کا تھیلا لٹکائے چلے جاتے تھے اور چلے آتے تھے ۔ سواری اور قلی لینا ان کے نزدیک بیماری کی علامت تھی ۔

والد ماجد کا سنہ پیدائش ۱۸۵۰ع ہے ۔ انتقال ۳۱/ دسمبر ۱۹۰۱ء کو بحالت ملازمت ہوا ۔ پچپن (۵۵) سال سے عمر کم تھی ، لیکن بہر حال بڑھاپے کا آغاز تھا ۔ اس بڑھاپے میں درگاہ حضرت سلطان نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ علیہ ہمیشہ پیدل آتے جاتے تھے ۔ کوچہ چیلاں سے درگاہ سلطان جی کا فاصلہ ساڑھے تین میل ہے ۔ ایک دو مرتبہ درگاہ حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ سے بھی پیدل آئے گئے ۔ اس درگاہ کا فاصلہ کوچہ چیلاں سے گیارہ میل ہے ۔ میں نے والد ماجد کو عیدین کے

سوا گھوڑا گاڑی میں سوار نہیں دیکھا - عید گاہ کوچہ چیلاں سے اتنی بعید تھی کہ وہ نماز پڑھنے شاید وہاں بھی پیدل ہی پہنچ جاتے لیکن میں نہیں پہنچ سکتا تھا - مجھے نماز عید پڑھوانے گھوڑے گاڑی میں لے جاتے تھے -

میرے ابتدائی نو دس سال دلی میں نہیں گزرے۔ اٹاوے اور کان پور کے دیہاتوں اور جنگلوں میں گزرے - چھ دن پلول ضلع گوڑگانو میں بھی قیام کیا - آخری قیام پلول ہی کا تھا - دیہاتوں اور جنگلوں میں رہنے کے وقت بھی دلی کے پھیرے لگائے جاتے تھے - پھیروں کے بس دو واقعے یاد ہیں، ایک دفعہ (غالباً ۱۸۹۳ع میں) لیس دار ٹوپی اور ریشمیں اچکن (۱) اور کان پوری شوز (۲) پہنے کسی دیہاتی ریلوے اسٹشن کے پلیٹ فارم پر ٹرین سے اتر

---

(۱) شیروانی نہیں اچکن - شیروانی ابھی عام نہیں ہوئی تھی - اچکن شیروانی اور انگرکھے کے درمیان کا لباس تھا - اچکن میں انگرکھے کی کی طرح کمر پٹی لگائی جاتی تھی - اچکن کو پٹی نکال کر اور ذراسی تراش بدل کر شیروانی بنادیا گیا ہے - اچکن چست رہتی تھی، شیروانی تر رکھتے تھے-

(۲) کلکتے کے انگریزی جوتے اس زمانے میں مشہور تھے - ان کے بعد کان پور کے انگریزی جوتے پسند کئے جاتے تھے - دلی میں کامدار سلیم شاہی جوتوں کا رواج تھا - دلی میں سادی جوتیاں بھی بے مثل بنتی تھیں - خوشنما ، ہلکی اور مضبوط - لیکن انگریزی جوتے دلی کے اچھے نہیں ہوتے تھے - ڈاسن وغیرہ ولایت کے تیار کردہ جوتوں کا رواج بھی کم تھا - میں نے ڈاسن کا جوتا دلی آ کر سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں پہنا - سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک کان پور کے جوتے یا دلی کی کامدار سلیم شاہی جوتیاں پہنتا رہا - کان پور کے شوز ڈھائی تین روپے میں مل جاتے تھے - اور دلی کی کامدار سلیم شاہی جوتیاں بھی ڈھائی تین روپے میں مل جاتی تھیں - ڈاسن کا پہلا شوز بارہ روپے میں خریدا تھا - یہ وہی ڈاسن ہے جس کا نام حضرت اکبر الہ آبادی کے اس شعر میں آیا ہے :

جوتا ڈاسن نے بنایا، میں نے اک مضمون لکھا
میرا مضمون رہ گیا ، ڈاسن کا جوتا چل گیا

حضرت اکبر نے "جوتا چل گیا" کے محاورے کو باندھا ہے اور اہل قلم

(جاری)

کڑ لچل رہا تھا ۔ کچھ کنواریوں نے جو ٹرین کے اندر بیٹھی ہوئی تھیں آپس میں کہا : '' اری اس چھوکرے کو دیکھو ، کتنا اتراوے ہے '' ۔ اور میں فوراً بھاگا اور اپنے درجے میں چڑھ گیا اور مجھے محسوس ہوا کہ میری چال میں واقعی کوئی خرابی تھی ۔ والدہ نے بھی نصیحت فرمائی کہ '' ہاں اترا کر اور اینٹھ کر نہیں چلنا چاہیے (۱) ۔

دوسری دفعہ (غالباً ۱۸۹۰ع میں) ہم پلول سے اونٹ گاڑی میں آ رہے تھے ۔ جب دلی دروازے سے دلی میں داخل ہوئے اور دریا گنج (فیض بازار) پہنچے تو سامنے غلاظت کی گاڑی (کرانچی) دکھائی دی جس کا مہتر ڈرائیور پہلوانوں کی طرح موٹا تھا ، وہ گاڑی چلاتا جاتا تھا اور گانا گاتا جاتا تھا ۔ اس کی آواز سریلی تھی' مجھے بھلی لگی اور آج تک میرے کانوں میں گونجتی ہے ۔ مہتر سری کرشن جی سے خطاب کر رہا تھا اور کرشن مراری ، کرشن مراری کہ رہا تھا ۔ میرے دل پر کرشن مراری کا نقش سا جم گیا ' حالاں کہ میں مطلق نہیں جانتا تھا کہ کرشن مراری کون ہیں (۲) ۔

(جاری)

کی بد حالی کا ذکر کیا ہے ۔ انگریزوں کے زمانے سے پہلے یہ حال نہیں تھا ۔ مسلمان بادشاہ جوتا کاری کو بھی روکتے تھے اور اہل قلم کی بھی قدر کرتے تھے ۔

(۱) اللہ کا بھی یہی حکم ہے : ولا تمش فی الارض مرحا ۔ انک لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولاً'' زمین پر (اترا کر اور) اینٹھ کر مت چلو ۔ (زمین پر زور زور سے قدم مار کے) زمین کو پھاڑ نہیں سکتے ۔ اور (نہ گردن کی رگیں کھینچ کے) پہاڑ کی اونچائی تک پہنچ سکتے ہو ۔ (سورہ ۱۷ آیت ۳۷)

(۲) آواز کا جادو بڑا موثر ہوتا ہے ۔ اللہ مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ موذن اور پیش امام ہمیشہ خوش آواز رکھیں ۔ بد آواز سے اذان دلوانا یا نماز میں قرات قرآن کرانا بعض اوقات غضب ڈھا دیتا ہے ۔ مولانا رومی اپنی مثنوی میں لکھتے ہیں کہ کوئی بد آواز شخص اذان دینے کا شوقین تھا ، محلے والوں نے چندا جمع کیا اور کہا : '' یہ روپیا لے اور حج کرنے چلا جا ، کچھ عرصے تو تیری آواز سے ہم محفوظ رہیں'' ۔ وہ حاجیوں کے قافلے کے ساتھ روانہ ہوگیا ۔

(جاری)

میری بڑی بہن کا نام روشن آرا بیگم تھا - روشن آرا بیگم اگرچہ متبنیٰ تھیں ، مگر میرے والدین کہا کرتے تھے کہ شاہ فضل الرحمان صاحب کی دعا اور روشن آرا کے قدموں کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے بیٹا عنایت فرمایا ہے - میں نے ہوش سنبھالا تو ایک بہن اور موجود تھیں ، گوہر آرا بیگم ، ان میں اور روشن آرا بیگم میں فوقیت تھی تو روشن آرا بیگم کو تھی - گوہر آرا بیگم تین چار برس کی ہو کر مر گئیں - ان کا مرنا یاد ہے (۱) یہ یاد نہیں ، کہاں مری تھیں - نکسیر پھوٹی تھی ، جنگل میں طبیب میسر نہ آیا - گوہر آرا مجھ سے دو برس چھوٹی تھیں - ان سے تین برس چھوٹی گیتی آرا بیگم اور گیتی آرا بیگم سے تین برس چھوٹے حاجی سید محمد مرتضیٰ - سب کی ولادت میرے سوا قصبات اور دیہات اور جنگلوں میں ہوئی تھی -

ایک میلی سی کوٹھی یاد ہے - کوٹھی گاؤں سے الگ ، نہر کے نزدیک تھی - کوٹھی کا طول و عرض کافی تھا ، اور اس کے چاروں طرف کا صحن (لان) تو آموں اور امرودوں کا پورا باغ تھا ، میں اور روشن آرا بیگم امرودوں کو تو ہاتھ نہ لگاتے تھے اور آم کھانے سے ہاتھ نہ روکتے تھے - آم ٹپ ٹپ گرتے تھے اور ہم اٹھا اٹھا کر کھاتے تھے - جیسے مزے کے اور قسم قسم کے آم

(جاری)

لیکن راستے میں بھی اذان کا شغل جاری تھا - ایک دن کچھ لوگ مٹھائی اور پھلوں کے خوان سروں پر اٹھائے اس کے پاس آئے اور بولے : "ہمارے یہودی آقا کی بیٹی اسلام کی طرف مائل تھی اور باپ کے سمجھانے اور روکنے کے باوجود مسلمان ہونے کے لیے تیار تھی - آج تیری اذان سن کر لڑکی کا دل اسلام سے پھر گیا ، ہمارا آقا قافلے کا ممنون ہے کہ قافلہ تجھے لایا - تو اذان نہ دیتا تو ہمارے آقا کے سر سے یہ مصیبت نہ ٹلتی - اس نے سارے قافلے کے لائق مٹھائی اور پھل بھیجے ہیں"۔

(۱) گوہر آرا بیگم کا جنازہ مجھے نہیں دیکھنے دیا گیا تھا - جنازہ میں نے سب سے پہلا دلی آنے کے بعد کوچہ چیلاں کے ایک صاحب کا دیکھا جو مسجد کالے خاں میں لا کر رکھا گیا تھا - اس سے پہلے میں جنازے کا نام بھی نہیں جانتا تھا - اس جنازے کا دل پر آج تک اثر ہے - وہ جنازہ محمد مرزا خاں کے بیٹے اور فضل علی خاں کے والد کا تھا -

وہاں کھائے پھر کبھی نہیں کھائے اور تعداد کا تو سوال ہی کیا تھا - (۱) آم ٹپکتے نہیں تھے برستے تھے - آم کھاتے تھے اور گھر کی بھینسوں کا دودھ پیتے تھے - وہ مزہ اور لاتعدادی کراچی کے امرا بھی تصور میں نہیں لاسکتے - دودھ کی افراط سے گھن آنے لگی تھی، مگر آموں کی افراط سے جی نہیں اکتاتا تھا -

پلول میں ہمارا قیام ہندوانہ مکان میں تھا، جس کے دروازے کے ادھر ادھر دکانیں تھیں - دروازہ صحن میں کھلتا تھا اور صحن کی بغلوں میں گودام تھے - ان گوداموں اور دکانوں کے اوپر رہائشی کمرے تھے اور صحن ہمارے گھوڑوں اور بھینسوں کے لیے وقف تھا - دودھ کی ہمارے ہاں نہریں بہتی تھیں - دودھ سے دہی جمتا تھا، مکھن نکلتا تھا اور گھی بنتا تھا - پلول میں آموں کی کثرت نہیں تھی، لیکن دودھ، دہی، مکھن اور گھی کی کثرت تھی - اور ہاں جلیبیوں کی بھی - میں ان پانچوں چیزوں سے گھبراتا تھا اور والدہ کہا کرتی تھیں: "کھالے، پھر یہ نعمتیں نصیب نہیں ہوں گی"- پلول سے پہلے میں نے جلیبی نہیں دیکھی تھی، اور پلول میں بھی فقط جلیبی دیکھی، اور مٹھائیاں نہیں دیکھیں - مگر ان جلیبیوں کی کیا تعریف کروں، واقعی نعمت تھیں - وٹامن بی کیا کام کرے گی جو چار آنے سیر کی جلیبیاں کرتی تھیں -

۱۹۱۴ء تک دلی میں جلیبیوں اور بیشتر مٹھائیوں کا بھاؤ فی سیر بارہ آنے تھا، لہٰذا میرا گمان ہے کہ ۱۸۹۶ء میں پلول کی جلیبیوں کا بھاؤ فی سیر چار آنے ہوگا، ورنہ اس وقت میں بھاؤ واؤ سے واقف نہیں تھا - دلی میں ۱۹۱۴ء تک اچھی بھینس کی قیمت چالیس پچاس روپے تھی - اور گھوڑا تانگے سمیت

---

(۱) ۱۹۳۹ء کی بات ہے - میر محمد حسنین، تحصیل دار دہلی نے اپنے وطن ضلع مظفر نگر کے ایسے ہی باغ میں میری اور خواجہ حسن نظامی صاحب کی دعوت البہ کی تھی اور چار پانچ گھنٹے وہی سماں رہا تھا، جو اپنی کوٹھی کے باغ میں روز رہتا تھا - میر حسنین، اللہ بخشے خوبیوں کے آدمی تھے - وہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۴۷ء تک میرے پڑوسی رہے - قانون گو ہوکر دلی آئے تھے، وہیں صدر قانون گو بنے، وہیں نائب تحصیل دار اور تحصیل دار - انہیں دلی کی مخلوق جتنا جانتی تھی اتنا کسی اور تحصیل دار کو نہیں جانتی تھی - ان سے اہل دہلی محبت کرتے تھے -

(جاری)

۱۹۱۷ء میں ڈھائی سو روپے کا میں نے خریدا تھا ۔ اس لیے ہمارے بلول کے گھوڑوں اور بھینسوں پر تعجب نہ کیجیے ۔ میرے والد کی ڈھائی سو روپے ماہوار تنخواہ تھی، جسے آجکل کے تین ساڑھے تین ہزار کے برابر سمجھنا چاہیے اور ہر شے کا بھاؤ آجکل کی نسبت بیس گنا اور پچیس گنا کم تھا ۔

بلول چونکہ آباد قصبہ تھا ۔ مجھے گھوڑے پر چڑھنے کی اجازت نہیں تھی ۔ جنگل کی رہائش کے زمانے میں ہر وقت گھوڑا تھا اور میں ۔ میرے لیے گھوڑا نہیں تھا گھوڑی تھی، نہایت شریف، بڑھیا گھوڑی ۔ میرا سائیس چودہ پندرہ برس کا، ھندو پوربیا لڑکا، شورتن تھا ۔ مجھے چھ برس کی عمر سے آٹھ برس کی عمر تک اس گھوڑی نے سواری دی اور اس سائیس نے لگام پکڑ کر گھوڑی کو دوڑایا، مگر میں گرا کبھی نہیں ۔

(جاری)

میرا اور میر صاحب کا ھوا خوری کا ساتھ تھا ۔ کبھی کبھی ٹیلیفون کرنے بھی تشریف لاتے تھے ۔ ایک مرتبہ رات کے گیارہ بجے مجھے آن جگایا اور فرمایا دو کام میں کبھی نہیں کروں گا ۔ ایک تو گھر پر ٹیلیفون نہیں لگواؤں گا ۔ ٹیلیفون لگ گیا تو آپ کی صرف ایک روز کی نیند خراب ہوئی ہے، میری روز کی نیند خراب کردی جائے گی ۔ دوسرے تحصیل میں بجلی نہیں گھسنے دوں گا ۔ پانچ سات آدمی تحصیل کے کمروں میں چھت کے پنکھے کھینچ کر بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں ۔ بجلی گھسی تو یہ غریب بھوکے مریں گے ۔

جنگل میں ساتھ کھیلنے کے لیے صرف تین لڑکے تھے ۔ ایک شورتن، سائیس اور دو کبیر خاں اور وزیر خاں (کبیرا اور وزیرا) امام خاں، خدمت گار اور اس کی بیوی رحمت کے بیٹے ۔ میں ان میں سے کسی کے ساتھ نہیں کھیلتا تھا ۔ میں تو کھیلنے لگتا، وھی احساس کمتری کی وجہ سے الگ الگ رہتے تھے اور میری کچھ فطرت ہے کہ جو مجھ سے الگ الگ رہے، خود اس کی طرف نہیں بڑھتا اور اگر کوئی پہل کرے تو اس طرح بڑھتا ھوں، جس طرح خواجہ حسن نظامی کی طرف بڑھا، خواجہ فضل احمد کی طرف بڑھا، مولانا عارف ھسوی کی طرف بڑھا، مولانا راشدالخیری کی طرف بڑھا، بھیا احسان کی طرف بڑھا، خان بہادر

(جاری)

شورتن کی ماش کی دال کا آج تصور کرتا ہوں تو منہ میں پانی بھر آتا ہے اور اپنے بچوں پر اور آج کل کی تمام پود پر ترس کھانے لگتا ہوں۔ بڑی سی پیتل کی چمکدار تھالی میں شورتن گرم گرم دال مٹی کی سوندھی سوندھی ہنڈیا سے پلٹتا تھا اور آدھ پا کا ڈلا، گھی کا، اس دال کے اوپر لڑکاتا تھا اور مجھے بلاتا تھا کہ ''اؤ کھاؤ— ادا کی دال، ہٹی ہٹی مچان (اڑد کی دال ہے اور ہری ہری مرچیں ہیں) کھالو دال مزے کی ہے''۔ اس وقت تو میں کیوں کھاتا لیکن اب اس کا تصور مزا دیتا ہے۔ اب تو شاید سید امجد علی، سابق وزیر مالیات پاکستان و حال جانشین سر محمد ظفراللہ خاں در یو۔ این۔ او کا خاندان بھی اپنے کارخانہ وزیر علی اینڈ سنز کا تلو ہی استعمال کرتا ہوگا۔ روز ریڈیو میں بار بار اعلان کیا جاتا ہے:

''اماں تلو میں پکاؤ۔ ہم کو لکھنا پڑھنا ہے، سب سے آگے بڑھنا ہے، ملک کی خاطر کام کریں گے، اونچا اس کا نام کریں گے۔ اماں تلو میں پکاؤ، ہمیں صحت مند بناؤ۔''

(جاری)

حبیب الرحمان کی طرف بڑھا۔ بڑھ سکتا ہوں، پہل نہیں کرسکتا۔ خالہ نورجہاں اپنے بیٹے محمد ادریس اور خالہ حاجی اپنے بچوں، معین الدین وغیرہ کو لے کر ہمارے ہاں مہمان آتی تھیں۔ مگر معین الدین چار سال چھوٹے تھے اور بھائی ادریس تین سال بڑے۔ اس زمانے میں چھوٹائی بڑائی کا لحاظ کیا جاتا تھا، تاہم بھائی ادریس بزرگانہ شان سے میری طرف بڑھے اور میری ان کی اڑسٹھ سال نبھی۔ وہ بھائی ہی نہیں تھے بچپن کے دوست بھی تھے، بزرگ دوست جیسے بھائی فضل احمد ہیں۔ قاری عباس حسین مجھ سے فقط چار برس چھوٹے ہیں، لیکن یوں ملتے ہیں گویا میں چچا ہی ہوں۔ یہی برتاؤ میرا بھائی ادریس کے ساتھ تھا اور بھائی فضل احمد کے ساتھ ہے۔ بھائی ادریس نے ہمیشہ مجھے تم کہ کر مخاطب کیا۔ میں ان کے لیے آپ اور جناب کے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ تم کہنے والے اب تنہا بھائی فضل احمد باقی ہیں اور تو کو تو کان ترس گئے۔ حقارت کے تو کو نہیں، محبت کے تو کو کان ڈھونڈھتے ہیں۔

۱۹۳۹ء تک تو کہنے والی خالہ نور جہاں زندہ تھیں۔ اچھا ہوا میں شورتن اور کبیرا وزیرا کے ساتھ نہیں کھیلا، ورنہ ان سے کون سی اچھی باتیں سیکھتا، البتہ اس کا ایک برا نتیجہ نکلا کہ میری طبیعت میں اکل کھرا پن جم گیا۔ بے حد تنہا پسند ہوں۔

میری تعلیم :

تعلیم میری جاری ہو چکی تھی - دلی میں بسم اللہ کی تقریب دھوم دھام سے منائی گئی- جنگل میں پھوپی حضرت بیگم کے فرزند سید عبدالسلام صاحب نے انگریزی شروع کرائی اور والد کے عملے کے کسی آدمی نے اردو - حساب کا سبق والد ساجد خود دیتے تھے - بھائی عبدالسلام نے ہمارے خاندان میں ، قاری سرفراز حسین (۱) کے بعد ، سب سے پہلے انٹرنس پاس کیا تھا اور تلاش ملازمت کے لیے ہمارے ہاں ٹھیرے ہوئے تھے (۲) - میرے بھانج داماد سید

---

(۱) قاری سرفراز حسین کی والدہ میرے والد کی ماموں زاد بہن تھیں- قاری صاحب ہمارے خاندان میں غیر معمولی قابلیت کے انسان تھے - پاس تو انہوں نے علی گڑھ کالج سے صرف ایف اے کیا تھا، لیکن ان کے انگریزی میں لکھے ہوئے مضامین یورپ اور امریکہ کے رسالوں میں چھپتے تھے - دینی معلومات اُن کی مولویوں جیسی تھیں - بیگم صاحبہ بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم نے تبلیغ اسلام کرنے انہیں انگلستان اور جاپان بھیجا تھا - لکھنؤ کے مرزا محمد ہادی رسوا کے مقابلے کے ناول نویس تھے - دینی کتابیں بھی تصنیف کیں اور زندہ دلی تو ان کی مشہور تھی - علی گڑھ کالج پہنچ جاتے تھے تو علی گڑھ کالج میں زندہ دلی آجاتی تھی - منشی عنایت اللہ ابن شمس العلما منشی محمد ذکا اللہ نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ سرفراز حسین کے سر میں اللہ تعالا نے چالیس آدمیوں کا بھیجا بھرا تھا ، لیکن اس نے اللہ کی نعمت کا صحیح استعمال نہیں کیا - منشی عنایت اللہ، قاری صاحب کے ہم جماعت رہ چکے تھے اور تادم مرگ دوست رہے- قاری صاحب کے بیٹے ، قاری عباس حسین ، نامور اخبار نویس، سابق سب ایڈیٹر ہمدرد دھلی ، آج کل کراچی میں مفلوج پڑے ہیں- دوسرے بیٹے قاری اخلاق حسین ہمدرد دواخانہ دھلی کے اسسٹنٹ ایڈمنسٹریٹر ہیں - قاری عباس حسین بھی آخری زمانے میں اخبار نویسی ترک کرکے ھندوستانی دواخانہ دھلی کے جنرل مینیجر ہوگئے تھے اور پھر ھندوستانی دواخانہ لاھور کے جنرل مینیجر رہے تھے -

(۲) بھائی عبدالسلام کے والد سید عبدالوھاب صاحب کہا کرتے تھے کہ عبدالسلام کو ماموں نے نوکری نہیں دلوائی - عبدالسلام مایوس ہوکر دلی واپس آرھا تھا- انگریز ایگزیکیٹو انجینیئر نے ریلوے اسٹیشن پر پکڑلیا اور بولا، کہاں جاتے ہو ، نوکری ہم سے لو - رشتہ داروں میں اس قسم کی نوک جھونک رہتی ہے، یہ بات مجھے اس وقت سے معلوم ہے-

حبیب احمد جو یو ۔ این ۔ او ۔ میں اعلا عہدیدار ہیں اور ساڑھے چھ ہزار روپے ماہوار تنخواہ پاتے ہیں ، ان ہی عبد السلام صاحب کے بیٹے ہیں ۔

مجھے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا ۔ جس دن بھائی عبدالسلام نے انگریزی شروع کرائی ، اسی دن میں نے انگریزی اخبار میں حروف بتا دیئے کہ یہ اے ہے یہ بی ہے ۔ حساب سے جی بولاتا تھا ۔

۱۸۹۷ء میں والد ماجد نے حکم دیا کہ سارا گھر دلی جاکر رہے تاکہ میری تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہو ۔ ایک صاحب ، حبیب الرحمان میرے رشتے کے چچا تھے ، انھوں نے اسی سال انگریزی کا مڈل(۱) پاس کیا تھا ۔ وہ دس روپے ماہوار پر مقرر کیے گئے کہ دن بھر مغز ماریں اور دو سال کے اندر اس قابل کر دیں کہ پانچویں جماعت میں لے لیا جاؤں ۔ حبیب الرحمان صاحب جوان تھے ، مجھے ان کا سلیقہ بہت پسند آیا ۔ ہمارے مکان کے قریب ہی ان کا مکان تھا ۔ شادی ابھی نہیں ہوئی تھی ' لیکن ایک ضعیف ماں ، ایک اپاہج بھائی عبد العلی اور بھائی کی بیوی (۲) کا خرچ ان کے ذمے

---

(۱) اس زمانے میں اردو مڈل بھی تھا ۔ انگریزی اور اردو ، دونوں مڈلوں کے امتحان انٹرنس کی طرح یونی ورسٹی لیتی تھی ۔ اور مڈل پاس حساب میں طاق سمجھے جاتے تھے ۔ انھیں انگریزی میں صرف انٹرنس کا امتحان دینا پڑتا تھا ۔

(۲) ان کی بیوی نے اپاہج شوہر کو ایسی خندہ پیشانی سے نباھا کہ اللہ کی طرف سے انھیں اس کا انعام ملا ، اپاہج شوہر مرگئے تو میر جمال الدین کی بیوی بنا دیا ۔ میر صاحب دلی کے خوش حال حضرات میں تھے ۔ پہلی بیوی کے لڑکوں کو ان کی مدد کی ضرورت نہیں تھی ۔ کوئی ڈی ۔ ٹی ۔ ایس تھا، کوئی کاروبار کرتا تھا ۔ ان بیوی سے بھی لڑکا پیدا ہوا ، جس کا نام ماں کے نام پر محمد مغنی رکھا گیا ۔ ماں کا نام مغنی بیگم تھا ۔ محمد مغنی جرمنی سے انجینیئری سیکھ آئے اور جرمن بیوی ساتھ لائے ۔ محمد مغنی کی ایک لڑکی پاکستان کے ایر مارشل اصغر خاں سے منسوب ہے ۔ محمد مغنی دلی میں ہیں ۔ اب مغنی بیگم کی قسم کی صابر و شاکر بیویاں نہیں دکھائی دیتیں ۔ میں نے کئی دیکھی ہیں ۔ ایک حافظ عزیز حسن بقائی ، ایڈیٹر پیشوا کی حقیقی خالہ تھیں، جو میرے رشتے

(جاری)

تھا۔ دو تین لڑکے انھوں نے میرے علاوہ بٹھا لیے تھے۔ جن سے پانچ سات روپے اور آمدنی ہو جاتی تھی۔ سولہ سترہ روپوں میں کیوں کر گزارا ہوتا تھا، آج کل اس کا سمجھنا دشوار ہے، لیکن یقین کیجیے، چچا حبیب الرحمان شام کو سیر کرنے نکلتے تھے تو نظر آتا تھا کہ آج کل کا سات آٹھ سو روپے پانے والا جا رہا ہے۔ قمیص، پاجامہ، شیروانی، سب کپڑے ٹھیک تراش کے اور اجلے۔ سر پر پھندنے دار ترکی ٹوپی، پیروں میں انگریزی جوتے۔ دن صاحب موصوف کا ہمارے ہاں گزرتا تھا۔ ایک کمرہ اور ایک کوٹھری ان کے سپرد تھی۔ اپنے گھر ضروریات سے فارغ ہونے، کھانا کھانے اور سونے جاتے تھے۔ کھانا کیسا کھاتے تھے اس کا علم نہیں، ہاں خمیرہ گاؤ زبان عنبری جواہر والا ضرور تیار کراتے تھے اور اسے ہمارے گھر کی کوٹھری میں رکھتے تھے۔ کوٹھری صاحب موصوف کی تحویل میں تھی، میں بھی اس میں نہیں جا سکتا تھا۔ بلا ناغہ روزانہ خود خمیرہ نکالتے اور کھاتے تھے۔ شام کو کپڑے بدلتے اور سیر کرنے جاتے تھے۔ گھر کا لباس حسب ذیل تھا :

مضبوط موٹے کپڑے کا تہبند اور مضبوط، موٹے کپڑے کی نیم آستین۔ کہیں سے فوجیوں کے بوٹ خرید لیے تھے اور کاٹ کر ان کے سلیپر بنا لیے تھے۔ وہ سلیپر صاحب موصوف کے پیروں میں بیسیوں برس چلے اور ان کے مرنے کے بعد ورثے میں چھوٹے بھائی کو ملے۔"

ہمارے مکان کے سامنے مسجد تھی، مسجد کالے خاں (۱)۔ سر پر رومال

(جاری)

کے پھوپی زاد بھائی سید آغا میر سے بیاہی ہوئی تھیں۔ آغا میر نہایت سیدھے اور بھولے انسان تھے۔ مگر انھوں نے سیدھے اور بھولے شوہر کو کامل شرافت سے نبھایا۔ وہ خود بڑی سگھڑ اور سمجھدار عورت تھیں۔ ہمارے خاندان میں ان کا جواب نہیں تھا۔

(۱) کالے خاں اس مسجد کے کوئی خوش بخت موذن تھے کہ ان کا نام زندہ ہے، ورنہ یہ مسجد در اصل مولانا شاہ رفیع الدین یا مولانا شاہ عبدالقادر کی تھی۔ ہمارے مکان کے آگے کی سڑک پر دو مسجدیں ہیں، ایک یہی مسجد کالے خاں، دوسری کھجور والی مسجد، رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے دفتر ہمدرد و کامریڈ سے متصل۔ ایک مسجد میں مولانا شاہ رفیع الدین درس

(جاری)

لپیٹ کر نماز باجماعت پابندی سے ادا کرتے تھے، ویسے ننگے سر بیٹھتے تھے۔ سیر کو جاتے تھے تو گرمی میں بھی جرابیں چڑھاتے تھے۔ جرابوں میں پیوند اپنے ہاتھ سے اتنا خوبصورت لگاتے تھے کہ جرابیں نئی ہو جاتی تھیں۔ قلیل آمدنی میں اس قدر اچھی زندگی بسر کرنا کچھ تو صاحب موصوف کے سلیقے کی وجہ سے تھا اور کچھ یوں کہ ملکہ وکٹوریا کے زمانے تک مہنگائی نے پاؤں نہیں نکالے تھے۔ مہنگائی تو پہلی جنگ عظیم کے بعد سے بڑھی ہے۔ ۱۹۱۳ء تک گرمی کی شیروانی کا گبردن چھ آنے گز بکتا تھا۔ کرتے کی ململ اور پاجامے کا لٹھا ادنادرجے کا تین آنے ہلکہ ڈھائی آنے گز اور اعلا درجہ کا نو آنے گز۔ ویسا لٹھا اب ناپید ہے۔ جنگ عظیم سے آدمیوں کی تعداد بجائے گھٹنے کے یکایک بڑھ گئی کہ بکری کا گھٹیا گوشت چھ پیسے سیر سے آج ساڑھے چار روپے سیر ہے۔ جس میں ساڑھے چار روپے سیر کا گوشت خریدنے کی طاقت نہ ہو ایسے گھٹیا گوشت کھانے کا بھی حق نہیں رہا۔ ۱۹۱۳ء سے پہلے بڑھیا گوشت دو آنے سیر تھا۔ جنگ عظیم سے قبل ہرگوشت خور کو گوشت کھانے کا حق تھا۔ جنگ عظیم نے معیار زندگی بلند کر دیا۔ بھائی عبدالسلام، جن کا اوپر ذکر آیا ہے، تیس روپے ماہوار کے ملازم ہوئے تھے۔ ترقی کرتے کرتے سو روپے تنخواہ ہوگئی۔ انھوں نے انگریز افسر سے شکایت کی کہ سو روپوں میں پورا نہیں پڑتا۔ اس انگریز نے پوچھا تیس روپے میں کیسے پورا پڑ جاتا تھا۔ انھوں نے جواب دیا حضور! پہننے، اوڑھنے، کھانے، پینے اور رہنے سہنے کے وہی نرخ کر دیجے جو تیس روپے تنخواہ کے وقت تھے، میں سو چھوڑ کر تیس لینے کو تیار ہوں۔

میں اپنی تعلیم کا حال سناتے سناتے دوسرا قصہ لے بیٹھا۔ 'خبر' عبوقے حبیب الرحمان صاحب کا سلیقہ تو پسند تھا، مگر پیٹنا پسند نہیں تھا۔ اس زمانے میں استاد علم کو گھول کر پلا دینا چاہتے تھے، اور شاگرد نہیں پیتا

(جاری)

دیتے تھے، دوسری مسجد میں مولانا شاہ عبدالقادر، کوچہ چیلان سے نکل کر محلہ کلاں محل میں مولانا شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ تھا۔ اس جگہ میونسپل کمیٹی کا بورڈ "مدرسہ شاہ عبدالعزیز" تا دم تحریر ہذا آویزاں ہے۔ تینوں شاہ صاحبان امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ کے بیٹے تھے۔ چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی تھے، مولانا شاہ اسماعیل شہید کے والد۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

تھا تو آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ اب اُستادوں کو شاگردوں سے ویسا تعلق نہیں رہا ہے، اس زمانے کے اُستاد شاگردوں کو اسی جذبے سے پیٹتے تھے، جس جذبے سے ماں باپ اولاد کو پیٹا کرتے ہیں، اور حبیب الرحمان تو نرے اُستاد نہیں تھے، چچا بھی تھے۔ لیکن بہر حال، اس وقت مجھے ان کا پیٹنا پسند نہیں تھا، ناگوار تھا۔ جو اور لڑکے ان سے پڑھتے تھے، وہ اتنا نہیں پٹتے تھے، جتنا میں پٹتا تھا۔ میری خفیف سی غفلت اور خفیف سی غلطی ان کا غصہ بھڑکا دیتی تھی۔ آج میرے دل میں اس جذبے کی قدر ہے، اس وقت نہیں تھی۔ اس زمانے میں اسکول ٹیچر بھی پیٹا کرتے تھے اور ماں باپ کی طرح شاگردوں کے خیر خواہ ہوتے تھے۔ میں اپنے زمانے کے اسکول ٹیچروں کی خیر خواہی کا معترف تو ہمیشہ رہا، مگر حبیب الرحمان صاحب کی خیرخواہی بچپن کے باعث نہیں سمجھ سکتا تھا۔ امین الدین ان کے ایک دوست تھے، وہ مجھے پٹنے سے بچایا کرتے تھے، ان کا اب بھی شکر گزار ہوں اور جب بھی تھا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ چچا حبیب الرحمان کے ایک اور دوست تھے، محمد حسین، ایک فرانسیسی نو مسلم کے گیلڑ بیٹے۔ فرانسیسی نو مسلم، حاجی علی جان والوں کے کارخانہ تار کشی میں انجنیر تھا۔ سر شیخ عبد القادر کا دفتر مخزن اور مولانا محمد علی جوہر کا دفتر ہمدرد کامریڈ جس مکان میں رہا وہ اسی کارخانہ تار کشی کے لیے بنا تھا اور اسی لیے مل والا مکان کہلاتا تھا۔ محمد حسین چچا حبیب الرحمان کے پاس مغرب اور عشا کے درمیان تشریف لاتے تھے۔ میری پڑھائی عشا تک ہوتی تھی جو کمرہ چچا حبیب الرحمان کے سپرد تھا، وہ سڑک کے کنارے تھا۔ اس کمرے کے آگے تین فٹ اونچی اور فٹ بھر چوڑی سنگین پٹری تھی۔ بعد مغرب میں پٹری پر بیٹھتا تھا اور چچا حبیب الرحمان اور محمد حسین کے واسطے کرسیاں بچھتی تھیں۔ ایک ہندو کہار دیسی چاٹیں، سونٹھ کے بتاشے، دھی بڑے اور جل جیرا (زیرے کا پانی) بہنگی میں رکھ کر بیچتا آتا تھا۔ محمد حسین چاٹیں خریدتے تھے اور چچا حبیب الرحمان کو اور مجھے کھلاتے تھے۔ بعد مغرب پٹائی نہیں ہوتی تھی، کھلائی ہوتی تھی۔ چچا حبیب الرحمان میرے کھانے سے کھل جاتے تھے۔

اللہ اللہ کر کے دو سال ختم کیے اور چچا حبیب الرحمان صاحب 'شاہ زادہ ہائی اسکول داخل کرانے لے گئے۔ شاہ زادہ ہائی اسکول اس شان کا اسکول تھا کہ مڈل پاس کو بھی اس کی ہیڈ ماسٹری دیدی جاتی تھی، آٹھویں پاس ہیڈ ماسٹر نویں اور دسویں کو پڑھاتا تھا، لیکن شاہ زادہ ہائی اسکول نے مجھے

پانچویں جماعت میں داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ میرا امتحان لیا گیا اور میں اس قابل نہیں پایا گیا کہ شاہ زادہ ہائی اسکول کی پانچویں کا طالب علم بن سکوں۔ چچا حبیب الرحمان نے کہا، انشاءاللہ دلی کے سب سے بہتر اسکول میں داخل کراؤں گا۔ چنانچہ پندرہ دن اور محنت کی اور سینٹ اسٹیفرڈ مشن ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہ دلی کا نمبر ایک(۱) اسکول تھا۔ ماسٹر جانکی ناتھ (عیسائی) اس کے ہیڈ ماسٹر تھے اور قابل قابل استاد ان کے ماتحت کام کرتے تھے، جن میں دو انگریز تھے، کیمبرج اور آکسفورڈ کے ایم، اے۔ نمبر دو گورنمنٹ ہائی اسکول تھا، نمبر تین اینگلو عربک ہائی اسکول، نمبر چار اینگلو سنسکرت ہائی اسکول اور نمبر پانچ شاہ زادہ ہائی اسکول۔

پانچویں جماعت کے طالب علم کو پڑھانا چچا حبیب الرحمان کے بس کا نہ تھا۔ علاوہ ازیں انھیں کسی انگریزی فرم میں تیس روپے ماہوار کی ملازمت بھی مل گئی تھی۔ لہٰذا وہ رخصت ہوئے اور ماسٹر عبدالقیوم فرید آبادی آئے۔ ماسٹر عبد القیوم انٹرنس (۲) پاس تھے، کچہری میں نوکر تھے اور ہمارے محلے میں رہتے تھے۔ وہ روزانہ دو گھنٹے پڑھانے لگے۔

تعلیم اطمینان سے ہو رہی تھی۔ پانچویں پاس کر کے چھٹی میں جا چکا تھا کہ تقدیر نے پلٹا کھایا۔ ماسٹر امیر چند جنھیں لارڈ ہارڈنگ (وائسرائے

---

(۱) عیسائی مشنریوں کے اسکول آج بھی نمبر ایک ہیں، بلکہ آج اسلامی مملکت، پاکستان میں تو ان کی مقبولیت کا کچھ ٹھکانا نہیں رہا ہے۔ وہ ہمیں دھکے دیتے ہیں اور ہم ان کے دامن میں چھپے جاتے ہیں۔ میرے بچپن میں حالت برعکس تھی۔ عیسائی مشنریوں نے دلی میں ایک یہ اسکول کھول رکھا تھا میں جس میں داخل ہوا تھا اور ایک ان کا کالج تھا، سینٹ اسٹیفنز مشن کالج۔ اس کی تعلیم کی بھی دھاک تھی۔ پرنسپل دیسی عیسائی، اور ماتحت پروفیسر یگانۂ روزگار عالم فاضل انگریز ریورنڈ اینڈریوز جیسے، مگر پڑھنے والے زیادہ تر ہندو، مسلمان بہت کم۔

(۲) یہ باتیں ۱۸۹۹ع کی ہیں۔ ۱۸۹۹ع میں انٹرنس پاس بھی بڑی شے تھا۔ مسلمان بی۔ اے تو سارے شہر میں شاید آٹھ دس ہوں گے۔ کئی برس بعد میں نے گنے تھے تو کل سولہ تھے اور سب اتنے اونچے تھے کہ ٹیوشنیں کرتے نہیں پھرتے تھے۔

ہند) پر بم پھینکنے کا الزام دھر کر ۱۹۱۲ء میں پھانسی پر چڑھایا گیا تھا، سینٹ اسٹفنز مشن ھائی اسکول میں نویں دسویں جماعتوں کے استاد تھے - چھٹی جماعت والوں سے انھیں واسطہ نہیں تھا مگر ان کی شکل بند رہے مشابہ تھی۔ مجھے خواہ مخواہ شرارت سوجھی میں نے باواز بلند ان کے سامنے انھیں ''بندر'' کہہ دیا وہ بالکل خاموش رہے، جیسے سنا ھی نہیں، لیکن مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا، یا میری تقدیر کو اپنا کرشمہ دکھانا تھا، میں ڈر کے مارے سینٹ اسٹیفنز مشن ھائی اسکول سے نام کٹوا کر اینگلو عربک ھائی اسکول پہنچ گیا۔

سینٹ اسٹیفنز مشن ھائی اسکول کے طلبہ کو اینگلو عربک ھائی اسکول میں ھاتھوں ھاتھ لیا جاتا تھا - یہاں چھٹی جماعت کے دو فریق تھے۔ اے اور بی - اے کے انچارج مرزا احمد بیگ تھے، بی کے انچارج ماسٹر امتیاز حسین - دونوں نے مجھے لینے کی کوشش کی، ماسٹر امتیاز حسین جیت گئے۔ یہ بھی تقدیر کا کھیل تھا - مرزا احمد بیگ اینگلو عربک ھائی اسکول کے بہترین استاد تھے، خاموش اور متین، پڑھانے ھی میں ان کی دلچسپی محدود تھی - ماسٹر امتیاز حسین ادبی آدمی تھے۔ ھزاروں اشعار ازبر اور طوطیٔ ھزار داستان - پڑھاتے کم تھے، شاعرانہ اور ادبی نوعیت کی لچھے دار باتیں زیادہ کرتے تھے - مرزا احمد بیگ کے علاوہ اینگلو عربک ھائی اسکول کا ھر استاد طلیق اللسان تھا - ھیڈ ماسٹر خواجہ شہاب الدین کی طلاقت ماسٹر امتیاز حسین کی طلاقت پر فائق تھی، اور ان کی باتیں آب زر سے لکھنے کے لائق ہوتی تھیں - اپنے دور کے شیخ سعدی رحمۃاللہ علیہ تھے۔ اینگلو عربک ھائی اسکول کے اساتذہ نصاب کی کتابیں پڑھانے پر اتنا زور نہیں دیتے تھے جتنا ذہن اور ذہنیت چمکانے پر زور دیتے تھے۔ نصاب تو اس زمانے میں بھی آج کے نصاب جیسا تھا، اسی سے ملتا جلتا، جس کے جوھر مزید ترقی کے ھندوستان اور پاکستان میں آزادی ملنے کے بعد کھلے ھیں - لیکن اساتذہ اینگلو عربک ھائی اسکول نے ایسے انسان پیدا کیے جن کی مثل دلی کا کوئی دوسرا اسکول پیدا نہیں کر سکا - اینگلو عربک ھائی اسکول میں جب تک پرانی وضع کے ان ٹرینڈ (un-trained) استاد رہے، عمامے باندھنے والے اور چغے پہننے والے، اس وقت تک اینگلو عربک ھائی اسکول سے اعلا قسم کے گروپ نکلا کرتے تھے - ان میں سے ایک گروپ کو میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے (۱) - یہ گروپ قاری سرفراز حسین، مرزا محمد اشرف

---

(۱) میرے زمانے تک ان ٹرینڈ استاد موجود تھے، مشتاق احمد زاھدی اور آصف علی جیسے ممتاز لوگوں کو ان ھی ان ٹرینڈ استادوں نے ٹرینڈ کیا تھا .

گورگانی ، مولوی اشرف حسین اور مولانا راشد الخیری کا تھا ۔ دلی کے دوسرے اسکول بڑے بڑے جج اور مجسٹریٹ ، بڑے بڑے ڈاکٹر اور انجینیئر تو پیش کر سکتے ہیں لیکن اس گروپ کی مثل لوگ نہیں پیش کر سکتے ۔ ان چاروں کو مولانا الطاف حسین حالی کی شاگردی کا شرف حاصل تھا ۔ مولانا ان کے زمانے میں یہاں پڑھاتے تھے ۔

نصاب کی کتابوں پر زور نہ دینے کے باوجود پاس اینگلو عربک ہائی اسکول کے طلبہ بھی ہو جاتے تھے ۔ اینگلو عربک ہائی اسکول کا نتیجہ اینگلو سنسکرت ہائی اسکول سے اچھا رہتا تھا ۔ میں یہاں چھٹی ، ساتویں اور آٹھویں میں اسی طرح چلا جس طرح سینٹ اسٹیفنز مشن ہائی اسکول میں چل رہا تھا ، آٹھویں کا امتحان دینے والا تھا کہ یکایک میرے والد کا انتقال ہو گیا ۔ انگریز ایگزیکیٹیو انجینیئر نے اثنائے گفتگو میں انھیں فول (Fool) یعنی بے وقوف کہہ دیا تھا ، انھوں نے اسی کی میز سے رول اٹھایا اور رسید کیا ۔ اور کوئی کمرے میں نہیں تھا ۔ انگریز نے فوراً صفائی کر لی ۔ بولا ، جو ہوا ہے ، اسے بھول جاؤ ۔ لیکن خود نہیں بھولا ، افسران بالا کے کان بھر کر والد کا عہدہ گھٹوا دیا ، اسسٹنٹ انجینیر نہیں رہے ۔ والد نے ایک سال کی چھٹی لے لی اور دلی آ گئے ۔ ایک سال چلے کھینچنے اور درویشوں سے دعائیں کرانے میں کاٹا ۔ مہینے میں کئی چکر درگاہ حضرت سلطان نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ علیہ اور درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے لگاتے تھے اور کھنڈروں میں درویشوں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے ۔ کوئی درویش شکل اور درویش وضع کا آدمی مسجد کالے خاں میں آجاتا تو اس کی دعوتیں کرتے تھے ۔ جس کمرے میں چچا حبیب الرحمان نے مجھے پڑھایا تھا ، اب وہ میرا کمرہ تھا ۔ گھر آنے والے درویش اسی کمرے میں بٹھائے جاتے تھے ۔ میرا دل کبھی ان درویشوں کی طرف نہیں کھنچا ۔ بجز ایک کے جنھوں نے اپنی کٹیا کے لیے درگاہ قطب صاحب پہاڑی علاقے میں جگہ کا انتخاب کیا تھا ۔ والد ماجد ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں بھی ہم راہ تھا ۔ عصر کا وقت ، سنسان سما ، صاف ستھری کٹیا ، آگے چٹیل ، ہموار سا میدان ، بزرگ کی نورانی شکل اور سادی وضع ، سب چیزوں نے مل کر دل پر اثر کیا ۔

المختصر سال گزر گیا اور والد مجبوراً بحالت تنزلی نوکری کرنے روڑا ضلع کان پور واپس لوٹے ۔ روڑے میں ریل سے اترے تو رات تھی ، وہیں انھیں پروانہ دیا گیا کہ آپ بحال کیے جاتے ہیں ۔ اسٹیشن کے باہر موجودہ اسسٹنٹ

انجینئر کے خیمے موجود ہیں ، اسسٹنٹ انجینئر کل صبح چارج دے دے گا ۔ رات خیموں میں بسر کیجیے ۔ رات کو نہ جانے کیا بیتی ، ایسے سوئے کہ حشر تک جاگنا قسم ہو گیا ۔

لہر کے ایک ڈپٹی مجسٹریٹ تھے ، سید محمد ، میرٹھ کے باشندے اور اخبار البشیر اٹاوے کے خاص مضمون نگار ۔ انھوں نے مجھے تار بھیجا کہ تمھارے ابا انتقال کر گئے ۔ یہ تار ۳۱/دسمبر ۱۹۱۱ع کی شام کو ملا تھا ۔ والدہ نے اسی وقت پھوپھا عبدالوہاب اور میر سید علی (۱) سے درخواست کی کہ جائیں اور تجہیز و تکفین کر آئیں (۲) ۔ تیسرے دن وہ دونوں واپس آئے ، مگر عقدہ نہ کھلا کہ موت کا سبب کیا تھا ؟ یکایک بیمار ہو گئے تھے یا زہر دے دیا گیا ۔

والد کے انتقال سے میری تعلیم کی رفتار بگڑ گئی ۔ اشٹم پشتم مڈل کا

---

(۱) میر سید علی میرے دادا کے حقیقی بھائی کے پوتے تھے ۔ ایک بھائی کا پوتا میں ، ایک بھائی کے پوتے وہ ۔ میر سید علی صاحب کا ایک واقعہ نوٹ کرنے کے لایق ہے ۔ ایک عزیز دلی آتے تھے تو انھی کے مہمان ہوتے تھے ، اب بھی میر صاحب نے انھیں مہمان رکھا ۔ کھانے کھلاتے ، حقے بھر بھر کر پلاتے ، تانگے میں کچہری لے جاتے ۔ کمرہ عدالت میں داخل ہونے تک وہ میر صاحب کے مہمان رہتے مگر کمرہ عدالت میں داخل ہو کر خوب مقابلہ کرتے اور کمرہ عدالت سے نکل کر پھر ایک کے ایک ۔

(۲) میرے والد کی قبر روڑا ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ہے ۔ سید کی قبر کہلاتی ہے ۔ ایک دفعہ زیارت کی ہے ۔ میں اور خواجہ حسن نظامی صاحب لکھنؤ سے دلی آرہے تھے ۔ روڑا کے قریب پہنچے تو عین قبر کے سامنے ٹرین اتفاقاً پاؤ گھنٹے کے واسطے رک گئی ۔ کوئی گنوار مجاور بنا بیٹھا تھا ۔ اس نے بتایا کہ صاحب قبر کون تھے ، کیا تھے ؟ کیوں کر مرے ۔ اور اب جمعرات کی جمعرات قبر پر قوالی ہوتی ہے ۔ حالاں کہ میرے والد نقشبندی تھے ، قوالی زندگی میں انھوں نے اپنے ارادے سے کبھی نہیں سنی تھی ۔ لکھنؤ سے رخصت کرنے والوں نے مجھے اور خواجہ صاحب کو ہار پہنائے تھے ، ہم دونوں نے ہار قبر پر ڈال دیے ۔

امتحان دیا اور فیل ہوا ۔ وہ مڈل کا آخری امتحان تھا جو یونی ورسٹی کی طرف سے لیا گیا تھا ۔ دوسرے سال اسکول نے نویں میں چڑھا دیا اور تیسرے سال دسویں میں پہنچا دیا ۔ لیکن اب میرا دل نصاب کی کتابوں سے گھبراتا تھا اور سرسید احمد خاں ، مولوی محمد حسین آزاد ، مولانا الطاف حسین حالی ، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا شبلی وغیرہ کی کتابوں میں لگتا تھا ۔ والد کی تنخواہ ختم ہو چکی تھی ، فقط جائداد کا کرایہ اور ملوں کا منافع آتا تھا ۔ والدہ نے اس آمدنی میں سے دس روپے ماہوار میرے جیب خرچ کے مقرر کر دیئے تھے ۔ دس میں سے پانچ چھ روپے میں کتابیں خریدنے پر خرچ کرتا رہتا تھا ۔

دسویں جماعت کا طالب علم ہوکر دلی کے ماہنامے ''زبان'' امرتسر کے سہ روزہ ''وکیل'' اور لاہور کے ہفتہ وار ''وطن'' اور روازنہ ''پیسہ اخبار'' میں مضامین بھیجنے کا آغاز کیا۔ میری والدہ نے ایک دفعہ بھائی قاری سرفراز حسین سے فرمایا کہ ذرا مدرسے جا کر پوچھو تو ارتضیٰ مدرسے میں کیسا ہے؟ ۔ ان ٹرینڈ اساتذہ خواجہ شہاب الدین ، مرزا احمد بیگ ، ماسٹر امتیاز حسین ، ماسٹر ذاکر حسین ، مولوی آفتاب حسین (دلی کے شیعہ خطیب مولوی سید محمد کے والد) ، مولوی رحمت اللہ ، مولوی عمر علی ، مولوی نجم الدین وغیرہ جا چکے تھے اور ٹرینڈ ٹیچر آچکے تھے ۔ مولوی فضل الدین (۱) بی ۔ اے ، بی ۔ ٹی ہیڈ ماسٹر تھے۔

---

(۱) میں نے ان ٹرینڈ مگر چالیس چالیس برس کا تعلیمی تجربہ رکھنے والے اور باپ جیسے شفیق استادوں کو بھی برتا ۔ ان کی ملازمت پر زوال میرے ہی سامنے آیا تھا ، اور ٹرینڈ استادوں کادور بھی میرے سامنے شروع ہوا تھا۔ ان ٹرینڈ استاد سمجھتے تھے کہ ہمیں اسی اسکول میں جینا ہے اور اسی اسکول میں مرنا ہے ۔ وہ سب دلی کے تھے اور تقریباً ہر طالب علم کے خاندان سے واقف تھے ۔ ٹرینڈ استاد بیشتر ادھر ادھر سے آئے اور یہ ادھیڑبن ساتھ لائے کہ یہاں سے زیادہ تنخواہ کہیں ملے تو وہاں چلے جائیں ۔ ماسٹر فضل الدین البتہ دلی کے تھے اور دلی ہی میں رہنا چاہتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر ہونے سے پہلے یہیں سیکنڈ ماسٹر تھے ۔ انھوں نے یہیں پڑھا تھا اور اپنے ان ٹرینڈ استادوں کا پورا اثر لیا تھا ۔ ان ٹرینڈ استادوں کے قدم بہ قدم تھے ۔ اینگلو عربک ہائی اسکول انٹر میجیٹ کالج بنا

(جاری)

قاری سرفراز حسین نے ان سے میرا حال دریافت کیا - قاری صاحب اور فضل الدین صاحب اسی اسکول میں ہم جماعت رہے تھے - فضل الدین صاحب نے مسکرا کر کہا ''ان کی آوارگی روز افزوں ترقی پر ہے'' اور یہ کہہ کر مجھے دیکھا - میرے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے کہوں کہ میں کیسا بھی رہا ہوں ، مگر آوارہ عمر کے کسی حصے میں نہیں رہا - آوارگی سے مجھے مناسبت نہیں ہے - میرا چہرہ سرخ دیکھا تو مولوی فضل الدین صاحب نے وضاحت فرمائی کہ طالب علمی کے زمانے میں مضمون نگاری کرنا بھی آوارگی ہے - میرے چہرے کی سرخی ہلکی ہوگئی ، لیکن میں نے دل میں کہا :

''کہ ایں آوارہ کوئے بتاں آوارہ تر بادا''

میرے بچپن کے اور محلے کے ساتھی ، آصف علی ، اور اسکول کے ساتھی سید رؤف علی اور شیخ محمد تقی سینٹ اسٹیفینز مشن کالج میں جا بیٹھے اور میں انٹرنس میں فیل ہوتا رہا - آصف علی اور روف علی ایف اے کر کے بیرسٹری پڑھنے انگلستان چلے گئے اور محمد تقی نے بی - اے اور ایل - ایل - بی کا پروگرام بنایا - لیکن جس کے باپ کا پروگرام تھا کہ مڈل پاس کرکے وہ اٹاوہ ہائی اسکول جائے گا اور اٹاوہ ہائی اسکول سے علی گڑھ کالج ، اور وہاں سے بی - اے کے بعد بیرسٹری کے لیے انگلستان، اس کا رخ اور ہی طرف مڑ چکا تھا :

'' ما در چہ خیالیم و خدا در چہ خیال ''

خدا مجھے فیل نہیں کر رہا تھا ، امتحانوں میں پڑنے سے بچا رہا تھا - میں نے مولوی فضل الدین صاحب کی باتیں سن کر کہہ تو دیا تھا :

''کہ ایں آوارہ کوئے بتاں آوارہ تر بادا ''

(جاری)

تو وہی پرنسپل بنائے گئے - لیکن انہوں نے عمامہ باندھ کر اور ادھوڑی استر کی جوتی پہن کر پرنسپلی کی - مولوی فضل الدین شاگردوں کی اتنی نگرانی رکھتے تھے کہ شاگردوں کو راہ چلتے خوف رہتا تھا کہ مولوی صاحب نہ آجائیں ، اور مولوی صاحب واقعی آجاتے تھے - میں نے بارہا اس کا تجربہ کیا اور ان کا ہر شاگرد اسے جانتا ہے کہ مولوی صاحب کے لیے تصور کرنا کافی تھا ، مولوی صاحب تصور کرتے ہی پہنچ جاتے تھے -

لیکن متواتر تین سال انٹرنس میں فیل ہونے سے میرا دل بے حد رنجیدہ اور غمگین تھا ۔ یہ میں اب سمجھا ہوں کہ اللہ نے میرے لیے جو کچھ کیا ، ٹھیک کیا۔ اس وقت نہیں سمجھا تھا ، اور نہیں سمجھ سکتا تھا ۔ اب ایم - اے، بی -اے اور بیرسٹر نہ بننے کا مجھے مطلق افسوس نہیں ہے ۔ ہاں افسوس ہے تو دینی مدرسے میں نہ پڑھنے کا ہے ۔ اللہ نے دین کو باضابطہ اور سبقاً سبقاً کیوں نہیں پڑھوایا ، اس کا راز ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا ۔ میں نے مسٹر آصف علی پر کبھی رشک نہیں کیا ، مگر مولانا سید سلیمان ندوی پر رشک کرتا ہوں ۔ ایم ۔ اے اور بی ۔ اے یا بیرسٹر بننے سے ممکن تھا کہ میری فطرت اسلامی لچک کھا جاتی ، لیکن ندوے یا دیوبند جانے میں تو شاید اور سنور جاتی ۔

یہ اللہ کا مجھ پر بڑا فضل ہے کہ میں مسلمان پیدا کیا گیا اور پھر امتحانوں میں نہیں ڈالا گیا ۔ حدیث ہے کہ ہر بچہ اسلامی فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے ، ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں ۔ مجھے نہ ایسے ماں باپ سے سابقہ پڑا جو میری اسلامی فطرت کو بگاڑ دیتے اور نہ ایسے اور لوگوں سے سابقہ پڑا ۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ ایم ، اے ۔ بی ، اے اور بیرسٹر سب اپنی فطرت بگاڑ لیتے ہیں ۔ خطرناک ماحول سے گزر کر بھی بعض حضرات اسلامی فطرت کو مرنے نہیں دیتے ۔ اس کا انحصار ظرف پر ہے ۔ میرا ظرف غالباً خطرناک ماحول سے گزرنے اور امتحانوں میں ڈالے جانے کے قابل نہیں تھا ۔ میری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ امتحانوں نہ پڑکر بچپن سے بڑھاپے تک اسلامی فطرت کو زندہ رکھوں ۔

مجھے عمر کے کسی دور میں بری کتابوں اور برے انسانوں کی صحبت نہیں ملی ۔ کتابیں میں ساری عمر پڑھتا رہا ۔ میری تعلیم آج بھی ختم نہیں ہوئی ہے ۔ لیکن میں نے جوانی میں بھی مولوی عبدالحلیم شرر کے چند ناولوں کے سوا کسی ناول کو ہات نہیں لگایا ۔ صحبت مجھے ملی بچپن میں بھائی محمد ادریس ، مولانا احمد سعید اور قاضی لطف الحق حقی کی اور جوانی میں خواجہ فضل احمد شیدا ، خواجہ حسن نظامی ، مولانا راشد الخیری ، مولانا عارف ھسوی اور بھیا احسان الحق کی ۔ بڑھاپے میں صحبت کے اثر کا سوال نہیں رہتا ، اور مجھے تو "نظام المشائخ" کی ایڈیٹری نے جوانی میں بوڑھا کر دیا تھا ۔

بچپن میں باپ کے انتقال کے بعد میں رانڈ کا سانڈ نہیں بنا اور والدہ کے

انتقال نے سولہ سترہ برس کی عمر میں چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کا بزرگ بنا دیا تھا - '' کبرٰی موت الکبرے '' والدہ کا انتقال ۱۹۰۴ء میں ہوا تھا -

جوانی آئی تو ایک دینی اور ثقہ رسالے کی ایڈیٹری ساتھ لائی - جوانی مجھ پر نہیں چھائی، میں نے جوانی کو مغلوب کر لیا - رسالے کی ایڈیٹری کی وجہ سے حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواری ، حضرت اکبر الہ آبادی، علامہ شبلی، علامہ اقبال ، شمس العلما منشی ذکا اللہ ، مولانا محمد علی جوہر ، مولانا ظفر علی خاں ، میر غلام بھیک نیرنگ ، حکیم اجمل خاں ، حکیم رضی الدین، حکیم نا بینا ، مفتی کفایت اللہ ، نواب غلام نصیر الدین (بدھن) غلام نظام الدین (خاکسار) جیسے حضرات سے ملاقاتیں رہتی تھیں -

عربی زبان پوری طرح نہیں سیکھی ، اور دینی علوم پوری طرح نہیں حاصل کئے ، مگر عربی زبان سیکھنے اور دینی علوم حاصل کرنے کی کوشش برابر کرتا رہا - مفتی کفایت اللہ صاحب ، صدر مدرس مدرسہ امینیہ سے کہہ کر مدرسہ امینیہ کے منتہی طلبہ عربی سیکھنے اور دینی علوم پڑھانے کے لیے لگائے - مولانا محمد اسحاق صاحب رام پوری سے بھی پڑھا اور پھر ان کے شاگرد رشید مولانا محمد ایوب صاحب کی تقریریں پینتس سال مسلسل سنیں - مولانا عبد الماجد دریابادی میری طرف اس وقت متوجہ ہوئے جب وہ اپنے دور ''روشن خیالی'' کی تصنیفات کو دیا سلائی دکھا چکے تھے - مولانا نیاز فتح پوری جس زمانے میرے ہاں رہے ، اس زمانے میں نماز روزے کے بڑے پابند تھے - جوش ملیح آبادی نے تشریف لا کر مجھے اپنے رنگ میں نہیں رنگا بلکہ میرے پاس اٹھنے بیٹھنے سے وہ مولانا محمد ایوب کی تقریروں کے شایق ہو گئے تھے -

اعمال میرے ناقص ہیں ، ایمان ناقص نہیں ہے - یہ ایسی نعمت ہے کہ اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اللہ تعلیم و تربیت کا رخ نہ موڑتا تو مجھ جیسے معمولی ظرف کے انسان کو بھلا یہ نعمت کیا میسر آتی - میری زندگی کا کوئی دور الحمد اللہ شکوک اور شبہات میں نہیں گزرا - حق معرفت تو بڑی چیز ہے ، حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں '' ماعرفنک حق معرفتک '' - میں اپنی ادنا سی حیثیت کے مطابق اللہ کے وجود اور حضور سرور کائنات صلعم کی رسالت کا فقط اتنا قائل ہوں کہ میری عقل باور نہیں کرتی کہ کائنات کا کارخانہ بغیر کسی کے چلائے چل رہا ہے - اپنے آپ کو مثل حباب بلکہ

مثل خواب محسوس کرتا ہوں اور حقیقی ہستی اسی واجب الوجود کی مانتا ہوں ۔ نیز عقل باور نہیں کرتی کہ حضور سرور کائنات صلعم جن کا لایا ہوا قرآن پاک اور جن کے اسوۂ حسنہ کا پورا ریکارڈ سامنے موجود ہے ، نبوت کا جھوٹا دعوا کر سکتے تھے ۔ میں نے معمولی قسم کے اچھے آدمیوں کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا ، حضور صلعم تو اچھوں کے اچھے سردار تھے ، حضور صلعم سے زیادہ اچھا انسان تو اور کوئی ہے ہی نہیں ۔

طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آ گیا ۔ ضیا الدین احمد برنی اور شوکت علی خاں میرے ہم جماعت تھے ۔ ہم تینوں نے انٹرنس کا امتحان دیا تھا ، میٹرک اس زمانے میں انٹرنس کہلاتا تھا ۔ ایک دن شوکت علی خاں مجھے اور برنی صاحب کو اپنے گھر لے گئے ۔ ان کا گھر محلہ فراش خانہ میں تھا ۔ ان کے والد نواب اکبر علی خاں خاصے امیر اور بارسوخ آدمی تھے ۔ ۱۹۰۰ء میں جب امیر کابل ہز مجسٹی حبیب اللہ خاں وائسرائے کے مہمان ہوئے ہیں تو ان کی مہمانداری کا اہتمام حکومت ہند نے اکبر علی خاں کے سپرد کیا تھا ۔

خیر ہم تینوں نواب اکبر خاں کی شان دار حویلی میں پہنچے ہی تھے کہ ایک صاحب تہبند باندھے اور کرتا کندھے پر ڈالے اور دوسرے کندھے پر بچے کو بٹھائے آتے دکھائی دیئے ۔ شوکت صاحب نے دور سے آواز دی ، " تشریف لائیے ، بابوجی ۔ اس وقت آپ کی ضرورت تھی ۔ بتائیے ہم تینوں انٹرنس کے امتحان میں پاس ہوں گے یا نہیں "۔ میں اور برنی صاحب اس حویلی میں پہلی دفعہ گئے تھے ۔ بابو جی مجھ سے اور برنی صاحب سے واقف نہیں تھے ۔ اور نہ ہم بابوجی کو جانتے تھے ، لیکن بابوجی نے بچے کو کندھے سے اتارا اور سب پر نگاہ ڈالی ، اور برنی صاحب کی بابت کہا "یہ انٹرنس میں بھی پاس ہوجائیں گے اور بی ۔ اے بھی کرلیں گے ۔ شوکت ! تم پاس نہیں ہوگے ، تاہم تمھارے لیے گھوڑا مقدر ہے ، خواہ مالک بنو یا چابک سوار ، گھوڑا بہر حال تا دم مرگ ران تلے رہے گا ۔ ان تیسرے صاحب کی تقدیر میں بھی امتحان پاس کرنا نہیں ہے ۔ مگر ان کا شمار پڑھے لکھے لوگوں میں ضرور ہوگا ۔ لاؤ ، ان کا تو پورا کچا چٹھا گھسیٹ دوں" ۔ ۲۲ × ۱۸ سائز کا ایک ریم کمرے کے کونے میں پڑا تھا ۔ بابوجی نے اس میں سے کاغذ کا تاؤ نکالا ، اسے موڑا اور لکھنا شروع کردیا ۔ بابوجی نے زائچہ وائچہ نہیں کھینچا ، ہاتھ

بھی نہیں پڑھا - صرف میری صورت پر نظر دوڑاتے تھے اور لکھے چلے جاتے تھے - کاغذ کے چاروں رخ بھر دیے اور کاغذ مجھے تھمادیا - (۱) وہ کاغذ میرے پاس ۱۹۴۷ء تک محفوظ تھا - اس میں ماضی کے حالات بھی تھے، وہ صحیح تھے - مجھے یقین ہوگیا تھا کہ مستقبل کے حالات بھی صحیح ہوں گے اور صحیح نکل رہے تھے - اس لیے کاغذ رکھ چھوڑا تھا - ۱۹۴۷ء کی افراتفری میں کھویا گیا -

---

(۱) ان بابوجی کا نام کرامت علی تھا - یہ باشندے تو پنجاب کے تھے ، لیکن دلی میں بس گئے تھے - غالباً شادی دلی میں کر لی تھی - اولاد بابو کرامت علی کی بالکل دھلوی ہے - ایک صاحب زادے، حکیم اقبال حسین ، ایم - اے کراچی میں ہیں - انھیں دیکھ لو ، دھلویت بدرجہ اتم موجود ہے - کرامت علی صاحب تجارتی چٹھیاں لکھنے کے ماہر تھے - دلی کے پنجابی سوداگر اپنے آرڈر انگریزی میں ان سے لکھواتے تھے - انڈنٹ رائٹری ھی کے باعث بابوجی کہلاتے تھے ، قیافہ شناسی میں بھی اللہ تعالیٰ نے انھیں کمال عطا فرمایا تھا -

میں اللہ کے سوا کسی کو عالم الغیب نہیں مانتا - انبیا کو بھی علم غیب اتنا تھا جتنا اللہ نے بتا دیا تھا - عالم الغیب فقط اللہ ہے - "وما تدری نفس ماذا تکسب غداً" - کوئی (دعوے سے) نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا (اور کیا نہیں کرے گا) - (سورہ ۳۱ آیت ۳۴) - وہ کل زندہ بھی رہے گا یا نہیں - علم نجوم ، فراست الید اور قیافہ شناسی وغیرہ کے ذریعے کچھ ٹھیک اور کچھ غلط اندازہ کرلیا جاتا ہے - بابو کرامت علی بے حد ذھین انسان تھے - مگر میں ان کی جس کرامت کا قایل ہوں وہ ایک ادا تھی - کرامت علی صاحب نے میری بابت لکھا تھا کہ میں لکھنے پڑھنے کو اوڑھنا بچھونا بنا لوں گا - ۱۹۰۵ سے ۱۹۰۹ء تک کرامت علی صاحب کہیں نظر نہیں پڑے - ۱۹۰۹ء میں "نظام المشائخ" جاری ہوا - انھوں نے خواجہ فضل احمد صاحب کی معرفت مجھے پیغام بھیجا کہ فلاں جمعے کو جامع مسجد سے سیدھا تمھارے ہاں آؤں گا - چناں چہ تشریف لائے اور اپنی پیشین گوئی کی طرف توجہ دلائی، شام تک ٹھیرے اور پھر ہر سال اسی مہینے کے مقررہ جمعے کو تشریف لاتے رہے اور سال بھر کی ترقی سے خوش ہوتے رہے - مرتے دم تک یہ وضع قائم رکھی - سال میں ایک بار سے زاید نہیں آتے تھے - اور سال میں ایک بار مقررہ مہینے میں اور مقرر جمعے کو آنا اپنے اوپر لازم کر لیا تھا -

انٹرنس میں فیل اور پاس ہونے کی تصدیق تو چند دن بعد ہی ہو گئی تھی ، شوکت صاحب بھی فیل اور میں بھی فیل ، برنی صاحب پاس - یہ اسی سال کا قصہ ہے ، جس سال امیر حبیب اللہ خاں آئے تھے - شوکت صاحب نے تعلیم ترک کردی اور ان کے ابا نے انہیں ریاست رام پور کی نایب تحصیل داری دلوادی - پھر وہ بہار شریف میں سید حسن امام بیرسٹر کی جائداد کے منصرم ہو گئے اور سید حسن امام کے مرجانے پر سید حسن امام کی یوروپین بیوہ نے ان سے عقد کرلیا اور صرف گھوڑا ہی رانوں تلے نہیں رہا، لاکھوں روپوں میں کھیلنے لگے - ۱۹۴۷ع تک زندہ تھے - حال کی خبر نہیں - میں نے دو سال اور انٹرنس کے کاوے کاٹے - ۱۹۰۶ میں بھی فیل ہوا اور ۱۹۰۷ع میں بھی - فارسی کی ابتدائی کتابیں گلستاں بوستاں وغیرہ اور قرآن پاک ورود دلی سے قبل پڑھ لیا تھا ، بلکہ کئی پارے حفظ کرچکا تھا ، جو افسوس اب اچھی طرح یاد نہیں ہیں ، مزاولت نہیں کر سکا -

واجد علی شاہ اختر

مرزا علی اظہر برلاس *

[۱]

سلطان عالم محمد واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ ، تاریخ کی اُن بد نصیب ہستیوں میں ہیں جو باوجود انتہائی رحم دل ، نیک نفس ، رعایا پرور اور قابل ہونے کے سیاسی حالات کا شکار ہو گئے اور اس قدر بدنام کیے گئے کہ نہ صرف اغیار بلکہ اپنوں نے بھی ذاتی مصالح کی بنا پر اُن کو مطعون کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی ۔ '' دانایان فرنگ '' نے انتہائی عیاری اور مکاری کے ساتھ نہ صرف خود بدنام کیا بلکہ واجد علی شاہ کو خود انھیں کے ہم وطنوں کے قلم سے اس قدر سیاہ کار اور عیاش بنا کر پیش کیا کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے حضرات بھی اُن کو ویسا ہی سمجھنے لگے جیسا کہ انگریز چاہتے تھے :

دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدیم

جس وقت واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے (۱۸۴۷ء) اُس وقت تک انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے اور کوئی قابل وقعت دیسی طاقت ایسی نہ تھی جو انگریزوں کے مقابلے پر آ سکتی ۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد سے انگریز ہندوستان کی حکومت کا خواب دیکھنے لگے تھے مگر تاریخ کی ورق گردانی اگر ذرا غور سے کی جائے تو معلوم ہو گا کہ اورنگ زیب عالمگیر کی زندگی ہی میں انگریزوں کی دور رس نگاہیں ملک کی کمزوری کا صحیح اندازہ لگا چکی

---

* شریک معتمد ، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ، کراچی ۔

تھیں اور دور بیں انگریز حکومت کا خواب دیکھنے لگے تھے ۔ سر جوشوا چائلڈ (Sir Joshua Child) کا ، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں سربراہ تھا ، ١٦٨٧ء میں یہ چبھتا ہوا فقرہ کہ " ہندوستان کے حالات ہمیں تدریجاً حکومت اعلیٰ کی طرف لیے جا رہے ہیں " ثابت کرتا ہے کہ اس نے کس قدر غائر نظر سے حالات کا مطالعہ کیا تھا ، چنانچہ اس نے کمپنی کو (ہندوستان میں) " ایک وسیع ، مستحکم اور یقینی انگریزی حکومت ، ہمیشہ کے لئے " قائم کرنے کی سفارش کر دی تھی ۔

اورنگ زیب کے انتقال تک (١٧٠٧ء) انگریزوں نے مدراس ، کلکتے اور بمبئی میں اس قدر مضبوطی سے پنجے گاڑ لیے تھے کہ اٹھارویں صدی کی طوائف الملوکی میں دیسی ریاستیں خود انگریزوں کی اعانت کی محتاج ہو گئیں ۔ کرناٹک کی خانہ جنگی نے ، جس میں مرہٹوں ، نظام ، اور نواب کرناٹک نے باری باری حصہ لیا ، فرانسیسیوں اور انگریزوں کو کھل کر میدان میں آنے کی ہمت دلائی اور بالآخر انگریزوں نے ، چندا صاحب کو دھوکے سے قتل کر کے اور محمد علی کو ارکاٹ کا نواب بنا کر اقتدار اعلیٰ خود سنبھال لیا ۔ بنگال میں بھی حالات نے انگریزوں کی مساعدت کی اور جب سراج الدولہ کو دھوکہ دے کر جنگ پلاسی (١٧٥٧ء) میں مغلوب کر لیا تو ان کی امیدیں اور بڑھ گئیں ۔ اُدھر شاہ عالم ثانی ، بادشاہ دہلی ، کی تلون مزاجی ، کمزوری اور لالچ اور اُمرائے سلطنت کی ذاتی عداوتوں اور چپقلش نے انگریزوں کی تمناؤں کو اتنا پروان چڑھایا کہ وہ بالآخر بنگال ، بہار اور اڑیسہ کے دیوان (١٧٦٥ء) مقرر ہو گئے ۔ ایسے زرخیز صوبوں کے وسائل پر قابو پانے کے بعد ظاہر ہے کہ انگریزوں نے اور ہاتھ پیر نکالے ۔ وہ تاڑ گئے کہ "سیاست" سے ہندوستان کے رؤسا بالکل نا آشنا ہیں ۔ چنانچہ انگریزوں نے میدان سیاست میں ایک ایک کر کے ہر رئیس کو زک دی ۔ کبھی ایک کو دوسرے سے لڑایا اور کبھی کسی رئیس کے درباریوں اور فوجی افسروں کو اُسی کے خلاف اُبھار دیا ۔ غرض کہ کوئی حربہ ایسا نہ تھا جس کو انگریزوں نے استعمال نہ کیا ہو اور اس طرح رفتہ رفتہ وہ پورے ملک پر چھا گئے ۔

صوبوں اور ریاستوں کا انجام :

مختصراً یہ کہ تینجور پر انگریزوں نے ١٧٩٦ء میں قبضہ کر لیا ۔ ١٧٩٩ء میں ٹیپو سلطان کے مارے جانے کے بعد میسور پر قبضہ ہو گیا ،

نواب نصیرالدین خان والی' سورت کے ملک پر ۱۸۰۰ء میں قبضہ کر لیا ۔ اسی طرح سے کرناٹک پر ۱۸۰۱ء میں انگریز قابض ہو گئے اور اسی سال میں اودھ کے نصف مقبوضات کو لے لیا ۔ اب مرہٹوں کی باری آئی اور اُن کو آپس میں لڑانا شروع کر دیا اور آخر کار سندھیا اور بھونسلا کو ہرا کر اُڑیسہ اور دریائے جمنا کا پورا شمالی علاقہ کمپنی کے مقبوضات میں شامل کر لیا ۔ کچھ عرصہ تک انگریز شطرنجی چالیں چلتے رہے ، آخر موقع پاتے ہی ۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کے زور کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ۔ راجہ بھونسلا کو تخت سے اتار دیا ، سندھیا اور ہولکر کے وسیع علاقے اپنی حکومت میں شامل کر لیے اور پیشوا کو پنشن دے کر کانپور کے نزدیک بٹھور میں نظر بند کر دیا ۔ ۱۸۱۶ء میں نیپال کی آزادی ختم کر کے اپنا حلقہ بگوش بنا لیا اور ۱۸۲۴ء میں پہلی جنگ برما چھیڑ کر دو برس بعد ۱۸۲۶ء میں انگریزوں نے آسام اور اراکان وغیرہ چھین لیے اور اسی سال بھرتپور پر بھی قبضہ کر لیا ۔ کچھ عرصے بعد کاشتکاروں کے فساد کا بہانہ کر کے میسور اپنے قبضہ' قدرت میں لے لیا ۔ کورگ کے راجہ کو گدی سے اتار دیا اور جیپور میں ریجنسی (Regency) کے نام پر قبضہ کر لیا ۔

امیران سندھ نے افغانستان پر چڑھائی کے لیے انگریزی فوج کو اپنے ملک سے راستہ دے دیا تھا ، لہذا دھوکہ دے کر اور معاهدوں کو پس پشت ڈال کر کراچی اور شکار پور (جو اس وقت سندھ کا سب سے بڑا شہر تھا) پر قبضہ کر لیا۔ پھر گورنر جنرل نے سر چارلس نیپئر (Sir Charles Napier) کو نہایت ہی اہانت آمیز شرائط صلح کے ساتھ امیروں کے پاس بھیجا اور ان کے انکار کرنے پر دو تین لڑائیوں کے بعد ۱۸۴۸ء میں سندھ پر قبضہ کر لیا ۔ ستارا کو ۱۸۴۸ء میں ، جیتپور اور سنبھل پور کو ۱۸۴۹ء میں لے لیا ۔

پورے ہندوستان میں اب صرف سکھوں کی طاقت ایسی تھی جس سے انگریزوں کو خطرہ تھا سکھوں نے اپنی بربریت سے افغانوں پر ایسی دہشت بٹھا دی تھی کہ افغان عورتیں بچوں کو سلانے کے لیے ہری سنگھ نلوا (رنجیت سنگھ کا سردار) کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں ۔ رنجیت سنگھ کی زندگی تک تو انگریز صبر و شکر کے ساتھ بیٹھے انتظار کرتے رہے مگر رنجیت سنگھ کے مرتے ہی انگریزی سیاست کو موقع مل گیا اور ۱۸۴۹ء میں

پنجاب بھی کمپنی بہادر کی مملکت محروسہ میں داخل ہو گیا ۔ اب برما کی نوبت آئی اور ۱۸۵۲ء میں اس کی بھی آزادی کا خاتمہ ہو گیا ۔ جھانسی کو ۱۸۵۳ء میں اور ناگپور کو ۱۸۵۴ء میں مملکت کمپنی میں داخل کر کے ختم کردیا ۔

متذکرہ بالا اجمالی خاکے سے ثابت ہو گا کہ ہندوستان میں (برما اُس وقت ہندوستان میں شامل تھا) کوئی طاقت راجپوت یا مرہٹہ ، سکھ یا مسلمان کی ایسی نہ تھی جو انگریزوں کا مقابلہ کر سکتی ۔ پشاور اور لاہور سے لے کر راس کماری تک اور نیپال سے لے کر پونہ تک کوئی قوم ایسی نہ تھی جس کا سر انگریزوں کے سامنے سرنگوں نہ ہو چکا ہو ۔ مرہٹوں کا پیشوا باجی راؤ بٹھور میں نظر بند تھا اور سکھوں کا سردار دلیپ سنگھ انگلستان میں تعلیم و تربیت کے بہانے سے انگریزوں کا شکار بن چکا تھا ۔

بہادر شاہ ظفر :

قلعۂ معلیٰ (دہلی) میں انگریزوں نے ابھی تک ، بر بنائے مصلحت ، شاہان مغلیہ کے چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کو رہنے دیا تھا اور وہ مٹکاف (Metcaff) کے اشارے پر کٹھ پتلی بنے ہوئے پنشن اور نذرانوں کی رقوم وصول کر کے زندگی بسر کر رہے تھے ۔ یہ ضرور ہے کہ دربار لگتا تھا ، ''با ادب'' '' با ملاحظہ'' اور '' نگاہ رو برو'' کی صداؤں کی گونج میں ''ظل اللہ'' بر آمد ہوتے تھے ۔ غالب اور ذوق سہرے اور قصیدے سنا کر داد و ستائش حاصل کرتے تھے اور درباریوں کو خطابات سے بھی مفتخر و مبتہج کیا جاتا تھا مگر '' سلطنت شاہ عالم از دلی تا پالم '' کا زمانہ بھی عرصہ ہوا گزر چکا تھا ، اب تو انگریزوں کی سطوت و شوکت کا یہ عالم تھا کہ ۱۸۴۲ء میں گورنر جنرل نے یہ طے کر دیا تھا کہ بادشاہ کی آنکھ بند ہوتے ہی سلاطین مغلیہ کی بچی کھچی اولاد کو قلعۂ معلیٰ سے نکال دیا جائے ۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کی چہیتی بیوی زینت محل کو یہ سب معلوم تھا مگر بے بس و ناچار ، تن بہ تقدیر اپنی قسمت کے لکھے کا انتظار کر رہے تھے ۔

حیدر آباد دکن :

اب ہندوستان میں صرف دو بڑی ریاستیں بچ گئی تھیں بلکہ سسک رہی تھیں ۔ جنوب میں حیدر آباد دکن اور شمال میں اودھ ۔ حیدر آباد میں جو انگریزی فوج مسلط کر دی گئی تھی اُس کے مصارف ادا نہ کرنے سے

نظام دکن انگریزوں کے مقروض ہو گئے تھے ۔ یہ بہانہ کچھ کم نہ تھا صوبۂ برار جو بہت ہی زرخیز صوبہ ہے اور جس میں عمدہ کپاس پیدا ہوتی ہے ، اُس پر ڈلہوزی نے قرضے کی ادائی کے بہانے سے قبضہ کر لیا ۔ یہ ضرور کیا کہ قبضے کو وقتی قرار دیا جو بعد کو کرزن کے زمانے میں حکومت برطانیہ میں مستقلاً شامل کر لیا گیا مگر میر عثمان علی خان مرحوم نظام دکن کے متواتر احتجاجات سے تنگ ہو کر نظام دکن کو ہز ہائنس کی بجائے ہز ایگزالٹڈ ہائنس (His Exalted Highness) کے دلفریب اور خوش آیند خطاب سے نواز کر خاموش کر دیا اور وہ بھی " المجبور معذور " کے اصول پر عمل پیرا ہوکر ساکت و صامت ہو گئے ۔

اودھ ، برطانوی پالیسی :

اب اودھ کی باری تھی ۔ حیدرآباد اور اودھ کے متعلق انگریزوں کی حسب ذیل پالیسی عرصہ ہوا طے پا چکی تھی :

" ١٨٥١ء میں کلکتہ (یعنی گورنر جنرل) کی پالیسی یہ تھی کہ جتنی درمیانی ریاستیں ہیں اُن کو ختم کر دینا چاہیے ۔ یہ اصول مان لیا گیا تھا کہ ہماری (کمپنی کی) مملکت میں اتنی ریاستوں اور سلطنتوں کا موجود ہونا اچھی حکومت اور رعایا کی بہبودی اور خوشحالی کے منافی ہے ۔ جب بھی کوئی موقع ملے تو اُن کی تعداد گھٹا دینا چاہیے (کیونکہ) دیسی ریاستیں دوست ہو ہی نہیں سکتیں ۔ وہ ناقابل اصلاح ہیں اور اگر اصلاح ہو بھی سکتی ہو تو یہ اس نہ ہمارے لیے مناسب ہے اور نہ قابل منفعت ۔ دونوں بڑی ریاستوں حیدر آباد اور اودھ کو ضبط کرنے کے لیے پہلے ہی سے طے ہو چکا تھا اور ان کی بیخ کنی کے سلسلے میں جیسا کہ Blue Book (١) سے ثابت ہوتا ہے ' پنجاب اور برما کی لڑائیوں کی وجہ سے تعویق ہو گئی ۔ جب وقت آ گیا اودھ کو ضبط کرلیا اور حیدر آباد کو تباہی کے راستے پر ڈھکیل کر لارڈ ڈلہوزی اس کے خاتمے کا منتظر رہا " (٢) ۔

١- وہ کاغذات جو منجانب ایسٹ انڈیا کمپنی ، سرکاری ذمہ داری کے ساتھ پارلیمنٹ میں پیش کئے جاتے تھے ۔

٢- اسٹیٹسمین (The Statesman) مورخہ یکم جولائی ١٨٨٠ء ۔

واجد علی شاہ کی تخت نشینی :

ان حالات اور اس ماحول میں واجد علی شاہ ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء مطابق ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ (۱) بروز شنبہ سریر آرائے سلطنت ہوئے ۔ تخت شاہی پر بیٹھتے ہی انتظام سلطنت اور فوجی تنظیم کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ چنانچہ مولوی نجم الغنی لکھتے ہیں :

" دو شنبہ ۲۸ ماہ صفر کو امجد علی شاہ کے سوم کی تقریب آن کی قبر پر ہوئی ...... اب ہر روز حسب دستور طلوع آفتاب سے تاچاشت دربار منعقد ہونے لگا ۔ انتظام مالی و ملکی پیش نظر کیمیا اثر رہنے لگا ۔ روز سہ شنبہ ۲۹ صفر کو نواب امین الدولہ اور مہاراج بالکرشن وغیرہ اہلکاران سلطنت کو حسب معمول خلعت ملا ۔ باقی عملہ قدیم بدستور اپنے کاروبار میں مصروف ہوا ...... ۱۰ دن تک طریق ملاحظہ کاغذات اور صورت دربار شاہی زمانہ سابق کے موافق رہی ۔ بعد اس کے فرح بخش بیت السلطنت قدیم کو ناپسند فرما کر اس کا چھوڑنا اور شہنشاہ منزل میں جہاں صحن وسیع اور لطافت ہوا زیادہ تھی قیام اختیار کرنا منظور خاطر ہوا ...... بعد اس کے اہل دربار اور شہزادوں اور امرا کو حکم ہوا کہ ہر اتوار کو صبح کے وقت دربار کے لیے کوٹھی فرح بخش میں حاضر ہوا کریں میں بھی وقت خاص پر آیا کروں گا ۔ ۹ بجے کے وقت نواب امین الدولہ ، مہاراج مدبر الدولہ اور دبیرالدولہ اور اہل دفتر خاص در دولت پر دولت خانہ قدیم میں حاضر ہونے لگے ، وقت ملاحظہ کاغذات ہر ایک حاضر ہوتا تھا۔ دوپہر کے بعد جب زوال شمسی کی نوبت بجتی تھی تو یہ لوگ دربار سے اٹھتے تھے ، اس کے بعد ، قربان قدیم کی صحبت خاص کا رنگ جمتا تھا " (۲) ۔

انتظام سلطنت :

انتظام سلطنت اور کاروبار ریاست چونکہ بلا عدل و انصاف کے نہیں

---

(۱) "افضل التاریخ میں مسند نشینی کی تاریخ ۲۷ صفر کی رات بتائی ہے" مولوی نجم الغنی ، تاریخ اودھ ، حصہ پنجم ، ص ۱۲۰ ۔

(۲) مولوی نجم الغنی ، تاریخ اودھ ، حصہ پنجم ، ص ۳ - ۱۲۲

ہو سکتا اس لیے بادشاہ نے ابتدائے سلطنت ہی سے اس طرف بھی توجہ خاص کی ۔ مولوی نجم الغنی لکھتے ہیں :

" کئی دن تک بادشاہ کی سواری میں دو ترک سوار آگے آگے دو نقرئی صندوقچے نیزوں پر لے کر چلتے تھے راہ میں جو مستغیث عرضی دیتا تھا صندوقچے میں ڈال دیتے تھے ، کنجی ان کی بادشاہ کے پاس رہتی تھی اور ان کو بادشاہ اپنے ہاتھ سے کھول کر حکم لکھتے تھے اور طبیعت بھی نہایت رسا اور تیز تھی ۔ اس کا نام قیصرالتواریخ کی روایت کے مطابق مشغلۂ نوشیروانی اور وزیر نامہ ، نادرالعصر اور محاربۂ غدر کی روایت کے مطابق مشغلۂ سلطانی رکھا تھا ۔ اہل کاروں کو اس سے خوف اور رعایا کو باعث ازدیاد تقویت تھا ، فی الحقیقت بہت خوب مشغلہ تھا (۱) اگر اس کو قیام رہتا ۔ افضل التواریخ میں اس کا حال یوں لکھا ہے کہ تخت نشینی سے تیسرے روز دو صندوق طلائی و نقرئی تیار ہوئے اور نام ان کا مشغلۂ سلطانی رکھا گیا اور یہ صندوق اب شاہ راہ (گزر گاہ عام پر) اس حکم سے رکھے گئے کہ مستغیثان مجبور و فریاد کنان نزدیک و دور کسی دوسرے کے توسط کے بغیر اپنی عرضیاں سوراخ بالائے صندوق سے چھوڑ دیں اس کے مطابق عمل در آمد ہوا ۔ ہر روز صبح کے وقت دونوں صندوق دربار میں بادشاہ کی خاص نگرانی میں کھولے جاتے اور ان پر خاص بادشاہ کے ہاتھ سے حکم لکھے جاتے تھے ۔ بادشاہ کی اس بیداری نے مجتہد العصر کے دل کو بھی تسخیر کر لیا تھا ، چنانچہ انھوں نے بذریعہ معروضے کے بادشاہ کی ستائش کی " (۲) ۔

اس کی تائید وزیر نامہ سے بھی ہوتی ہے ، اس میں بعض تفصیلات ایسی ہیں جن سے وہ شکوک جو مولوی نجم الغنی صاحب کی عبارت سے قصداً یا سہواً پیدا ہوتے ہیں ، صاف ہو جاتے ہیں :

" حضرت پادشاہ عالم پناہ پاءیان دولت فلک صولت امر فرمود تا دو صندوقچۂ نقرئی با کمال زیب و زینت برآراستند و ہریکے را

---

(۱) مولوی نجم الغنی کے اس فقرے پر آگے بحث کی جائے گی ۔
(۲) مولوی نجم الغنی ، تاریخ اودھ حصہ پنجم ، ص ۴-۱۲۳ ۔

ازان بہ ،شغلہ' سلطانی موسوم نمودند وزانسانکہ بمحازن ڈاکہاۓ انگریزی (۱) یک طرف راہی براے انداختن خطوط کشودہ میباشد - ہمچنین دربن صندوقچہ ہای نو ایجاد ہم راہے از بہر انداختن عرایض و دیگر جملہ تحریرات متضمن ضروری حالات کشادہ حاجتمندان را از غایت صنع آن اطلاع عام دادہ بودند........ہمینکہ بندگان سکندر شان از تفریح و گلگشت مراجعت ...... می فرمود مقربان بارگاہ ... آن صندوقچہ ہای مملو از عرایض فی الفوریش نظر معدلت اندیش می آوردندو ظل سبحانی ... خود آن راوا می فرمود و یک یک عرضہ را فرادی فرادی از ابتدا تا انتہا بدیدہ' غور و انصاف ملاحظہ می نمود و از سر کمال داد گستری و نصفت پژوہی باصدار احکام مناسب حال و مقام نا صیہ' ہر مرفوع را زیب توقیع وقیع می بخشید و باز آن صندوقچہ ہای محزن جود و عطا را ،قفل ساختہ' کلیدش بدست حق پرست خود میگرفت ...... پس این ہمہ عرایض کہ مزین بدستخط خاص کرامت اختصاص میگردید فی الفور در بیت الا جراۓ خاقانی برای تنفیذ و امضای آن ہمہ احکام نصفت و معدلت نظام بمزید تاکید سمت ارسال می پذیرفت و بانداز وقفہ معینہ بلا تہاون و تسہیل اجرا و امضایش بمنصہ' ظہور میر سید '' (۲)

---

(۱) انگریزی Letter Box کی یہ نقل تھی -

(۲) وزیر نامہ ص ١٦ ، ١١٣ - وزیر نامہ کی متذ کرہ بالا عبارت سے یہ بات صاف ہو گئی کہ بادشاہ کے دستخط کے بعد وقت مقرر تھا جس میں احکام شاہی کا جاری ہونا ضروری تھا جس سے ہم آج بھی سبق لے سکتے ہیں - مولوی نجم الغنی صاحب کے سامنے وزیر نامہ موجود تھا یہ عبارت ضرور پڑھی ہو گی مگر اس کو نقل نہیں کیا - اسی طرح کی کنٹریبیوٹ سے مسلمان مولفین و مصنفین نے بھی واجد علی شاہ کو بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی - مثلاً راقم الحروف نے بھی واجد علی شاہ کی غیر ذمہ داری اور عدم احساس کا یہ قصہ سنا ہے کہ کسی شخص کے گھر میں آگ لگی ، اس نے درخواست دی کہ آگ بجھانے کا فوراً انتظام کیا جائے ، واجد علی شاہ نے چھ مہینے کے بعد حکم دیا کہ آگ بجھا دی جائے !

عسکری نظام :

انتظامات ملکی کے ساتھ ھی ساتھ واجد علی شاہ نے اصلاح فوج (جو کچھ بھی بچی کچھی اس وقت تک رہ گئی تھی) کی طرف توجہ کی، جس کا ذکر مولوی نجم الغنی نے اپنے خاص انداز میں کیا ھے :

'' فوج کی درستی کا شوق عجیب تفریح انگیز طور پر ''

'' بادشاہ نے پیادوں کی چند پلٹنیں اور سواروں کے رسالے بھرتی کر کے ان کو وردی اور ھتھیاروں سے آراستہ کیا تھا ، اُن کے نام بھی عجیب و غریب رکھے تھے ، بانکا ، ترچھا ، گھنگور اختری اور نادری اور ان کے قواعد کے لیے فارسی زبان میں اصطلاحیں مقرر کی تھیں۔ ابتدائے شوق میں بادشاہ بہ نفس نفیس میدان پریڈ میں جا کر اُن کی قواعد اور نیزہ بازی اور شمشیر زنی اور تفنگ اندازی کی مشق ملاحظہ فرماتے تھے اور تین تین چار چار ساعت تک گھوڑے پر سوار ھو کر دھوپ میں کھڑے رھتے تھے اور کبھی خوش ھو کر انعامات اور خطابات سے سرفراز کرتے تھے، مگر ارباب نشاط کے زور نے اس شوق کو قائم نہ رھنے دیا ۔ لیکن نادرالعصر میں لکھا ھے کہ ایک دن نواب علی نقی خاں نے عرض کیا کہ یہ امر گورنمنٹ کے مزاج کے خلاف ھے اس لیے بادشاہ نے بالکل اس طرف سے کنارہ کیا '' (۱)۔

وزیر نامہ میں فوجی تنظیم سے دست بردار ھونے کا ایک سبب اور دیا ھے:

'' آرایش و افزایش قشونہای جرار از پیادہ و سوار و باترتیب و

۱۔ مولوی نجم الغنی نادرالعصر کی شہادت کے باوجود واقعات کو مسخ کر کے پیش کرنا چاھتے ھیں ۔ عبارت محولہ بالا میں '' ابتدائے شوق میں .... مگر ارباب نشاط کے زور نے اس شوق کو قائم نہ رھنے دیا '' کا جملہ بڑھا کر وہ قارئین پر یہ اثر ڈالنا چاھتے ھیں کہ وقتی طور سے وہ فوج کی طرف متوجہ ھوئے مگر طبیعت عیاشی کی طرف مائل تھی اس لیے '' ارباب نشاط کے زور نے اس شوق کو قائم نہ رھنے دیا '' ۔ اگرچہ ان کے سامنے نادرالعصر و وزیر نامہ کی عبارتیں موجود تھیں ۔

تهذیب اسلحه و سامان نادره کار و آتشخانه های شرربار و نیز تعلیم آئین رزم و حرب و تنظیم زدو ضرب جداگانه از پیشین دستورات انگریزی و هندوستانی بنوعیکه از اختراعات ذهن عالی بر آمده شگفت افزای اهل روزگار گردید .... مخفی مباد که علاوه فوجیکه از قدیم‌الایام ملازم این سلطنت با عز و شوکت بوده حضرت بادشاه عرش کلاه چند دستهٔ عساکر جرار ستیزه کار از سواران سلحشور وپیادگان رزم جو سراپا زور با آلات و اسلحه خوب و دیگر جمله ساز و سامان بیمثل و مرغوب به تجویز و پسند نظر بلند خود بر افزود و هریکی را بنامهائے خوش نمائے زبان اردوی معلیٰ مثل بانکا و ترچھا و گھنگور و اختری و نادری ملقب و مخاطب فرمود و انچه از الفاظ قواعد و احکام حرکات و سکنات رزمیه بکار فرمائی عسکریان ضرور میباشد خود بپارسی زبان برای تعلیم شان با لحاظ کمال فصاحت و اختصار و مراعات دبدبه و داب رزم و پیکار به کیفیتی اختراع کرد که هنگام حرف زدن بآن در امر و نهی برنبرد ازمایان معرکهٔ شجاعت و دلیری تازه ولولهٔ شوق ستیهش و کارزار بی‌اختیار بدلها می افتاد . . . خود بدولت و اقبال بر شبدیز تیز گام سوار شده به تعلیم قواعد حرب و ضرب و ترکتاز زدن با عساکر جرار و تهمتان آزموده‌کار صرف اوقات گرامی بکمال سطوت و بلند نامی می نمود سه سه چهار چهار ساعت کامل در تابش آفتاب و گرد و غبار میدان بگوناگون مجاهدات و سرگرمیهای مردانه عرقرانی و قطره فشانی ها میکرد و کیفیت عمل و کار و گردش و رفتار و گران گیری و سبک خیزی هائے هر جم و جماعت را بچشم تفحص و اعتبار ذره ذره در می آورد لشکریانیکه عیار کار خود را بمحک امتحان می نهادند همه را بانعامات شاهانه می نواخت و گاهی بالقاب و خطابات مناسب هم خورسند و سربلند می ساخت......در همان اثنا که حضرت پادشاه عالم پناه سرگرم هر گونه انتظام مهام سلطنت و جهانبانی بود و به ترتیب و تهذیب مبانی فیض بخشی و داد رسانی همه تن صرف اوقات گرامی میفرمود بلحوق مرض تبخیر قلبی و دماغی انحرافی بمزاج کرامت امتزاج راه یافت و طبع مقدسش از جادهٔ سویت و اعتدال بر تافت . . . . . . جمله اطبای حذاقت پیشه و الباى صداقت

اندیشہ باوقات خفت و افاقت هم از کشیدن زحمت فکر و تردد و تصدیع دادن بقلب و دماغ امتناع شدید می نمودند و برائے اشتغال باشغال عیش و سرور و فرح و حبور که بهیں علاج جہت اصلاح مزاج بود هر دم بتاکید و اصرار می افزودند (۱) " -

اس اقتباس سے صاف ظاهر هے که واجد علی شاہ کا فوجی تنظیم میں انہماک دیکھ کر انگریزوں نے نہ صرف ان کو خود منع کیا (جیسا کہ خود بادشاہ کے جواب سے ثابت هے) بلکہ " نمکخواران قدیم " یعنی اطبائے شاهی کو ان کے پیچھے لگا دیا اور " اشغال عیش و سرور و فرح و حبور " میں جان بوجھ کر ان کو الجھا دیا تاکہ آیندہ چل کر یہ سب سے بڑا الزام ان کے خلاف کارگر هو (۲) -

واجد علی شاہ نے خود اپنے جواب میں، جس کی تفصیل آیندہ آئے گی، اس کی صراحت کی هے، وہ کہتے هیں :

" ابتدائے سلطنت میں میرا جی چاهتا تھا کہ اپنی افواج کی حالت درست کروں اور ان کی نگاہ داشت کروں اور میں نے اپنے محافظ دستے کی ترتیب بھی شروع کر دی تھی مگر چونکہ یہ کرنل رچمنڈ (Richmond) کو ناگوار گزرا، میں نے اس سے کلیتہً احتراز کیا" (۳) -

میرے خیال میں بادشاہ کا نام لے کر کرنل رچمنڈ کو ملزم ٹھیرانا کہ اس نے تنظیم و ترتیب افواج سے، بلکہ محافظ دستے سے بھی منع کر دیا، صاف ظاهر کرتا هے کہ انگریزوں کا ایما و منشا کیا تھا۔ ادھر اطبائے شاهی کو لگا کر، اصلاح و درستیٔ مزاج کے بہانے سے بادشاہ کو ناچ اور گانے

۱- وزیر نامہ، ص ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۹-۱۲۸، ۱۳۱

۲- مگر تعجب هے کہ مولوی نجم الغنی صاحب نے وزیر نامہ میں یہ عبارت نہیں دیکھی، اگرچہ وزیر نامہ اُن کے پیش نظر تھا۔

۳- جوابات شاهی، ص ۴ (واجد علی شاہ نے جو جوابات Oudh Blue Book کے الزامات کی تردید میں لندن میں پیش کئے تھے)

کی ترغیب و تشویق میں اضافہ کیا، جیسا کہ "وزیر نامہ" کی عبارت سے صاف ظاہر ہے۔

"وزیر نامہ" سے ایک بات اور ثابت ہوتی ہے، وہ یہ کہ بادشاہ نے اصلاح کار کے لیے قواعد و ضوابط کا ایک مجموعہ (Code) تیار کیا تھا جس کا نام "دستور واجدی" رکھا تھا:

> "احکام و قوانین انتظامی را کہ وقتاً فوقتاً تحریر و نافذ فرمودہ بود، بطور دستور العملی برای کارروائی ہائے سلطنت بیک جا ترتیب فرمودہ و بدستور واجدی موسوم نمودہ"۔ (۱)

دستور واجدی:

قارئین کی دلچسپی کے لیے میں "وزیر نامہ" سے دستور واجدی کی صرف فہرست مضامین پیش کرتا ہوں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ کس قسم کے اور کس لیے یہ دستور بنائے گئے تھے:

دستور اول	-	متضمن فائدہ کثیر و رفاہ حال ہر صغیر و کبیر
دستور دوم	-	دربارۂ متمردان و استیصال بنیان ظلم و فساد
دستور سوم	-	حکم بنام عاملان و داروغگان دربارۂ عجلت تصفیہ مقدمات
دستور چہارم	-	دربارۂ رفع مقدمات مستغیثان علی الخصوص انگریز و حکم بنام امنا
دستور پنجم	-	طلب فہرستہائے مقدمات منفصلہ و غیر منفصلہ
دستور ششم	-	مقدمہ منع قبض و تحصیل زر بتعلقداران پیش از شکون
دستور ہفتم	-	دربارۂ تقرر تحصیلداران امانی و دستور برای ایشان
دستور ہشتم	-	دربارۂ تصفیہ مقدمات بلا رو و رعایت و حکم بنام امنا و مفتیان

۱- وزیر نامہ ص ۱۳۰

دستور نہم	- دربارۂ رفع تعدیہائے مردم فوج جنگی و نظامت و حکم بنام افسران فوج
دستور دہم	- دربارۂ امتناع قبالہ جات از ہیچکدام محکمہ سوائے عدالت العالیہ
دستور یازدہم	- در بارۂ انتظام و منع رشوت و دیگر ہدایات
دستور دوازدہم	- در بارۂ قانون ہولی و منع ہزل و یا وہ سرائی
دستور سیزدہم	- در حال منع ستی شدن ہندو زنان
دستور چہاردہم	- در باب آسایش رعایا و عامۂ برایا حکم بنام کار کنان سلطنت
دستور پانزدہم	- در باب آسایش رعایا و تسہیل گذشتن عرائض و حکم بنام اراکین دولت
دستور شانزدہم	- دربارۂ استکشاف حال فوج ظفر موج و حکم بنام وزیر اعظم
دستور ہفتدہم	- درباب رفع تکرار معروضات و موقوفی اخبار غیر ضروری
دستور ہژدہم	- متضمن رفع عذرات مستغیثان انگریزی و حکم بنام متوسط
دستور نوزدہم	- درباب آداب شناسی دربار معلیٰ و حکم بنام داروغۂ دیوان عام
دستور بستم	- مشعر ارزانی غلہ کہ رفاہ خلایق در آنست و طلب بنجارہ ہا از نواح
دستور بست و یکم	- بہ مضمون صدورو و ورود حکم بنام کوتوالان وغیرہ
دستور بست و دوم	- متضمن سرعت تعمیل احکام و تعین میعاد و وصول جوابات علی الخصوص در مقدمات انگریزی
دستور بست و سوم	- در باب ممانعت بیع و شری زمینداری و تاتکار بیحکم

دستور بست و چہارم۔ مشعر رفع خلاف سرشتگی و منع رسید بی وصولی زر

دستور بست و پنجم ۔ متضمن تنبیه راجپوتان تبه کار که دختران نوزاد را می کشند

دستور بست و ششم۔ انتظام میله و اهل میله و ممانعت محصول غیر واجبی

دستور بست و هفتم ۔ بمقدمه سزاولی ولی و رفاه رعایا و حکم بنام شرف الدوله بهادر

دستور بست و هشتم ۔ در بارهٔ تدارک دزدان لیلی و نهاری و حکم بنام شحنهٔ بیت السلطنت لکهنؤ

دستور بست و نهم ۔ محتوی انتظام بخشیگری و رفاه مردم فوج و امتناع رشوت

دستور سی ام ۔ دربارهٔ انتظام و حفاظت مسافرین از دست هرکارگان و چیراسیان

دستور سی و یکم ۔ مشعر تهدید بر صیغه داران که در امور دولت خواهی فرو گزاشت نسازند و حکم بنام عاملان

دستور سی و دوم ۔ محتوی انتساق و استدراک ارادات و مطابقت آن از اخبار

دستور سی و سوم ۔ حکم بنام کوتوال جهت خالی نداشتن مکانی تا دزدان مخفی نه نشینند

دستور سی و چهارم ۔ متضمن رفع بدعات زمینداران و گذربانان

دستور سی و پنجم ۔ در باب محصول باغات جدید و منع اغراس

دستور سی و ششم ۔ در باب رفع تکلیف بیوپاریان و اجازت رفتن بهر گنجیکه بهتر دانند

دستور سی و هفتم ۔ مشعر رفع شکایت صاحب رزیڈنٹ بهادر بابت هر کاره ها

دستور سی و هشتم ۔ در بارهٔ مستغیثان کاذب و مفتریان باطل ستیز

دستور سی و نہم - بمقدمۂ ممانعت تعرض از تھانہ داران عمل کمپنی انگریز بہادر۔

دستور چہلم - در باب منع رشوت ستانی و انتظام فوج

دستور چہل و یکم - در بارۂ انتظام عشرۂ محرم الحرام و ہدایت عزاداری

دستور چہل و دوم - بمضمون صدر

دستور چہل و سوم - برائے امنای سرحدی مشتمل بر دوازدہ دفعہ

دستور چہل و چہارم - در بارۂ نظم و نسق و حکم بنام عاملان

دستور چہل و پنجم - در باب رفاہ رعایا و ہدایت بعاملان

دستور چہل و ششم - در باب سرعت ارسال جوابات مستغثان

دستور چہل و ہفتم - در بارۂ منع آبروریزی و قطع اعضا بعد قید و حکم بنام عاملان

دستور چہل و ہشتم - در بارۂ رفاہ و داد رسی رعایا

دستور چہل و نہم - دربارۂ تحقیق امور حضور تحصیل و استکشاف غائلہ جمع

دستور پنجاہم - در بارۂ اسلحہ نہ بستن و روش و آمد رفت سپاہیان سلاح بند

دستور پنجاہ و یکم - در بارۂ انتظام فوج و حکم بنام میر بخشی

دستور پنجاہ و دوم - در بارۂ رفع نالشہائے بے اصل

دستور پنجاہ و سوم - در بارۂ امنای سرحدی و دستورات مشتمل بر چند فصل

دستور پنجاہ و چہارم - در بارۂ اقرار نامہ

دستور پنجاہ و پنجم - ہدایت نامہ برای عاملان

دستور پنجاہ و ششم - جہت انتظام ملک و حکم بنام ناظمان

دستور پنجاہ و ہفتم - ضمیمۂ دستور پنجاہ و پنجم بشمار مذکورہ دربارۂ قبولیت و تحریر آن

دستور پنجاہ و ہشتم - رفع متنازع بطور سرسری

دستور پنجاہ و نہم ۔ بمقدمہ ٔ اخبار و اخبار نویسان

دستور شصتم	-	دو بارہ ٔ حال میلہ و انتظام آن مع دیگر کوایف

دستور شصت و یکم ۔ در بارہ ٔ رہن نامہ و بیعنامہ سلطانی و اشتہار بقید میعاد سہ ماہ

دستور شصت و دوم ۔ ہدایت نامہ سنہ دوم جلوس میمنت مانوس مطابق ۱۲۶۵ ھجری

دستور شصت و سوم ۔ دربارہ ٔ مالگزاران نادھند

دستور شصت چہارم ۔ بمقدمہ ٔ انضباط دستور پوشاک و لباس

دستور شصت و پنجم ۔ دربارہ ٔ موقوف کردن ماثیبان پیش دکاکین

دستور شصت ششم ۔ دربارہ ٔ منع کبیر خوانی و آبرو ریزی (۱)

میں نے '' وزیر نامہ '' سے '' دستور واجدی '' کی فہرست اس لیے نقل کی ہے (اگر چہ میں جانتا ہوں کہ قارئین کرام کو کافی زحمت ہوئی ہو گی جس کے لیے میں معافی خواہ ہوں) کہ لوگوں کو فہرست ہی سے ایک ہلکا سا اندازہ ہو جائے کہ واجد علی شاہ ہر وقت رقص و سرود اور عیاشی میں مستغرق نہیں رہتے تھے بلکہ انتظامات ملکی پر غور کرتے تھے اور جہاں تک انگریز اجازت دیتے تھے ، حتی الامکان تدارک بھی کرتے تھے ۔

واجد علی شاہ کو تخت پر بیٹھے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ ، سکھوں کو مختلف ہتھکنڈوں سے زیر کر کے یکم نومبر ۱۸۴۷ء کو لکھنؤ پہنچا ۔ ہارڈنگ کے اس دورے کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور ہر مصنف نے اپنا زور قلم اس بات پر صرف کر دیا ہے کہ ہارڈنگ (Harding.) نے باوجودیکہ واجد علی شاہ کو سلطنت کی ابتری کی طرف متوجہ کیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر سلطنت کی حالت دو سال میں درست نہ ہو گئی تو کمپنی اس کو ضبط کر کے اودھ کے باشندوں کو ظلم و تشدد سے محفوظ رکھنے پر مجبور ہو جائے گی ۔ ڈلہوزی (Dalhousie) نے بھی اس کا ذکر بڑی آب و تاب سے کیا ہے ۔ ذرا سا غور کرنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ صرف انگریزی پرو پیگنڈے کی ایک

۱- وزیر نامہ ص ۱۴۷ - ۱۵۲

کڑی تھی اور انگریزوں کا جو مقصد اعلیٰ تھا اُس کے لیے زمین ہموار کرنا تھی ۔

ریشہ دوانیوں کی تفصیل :

واجد علی شاہ فروری ۱۸۴۷ء میں بادشاہ بنے اور دس مہینے بعد ہی نومبر ۱۸۴۷ء میں گورنر جنرل ہارڈنگ نے اودھ کی سب خرابیوں کا واجد علی شاہ کو ذمہ دار قرار دے کر متنبہ کر دیا کہ مدت معینہ یعنی دو سال میں اگر اصلاح نہ ہوئی تو سلطنت ضبط ہو جائے گی ۔ مندرجہ بالا اقتباسات سے جس کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے ، ثابت ہے کہ شروع کے چار پانچ مہینوں میں بادشاہ نے درستیٔ سلطنت اور تنظیم فوج کی طرف توجہ کی ، جیسا کہ اودھ کی ہر تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے ، اگر وہ چند ماہ منہا کر دئیے جائیں تو صرف پانچ چھ مہینوں کے دور حکومت میں کوئی بات ایسی نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے ہارڈنگ تنبیہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ۔ اگر یہ کہا جائے کہ سابق نوابان اودھ یا (بعد کو) شاہان اودھ کے زمانے میں خرابیاں اس قدر جمع ہو گئی تھیں کہ گورنر جنرل کے نزدیک ضبطی کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا، تو یہ بھی عجیب منطق ہے کہ سلطنت کو تباہ و برباد کر دیں (اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے) واجد علی شاہ کے باپ دادا ، اور اس کی سزا بھگتیں واجد علی شاہ !۔ ہارڈنگ کے دورے تک بادشاہ کو تخت پر بیٹھے ہوئے اس قدر کم عرصہ ہوا تھا کہ " تنبیہ " "رعایا پر ظلم و تشدد" " رعایا کی فلاح و بہبود" اور اسی قسم کے فقرے ایک منصوبے کے تحت انگریز ، شمال سے لے کر جنوب اور مشرق سے لے کر مغرب تک ، ہر ہندوستانی ریاست کو ہضم کرنے سے پہلے استعمال کرتے تھے ، صرف موقع اور محل کی تلاش تھی ۔ لطف یہ ہے کہ خود ہارڈنگ کی گورنر جنرلی کے زمانے میں واجد علی شاہ نے ملک و فوج میں جو اصلاحات کرنا چاہیں ان کو اسی کے رزیڈنٹ رچمنڈ نے منع کر دیا ، ظاہر ہے کہ اتنا بڑا قدم رزیڈنٹ نے بغیر گورنر جنرل کی اجازت کے نہ اٹھایا ہو گا ، مگر اس کا بھی نہ کہیں ذکر ہے اور نہ "تنبیہ" میں اعتراف ہے ۔

لارڈ ڈلہوزی نے بھی الحاق اودھ کا سب سے بڑا سبب یہ بتایا ہے کہ ہارڈنگ کی " تنبیہ " اور دو سال کی توسیع مدت کے باوجود بادشاہ نے اصلاح مملکت کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا ، مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی

ہے کہ گوناگوں دشواریوں کے باوجود واجد علی شاہ نے رعایا کی فلاح و بہبود کے کام انجام دینا چاہے مگر خود ڈلہوزی نے بادشاہ کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا!

لارڈ ہارڈنگ نے ۲۳ نومبر ۱۸۴۷ء کو ملکی اصلاحات کی طرف بادشاہ کو متوجہ کیا تھا اور دو سال کی مدت مقرر کی تھی، مگر واجد علی شاہ نے موسم بہار ۱۸۴۸ء ہی میں یعنی صرف تین چار ماہ کے بعد رزیڈنٹ سے اصلاحات کا خاکہ مانگا، جو کمپنی کی حدود میں رائج تھیں تاکہ ابتداً ان کو اودھ کے سرحدی اضلاع میں رائج کیا جائے۔ کرنل رچمنڈ رزیڈنٹ نے تجویزیں پیش کیں اور اپنے اسسٹنٹ کپتان برڈ (Bird) کو بادشاہ کی اجازت سے آگرے بھیجا تاکہ مسٹر تھامسن (Thomason) لفٹنٹ گورنر کے مشورے سے ایک ایسی اسکیم انتظام ملکی کے لیے تیار کی جائے جیسا کہ بادشاہ چاہتے تھے۔ چنانچہ کپتان برڈ نے تجاویز مرتب کر کے تھامسن کو پیش کیں اور اس نے غور و خوض کے بعد ان کو آخری شکل دے دی۔ کپتان برڈ نے لکھنؤ واپس آ کر تھامسن کی اصلاح شدہ تجاویز کو وزیر کے سامنے پیش کیا، جنھوں نے ان کو من وعن تسلیم کر لیا۔ مگر قبل اس کے کہ یہ تجاویز بادشاہ کی خدمت میں بھیجی جائیں کرنل رچمنڈ نے یہ طے کیا کہ ان تجاویز کو گورنر جنرل کی منظوری کے لیے بھیجنا چاہیے، چنانچہ وہ تجاویز سرہنری الیٹ (Eliot) سکریٹری گورنمنٹ کو بھیج دی گئیں اور اس نے یہ کہہ کر مسترد کر دیں کہ ''اگر بادشاہ اودھ اپنی پوری سلطنت سے دست بردار ہو جائیں تو ایسٹ انڈیا گورنمنٹ اس پر غور کرے گی ورنہ ایک جزو کے لیے اتنی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں'' (۱)۔ بالفاظِ دیگر رعایا کی فلاح و بہبود تو ایک بہانہ تھا، مقصد اصلی تو اودھ پر قبضہ کرنا تھا۔ جب ڈلہوزی نے یہ دیکھا کہ اصلاحات کے لیے واجد علی شاہ تیار ہیں اور یہ بہانہ بھی ہاتھ سے جاتا ہے تو یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ اصلاحات کا یہ مسودہ جس کو واجد علی شاہ، علی نقی خان وزیر سلطنت، کپتان برڈ، کرنل رچمنڈ رزیڈنٹ اور لفٹنٹ گورنر تھامسن نے منظور کر لیا تھا، اس

۱۔ کپتان برڈ، اودھ کی لوٹ، Dacoitee in Excelsis،
ص ۲-۱۰۱

کو ڈلہوزی نے بیک جنبش قلم مسترد کر دیا اور پھر بادشاہ کے خلاف جو فرد جرم لگائی اس میں عدم اصلاحات ملکی کو خود ہی سب سے بڑا جرم قرار دیا ۔ کپتان برڈ نے اصلاحات کا یہ مسودہ ' جو اس کے پاس محفوظ تھا ، سلیمن (Sleeman) کو اواخر ۱۸۴۹ء میں ، بقول اس کے ' دکھایا تھا ' مگر سلیمن نے اپنی شہرہ آفاق رپورٹ ''سلطنت اودھ کا دورہ'' میں جس کی بنا پر الحاق اودھ عمل میں آیا ، اس کا کوئی ذکر تک نہیں کیا ۔ اس واقعے سے اعلیٰ ترین انگریز حکام کی دیانت اور راستبازی کا صحیح نقشہ سامنے آتا ہے ۔ کپتان برڈ اور کرنل سلیمن سے اگر لڑائی نہ ہو گئی ہوتی اور کپتان برڈ کمپنی کی ملازمت نہ چھوڑ دیتا تو دنیا کو یہ پتا بھی نہ چلتا اور اگر علم بھی ہوتا تو یقین کرنے کو تیار نہ ہوتی کہ غریب واجد علی شاہ کی کن کن کوششوں کو کس کس طرح سے ناکام بنا کر ان کو بدنام کیا گیا ، سچ ہے :

عدو شود سبب خیر گر خدا خواهد

اگر انگریز ۱۸۴۷ء یا اس کے قبل یہ سمجھتے کہ اودھ کی کوئی ضرورت نہیں تھی تو یہی الزامات بڑھا چڑھا کر تراشتے اور اودھ کو ہڑپ کر لیتے ، مگر اس وقت تک ہندوستان کلی طور سے اس قدر کمزور نہیں ہوا تھا کہ سلطنت اودھ کی ایسی مطیع و منقاد دیسی ریاست اپنے ہاتھ سے ختم کر کے خطرہ مول لیتے ۔ ۱۸۴۷ء میں ''تنبیہ'' کر کے جو واجد علی شاہ کو چھوڑ دیا گیا تھا ، وہ صرف اس لیے تھا کہ سکھوں کو داؤں پیچ سے ہرانا مقصود تھا ، مگر ستمبر ۱۸۴۶ء کے دوسرے معاهدے (جس کو معاہدہ بھیرو وال کہتے ہیں) کے بعد ہارڈنگ خوب سمجھتا تھا کہ سکھوں سے ایک اور سخت مقابلہ ہو گا اس لیے اودھ کو باقی رہنے دیا کہ اس کے وسائل سے فائدہ اٹھایا جائے اور یہاں کے دلیر اور بہادر سپاہیوں کو سکھوں کے مقابلے میں موقع آنے پر توپوں کے منہ میں جھونک دیا جائے ، جیسا کہ پہلے نیپال ' افغانستان ، سندھ ، پنجاب اور مرہٹوں کے خلاف ان کو جھونک دیا تھا ، چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ جنوری ۱۸۴۸ء میں ہارڈنگ ولایت واپس چلا گیا اور ڈلہوزی (جو کچھ روز قبل آ چکا تھا) اس کا جانشین بنا ۔ آتے کے ساتھ ہی سکھوں سے الجھ گیا اور ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد برما کی طرف متوجہ ہوا ۔ ۱۸۵۲ء میں پیگو (Pegu) پر بھی قبضہ کر کے سانس لینے کا

موقع ملا تو اودھ کی " رعایا کی زبوں حالی " اور واجد علی شاہ کی عیاشی نے حضرت عیسیٰ کی اس بھیڑ کو بے چین کر دیا -

ڈلہوزی نے اپنے ذہن میں اودھ پر قبضہ کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا ' اس پر آنے کے ساتھ ہی عمل در آمد شروع کر دیا - ۱۸۴۸ء میں وہ گورنر جنرل بنا اور ۱۶ ستمبر ۱۸۴۸ء کو تقرری کا جو خط سلیمن کو بھیجا ' اس میں ڈلہوزی نے لکھا :

> " اب میں ایک ایسے انتظام کی تجویز پیش کرتا ہوں جو نہ صرف آپ کی طبیعت کے موافق ہو گی بلکہ جو آپ کی خدمات کو عملی طور پر اسٹیٹ (کمپنی) کے لیے مفید ثابت کرے گی . . . گورنر جنرل (ہارڈنگ) نے جو خط اکتوبر ۱۸۴۷ء میں شاہ اودھ کو بھیجا تھا ' اس میں بادشاہ کو بتا دیا تھا کہ اگر دو برس ختم ہونے سے پہلے سلطنت کی حالت درست نہ ہوئی تو انتظام مملکت ان کی طرف سے برٹش گورنمنٹ اپنے ہاتھ میں لے لے گی - اس کی بہت ہی کم توقع یا امید ہے کہ اکتوبر ۱۸۴۹ء تک کوئی بھی اصلاح ہو سکے - ایک وسیع ، زرخیز اور مظلوم ملک کے داخلی نظم و نسق کو از سر نو درست کرنا اس افسر کا ، جس کے سپرد یہ کام کیا جائے ، باوجود دقت طلب ہونے کے نہایت ہی اعلیٰ فریضہ ہے اور گورنمنٹ نے ایک بہترین افسر کو اس کام کے لیے منتخب کیا ہے . . . . میں آپ کو لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کے عہدے کی پیشکش کرتا ہوں ' خاص طور سے ان عظیم تبدیلیوں کے پیش نظر جو غالباً ہونے والی ہیں " (۱) -

اس خط کے پڑھنے کے بعد (جس کے علاوہ ڈلہوزی نے زبانی ہدایات بھی سلیمن کو دی ہوں گی) یہ کہنا کہ سلیمن کی رپورٹ ڈلہوزی کے ضبطیٔ سلطنت کے فیصلے کی اصل بنا تھی ، صریحاً غلط ہے - ڈلہوزی شروع ہی سے موقع کی تلاش میں تھا جس کے لیے وہ وقتاً فوقتاً زمین تیار کر رہا تھا - سب سے پہلے اس نے بادشاہ کی ۱۸۴۸ء کی مجوّزہ اصلاحات کو ،

۱- میجر جنرل سلیمن : " سلطنت اودھ کا دورہ " جلد ۱- دیباچہ ص xvii

جن کو ریذیڈنٹ رچمنڈ اور لفٹننٹ گورنر تھامسن نے مناسب ترمیمات کے ساتھ منظور کر لیا تھا ، مسترد کر دیا۔ پھر یہ فکر ہوئی کہ جو خرابیاں خود انگریزوں کی مداخلت سے پیدا ہوئی تھیں اور جن کی اصلاحات کے لیے ڈلہوزی خود راضی نہ تھا ان کو ابھار کر بھیانک صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے ۔ اس کار خاص کے لیے ڈلہوزی کو سلیمن سے بہتر آلۂ کار نہیں مل سکتا تھا ۔ سلیمن نے چوروں اور ٹھگوں کی گرفتاری میں شہرت حاصل کی تھی اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے اور مقصد کی تکمیل میں صحیح اور غلط ذرائع کی چھان بین وہ نہیں کرتا تھا ۔ اسی سبب سے ڈلہوزی نے اس کار خاص کے لیے اسے چنا تھا ۔ غرضکہ ملک میں جو کچھ ابتری خود ریزیڈنٹ کی بیجا مداخلت سے پیدا ہوئی تھی اور ریزیڈنٹ کی پشت پناہی سے غداروں کا جو با اثر طبقہ اودھ میں پیدا ہو گیا تھا ان سب کی بدکرداریوں کو (جن کا ذکر بادشاہ نے اپنے جواب میں کیا ہے) سلیمن کی رپورٹ کی صورت میں دنیا کے سامنے ڈلہوزی نے پیش کر دیا ، تاکہ اس کا دلی منشا '' عظیم تبدیلیوں کی صورت میں '' پورا ہو ، شاید ایسے ہی موقع کے لیے شاعر نے کہا ہے : قصور ڈھونڈ کے پیدا کئے جفا کے لیے ۔

سلیمن جنوری ۱۸۴۹ء میں بحیثیت ریزیڈنٹ کے لکھنؤ پہنچا اور آتے کے ساتھ ہی کار خاص میں منہمک ہو گیا ۔ چنانچہ اپنے پہلے خط مورخہ ۳۰ جنوری ۱۸۴۹ء میں اس نے الیٹ (Eliot) کو لکھا: '' بادشاہ بہت بیمار ہیں مگر کوئی خطرہ معلوم نہیں ہوتا ''۔

سر ہنری الیٹ ، سکریٹری گورنمنٹ کو خط مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۴۹ء میں لکھتا ہے '' بادشاہ کی وہی حالت ہے جو میں لکھ چکا ہوں......... مگر وہ کسی یورپین ڈاکٹر کا علاج کرنا نہیں چاہتے .... '' ۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈلہوزی نے گوالیار اور لاہور کے نمونے کی ریجنسی (Regency) کی تجویز کی تھی ۔ چنانچہ سلیمن اسی خط میں لکھتا ہے '' آپ کے خط مورخہ ۱۶ اگست ۱۸۴۷ء میں جو ہدایات درج ہیں ، جن کا ذکر میں اپنے آخری خط میں کر چکا ہوں ، ان پر عمل

'کیا جائے گا (۱) مگر گورنر جنرل شاید نئے انتظامات کو معاہدے کی شکل میں دیکھنا چاہیں ، مع ان افراد خاندان شاہی کے جن کو ، مثل گوالیار کے ، ریجنسی کے وقت نامزد کیا جا سکے - میرے پاس لاہور کے معاہدے کی کوئی نقل نہیں ہے ، جہاں ریجنسی مقرر کی گئی ہے ...... " - اس کے بعد سلیمن نے ایک خاکہ اودھ کی نئی گورنمنٹ کا پیش کیا ہے اور ریجنسی میں مقرر کرنے کے لیے واجد علی شاہ کی والدہ اور اُن کے بھائی (مرزا سکندر حشمت) سے مشورے کی رائے دی ہے -

۸ مئی ۱۸۴۹ء کو جو خط ڈلہوزی کو بھیجا ' اس میں سلیمن لکھتا ہے: " کل دوپہر کے قریب تینوں (کپتان ہرڈ ، ڈاکٹر بل اور ڈاکٹر لیکی) محل میں گئے اور بادشاہ سے کچھ عرصے تک باتیں کرتے رہے - (ان تینوں نے) انہیں جیسا کہ سنا تھا ، اس سے بہت بہتر پایا اور دوران گفتگو خیالات میں بے ربطی اور انتشار ذہنی بالکل نہیں پایا .... " -

۱۸ جون ۱۸۴۹ء کو سر ہنری الیٹ کو جو خط بھیجا اس میں بجائے ریجنسی کے ایک بورڈ قائم کرنے کی تجویز کی - چناں چہ سلیمن لکھتا ہے: " بہترین علاج میرے نزدیک ایک بورڈ کا قیام ہے جس کا ایک صدر ہو ، جس کی توثیق گورنر جنرل کریں اور بغیر گورنر جنرل کی اجازت کے ان کی برخاستگی عمل میں نہ آسکے .... " - نئی تجویز یعنی بورڈ کی بہتری ثابت کرنے کے لیے سلیمن لکھتا ہے: " بورڈ اگرچہ ریجنسی کا بدل ہوگا مگر اس قدر مفید نہ ہوگا - بادشاہ کی صحت اچھی ہے اور جب تک وہ خود تخت نہ چھوڑیں ریجنسی کا جواز پیدا نہیں ہوتا " [یعنی جب تک نابالغ تخت نشین نہ ہو ریجنسی(۲) نہیں ہو سکتی] - آگے چل کر مغنیوں اور خواجہ سراؤں

۱- اس فقرے سے ثابت ہوتا ہے کہ ۱۶ اگست ۱۸۴۷ء کو جب واجد علی شاہ کو تخت پر بیٹھے ہوئے صرف چھ مہینے ہوئے تھے ' کوئی خاص منصوبہ ضبطیٔ اودھ کے بارے میں بنا تھا جس کا حوالہ اس خط میں ہے ، اگرچہ اس وقت سلیمن اودھ میں ریزیڈنٹ تک نہیں تھا -

۲- اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سلیمن بیچین تھا کہ واجد علی شاہ جلد سے جلد معزول کر دیے جائیں (چاہے وہ ریجنسی کی صورت میں ہو یا بورڈ کی ، تا کہ وہ صدر مقرر ہو جائے اور فوائد حاصل کرے) -

کا بہانہ لے کر لکھتا ہے : " ان بدمعاشوں کو ہٹانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے ورنہ حالات بد سے بد تر ہو جائیں گے - میرے خیال میں بہترین علاج یہ ہو گا کہ ایک ایسے شخص کو درمیان میں دخیل کر دینا چاہیے جس کی وہ مخالفت نہ کر سکیں اور نہ بادشاہ اس کی کوشش کو ضایع اور برباد کر سکیں اور اگر بادشاہ اعتراض کریں تو ان سے کہہ دیا جائے کہ اپنے لڑکے کے حق میں دست بردار ہو جائیں . . . میں بہت خوش ہوں کہ پنجاب بورڈ کام خوب کر رہا ہے" -

اس خط سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سلیمن پنجاب بورڈ کے طرز پر ایک اودھ بورڈ قائم کرانا چاہتا تھا تاکہ وہ خود پریسیڈنٹ بن سکے -

اگست ۱۸۴۹ء کے خط میں جس پر تاریخ درج نہیں ہے ، ڈلہوزی کو صاف صاف سلیمن لکھتا ہے :

" انتظام سلطنت میں اصلاحات کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ بادشاہ اپنے اختیارات بورڈ کو تفویض کر دیں - یہ وہ کر سکتے ہیں ، بادشاہ کا لقب اور ان کے گھر پر اختیارات ان کے لیے چھوڑ دینا چاہئیں یا وہ اپنے لڑکے ولیعہد کے حق میں دست بردار ہو جائیں اور جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے بورڈ بحیثیت ریجنسی کے کام کرے -"

آگے چل کر سلیمن لکھتا ہے :

" اس قدر مصیبتوں میں گھرے ہونے کے باوجود اس (بادشاہ) کے تساہل اور غفلت نے اس کی رعایا کی نظروں میں اسے (بادشاہ کو) ذلیل کر دیا ہے اور وہ (رعایا) اس سے نفرت کرتی ہے - اس کو کسی کی ہمدردی حاصل نہ ہو گی سوائے ان لوگوں کے جو اس کے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں " -

پھر سلیمن نے اپنی مجوزہ اصلاحات کو بیان کیا ہے جو اودھ بورڈ قائم ہونے کی صورت میں نافذ ہونی چاہئیں - اس کے بعد لکھتا ہے :

" جس وقت سے یہ بادشاہ تخت پر بیٹھے ہیں، انہوں نے تہیہ

کر لیا ہے کہ نظم و نسق (مملکت) میں کوئی حصہ نہ لیں گے ، اپنا پورا وقت گویوں اور خواجہ سراؤں میں اور ان عورتوں میں ، جو یہ لوگ ان کی دلبستگی کے لیے پیش کرتے ہیں ، صرف کرتے ہیں۔"

اس عبارت کے پڑھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ سلیمن جھوٹ بولنے میں کس قدر بیباک ہے۔ اس لیے کہ اس کو معلوم تھا (جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے) کہ ابتدائے سلطنت میں واجد علی شاہ نے فوجی تنظیم کی طرف توجہ کی تھی اور رعایا کی شکایات بھی دور کرنے کا ایک طریقہ نکالا تھا (یعنی مشغلہ سلطانی) مگر کرنل رچمنڈ نے منع کر کے دونوں کو بند کرا دیا۔ دیگر یہ کہ مجوزہ اصلاحات ملکی جن کو کپتان برڈ ، کرنل رچمنڈ اور لفٹنٹ گورنر تھامسن نے پسند کیا تھا اور علی نقی خان وزیر نے بادشاہ کے ایما سے منظور کر لیا تھا ، ان اصلاحات کو خود ڈلہوزی نے مسترد کر دیا۔ اس کے باوجود یہ جھوٹا الزام لگانے میں سلیمن کو کوئی جھجک نہیں ہوئی۔ آخر میں سلیمن نے یہاں تک اس خط میں گورنر جنرل کو لکھ دیا: " بادشاہ کو کوئی صحیح الدماغ خیال نہیں کر سکتا "!

سلیمن کی کوشش صاف معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی اور وجہ سے سلطنت ضبط نہ ہو سکے تو واجد علی شاہ کو مجنوں یا فاترالعقل قرار دے کر سلطنت پر قبضہ کر لیا جائے اور بورڈ قائم ہو جائے ، جس کا صدر لازماً وہی ہوتا۔

مکتوب مورخہ ٦ ستمبر ۱۸۴۹ء

سلیمن نے اپنے خط مورخہ ٦ ستمبر ۱۸۴۹ء بنام ڈلہوزی میں بھی واجد علی شاہ کو برا بھلا کہہ کر بورڈ کی سفارش ان الفاظ میں کی ہے: " میرے خیال میں لکھنؤ کے اعلیٰ ترین روسا پر جو بورڈ مشتمل ہو گا وہ ہر دل عزیز بھی ہو گا اور کارگر بھی ہو گا"۔

مکتوب مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۸۴۹ء

۲۳ ستمبر ۱۸۴۹ء کے خط میں جو بنام ایلیٹ سیکریٹری گورنمنٹ ہے ، سلیمن تجویز کرتا ہے کہ "بورڈ یا ریجنسی کی صدارت محسن الدولہ کو دی جائے اور عظیم الشان اور مرزا خرم بخت اس کے اراکین مقرر کئے جائیں"۔

معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب میں ریجنسی کے قائم ہونے سے جو جھگڑے پیدا ہو گئے تھے ان کی بنا پر یا تو ڈلہوزی اس پر راضی نہیں ہوا کہ وہ سلیمن کو اودھ بورڈ کا صدر بنائے یا سلیمن نے خود اس کو بہتر سمجھا کہ محسن الدولہ کو آگے بڑھا کر ان کی آڑ میں اپنا الّو سیدھا کرے ۔

مکتوب بلا تاریخ:

ایک خط میں جو اس نے ڈلہوزی کو لکھا (جس پر اتفاق سے کوئی تاریخ نہیں ہے) سلیمن لکھتا ہے کہ "بادشاہ کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ہر شخص ان کو حقارت اور ذلت سے دیکھتا ہے، سوائے ان حقیر لوگوں کے جن کی صحبت میں وہ رہتے ہیں ۔ ان کا کھانا، پینا، سونا اور بات چیت صرف گویوں اور خواجہ سراؤں اور عورتوں سے رہتی ہے، اور جس عورت کا سب سے زیادہ اثر ان پر ہے وہ رضی الدولہ کی بہن ہے جس کو وہ اپنی بہن بتاتے ہیں ۔ خاندان شاہی کے کسی فرد یا عمائدین اودھ میں سے کسی کو بھی کبھی ہزمجسٹی سے ملنے یا دیکھنے کی اجازت نہیں اور اپنے بھائیوں اور لڑکوں سے زیادہ ان ذلیل لوگوں کے ساتھ برابری اور مساوات کا برتاؤ کیا جاتا ہے . . . اگر آپ ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے موثر طریقے سے دخل دینا طے فرمائیں گے تو میرے خیال میں یہ ضروری ہے کہ لکھنؤ میں شروع کے چند مہینوں کے لیے، رسالے کا ایک دستہ بھیج دیا جائے . . . . سب سے مقدم یہ ہے کہ حبشیوں کی فوج کو، جو تین سو آدمی ہیں، غیر مسلح کرنا پڑے گا . . . میرے خیال میں بادشاہ ریجنسی کو اختیارات تفویض کرنے پر، زیادہ دقت کے بغیر، راضی ہوجائیں گے . . . بغیر ہمارے رسالے کی موجودگی کے ان حبشی والنٹیروں کی لکھنؤ میں موجودگی سے . . . نہ رزیڈنٹ اور نہ ریجنسی کا (کوئی رکن) محفوظ ہو گا . . . میں نے ریجنسی کے لیے تین اعلیٰ چال چلن کے آدمیوں کا ذکر کیا ہے، محسن الدولہ . . . عظیم الشان اور خرم بخت ۔ . . . فوج ہر جگہ بغاوت کے لیے تیار ہے مگر خاص طور سے لکھنؤ اور اس کے قرب میں اور وہ اس لیے کہ یہاں وہ لوگوں کو لوٹ کر اپنا نقصان پورا نہیں کر سکتی، جیسا کہ دور دراز کے دیہاتوں میں ۔"

گیارہ اکتوبر ۱۸۴۹ء کے خط میں جو الیٹ سکریٹری کو لکھا تھا، سلیمن کہتا ہے:

'' ہندوستان بھر میں ولی (وصی) علی سے زیادہ بد معاش کوئی شخص نہیں ہے - مجھ کو بالکل شک نہیں ہے کہ گورنرجنرل جو کچھ ہمیں تجویز کرنے کا مجاز کر دیں گے، اس کو ہز مجسٹی منظور کر لیں گے کیوں کہ وہ اور ان کا خاندان اب مطمئن ہو گیا ہے کہ ہم کوئی تجویز ایسی نہ کریں گے جو ان کے اور اودھ کے باشندوں کے لیے مفید نہ ہو۔ مگر بادشاہ کی اب دماغی حالت درست نہیں ہے . . . . ہر گھنٹے کی تاخیر ہماری مشکلات میں اضافہ کر رہی ہے اور میں سخت بے چینی کے ساتھ احکام کا منتظر ہوں۔ نئے انتظامات کے ساتھ میں تیار ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ طریق کار کامیاب ہو گا اور گورنرجنرل کی پسندیدگی کا باعث ہو گا'' - (۱)

متذکرہ بالا خطوط کے پڑھنے سے کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ سلیمن کس قدر بے چین تھا کہ واجد علی شاہ تخت سے اتار دئے جائیں اور اودھ میں بورڈ یا ریجنسی قائم ہو جائے، یہاں تک کہ سلیمن نے پہلے تو بادشاہ کو مراق و مالیخولیا میں مبتلا بتایا اور آخر میں صاف صاف کہہ دیا کہ بادشاہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے تاکہ بورڈ یا ریجنسی کے قائم ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو سکے - جنوری ۱۸۴۹ء میں سلیمن ریزیڈنٹ ہو کے لکھنؤ آیا اور اکتوبر ۱۸۴۹ء تک اس نے کافی مواد جمع کر دیا کہ سلطنت اودھ کا خاتمہ ہو جائے اور اسی طرح سے لارڈ ہارڈنگ نے جو ''تنبیہ'' واجد علی شاہ کو نومبر ۱۸۴۷ء میں کی تھی اور دو سال کی مدت دی تھی، ٹھیک دو سال کے بعد جیسا کہ ڈلہوزی نے اپنے خط مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۸۴۸ء میں سلیمن کو لکھا تھا کہ ''یہ امید نہیں کی جاتی کہ اکتوبر ۱۸۴۹ء تک متوقع اصلاحات انجام پا جائیں گے'' - اس کو سلیمن نے اپنی رپورٹوں سے ثابت کر دیا لہذا سلیمن کا آن '' عظیم تبدیلیوں '' کا منتظر ہونا جن کا اشارہ ڈلہوزی نے اپنے خط میں کیا تھا، کوئی تعجب نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ جب اودھ کی بد انتظامی اور رعایا کی ابتری کے اتنے '' شواہد '' اور وہ بھی سلیمن کے ایسے '' معتبر '' ایجنٹ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے ڈلہوزی کے پاس موجود تھے تو پھر ۱۸۴۹ء ہی میں سلطنت اودھ کا خاتمہ کیوں نہ

۱- محولہ بالا تمام خطوط سلیمن کی مشہور رپورٹ ''سلطنت اودھ کا دورہ'' میں (جو کتابی شکل میں چھپ چکی ہے) موجود ہیں۔

کردیا یا کم از کم بورڈ یا ریجنسی کیوں نہ قائم کر دی گئی جس کے لیے سلیمن اس قدر بے چین تھا ۔ شاہ اودھ کو چھ سال جینے کا اور جو موقع مل گیا وہ صرف اس لیے کہ ڈلہوزی دوسری جنگ برما میں اُلجھ گیا ۔

معلوم ہوتا ہے کہ بمصداق پرانی مثل کے کہ ''بیکارمباش کچھ کیا کر'' سلیمن نے یکم دسمبر ۱۸۴۹ء سے خود یا ڈلہوزی کے اشارے سے سلطنت اودھ کا دورہ شروع کر دیا ۔ آج تک کسی رزیڈنٹ نے مملکت کا دورہ نہیں کیا تھا اور نہ اس کا کوئی جواز تھا مگر ڈلہوزی کی پشت پناہی ہوتے ہوئے واجد علی شاہ سے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ سلیمن کو اندرون ملک دورہ کرنے سے منع کرتے ۔ چناں چہ بڑے صاحب دورے پر روانہ ہو گئے اور اس شان و شوکت سے کہ حکومت اودھ کی طرف سے ساز و سامان مہیا کیا گیا ۔ اودھ کی حکومت کی طرف سے ایک وکیل ان کی خدمت میں حاضر رھتا تھا اور مزید برآں دورے کے مصارف تین لاکھ روپے حکومت اودھ سے وصول کر لیے گئے ۔ اگرچہ شروع میں حکومت اودھ نے اس دورے کی اجازت نہیں دی، برٹش گورنمنٹ نے بھی منع کیا کہ بغیر بادشاہ کی اجازت کے دورہ نہیں کرنا چاہئیے ۔ سلیمن (ڈلہوزی کے برتے پر) یہ کہہ کر کہ وہ صرف چنہٹ (لکھنؤ سے پانچ میل) سے کچھ آگے جا کر لوٹ آئے گا ، روانہ ہو گیا (۱) اور پورے اودھ کا تین مہینے تک دورہ کر کے واپس آیا ۔ اور معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کھلم کھلا اندورونی معاملات میں روزانہ مداخلت کرتا رہا (جس کا ذکر آگے آئے گا) ۔ غرض کہ اس دورے کے خاتمے پر اس نے اپنی مشہور رپورٹ ۱۸۵۱ء میں ڈلہوزی کو بھیج دی ۔

یہاں پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ سلیمن نے الحاق اودھ کی سفارش کی ، یہ بالکل غلط ہے ۔ وہ ڈلہوزی کی الحاق کی پالیسی کا مخالف تھا ، چناں‌چہ اس نے ایک خط میں صاف طور سے لکھا ہے :

'' الحاق (Annexation) کا طریقہ جس کو لارڈ ڈلہوزی اور ان کی کونسل پسند کرتی ہے ، میری رائے میں اور ہندوستان میں جو بہترین لوگ اس وقت موجود ھیں ، ان کی رائے میں ، نقصان دہ

۱۔ کپتان برڈ : '' لکھنؤ کی لوٹ '' (Dacoitee In Excelsis) ص ۱۲۹

رجحان ہے ۔ یہ رجحان ایسا ہے کہ اعلیٰ اور متوسط طبقے جو ملک سے وابستہ ہیں ان کو پس ڈالا جائے ۔ (بخلاف اس کے) ہمارا مقصد تو یہ ہونا چاہیے کہ ایسے طبقوں کو وجود میں لائیں اور ان کو پروان چڑھائیں تاکہ آخر میں ہم اپنی حکومت کے استحکام میں ان کی دلچسپی پیدا کریں ۔ (موجودہ پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا) کہ چند ہی سال میں ہم ہر شخص کو اپنے خلاف پائیں گے " ۔

سلیمن ۹ اکتوبر ۱۸۵۴ء کو لکھنؤ سے رخصت ہوا اور اسی سال ۴ دسمبر کو اوٹرم (Outram) بحیثیت رزیڈنٹ کے داخل لکھنؤ ہوا ۔ (۱)

پہلا ہی خط جو سکریٹری گورنمنٹ نے کلکتہ سے اوٹرم کو بحیثیت رزیڈنٹ کے لکھا ، وہ ان معنوں میں دلچسپ ہے کہ اس خط ، مورخہ ۲۴ نومبر ۱۸۵۴ء سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی علالت کے بارے میں رپورٹیں کلکتہ بھیجی گئی تھیں (ان کا ذکر بادشاہ نے بھی اپنے جوابات میں کیا ہے) جن کی بنا پر گورنر جنرل نے یہ خاص احکام جاری کئے کہ "اگر بادشاہ کا انتقال ہو جائے تو ان کے بڑے لڑکے ، ولیعہد کو فوراً تخت پر بٹھا دیا جائے اور تخت نشینی کے بعد انتظام سلطنت ، وقتی طور سے ، وزیر کے سپرد رہے مگر حسب معاہدہ ۱۸۰۱ء رزیڈنٹ نگران و منصرم کل رہے گا "۔ اس کے بعد ۱۸۴۷ء میں لارڈ ہارڈنگ کی "تنبیہ" اور دو سال کی مدت کا ذکر کر کے کہتا ہے کہ :

"متواتر لڑائیوں کی وجہ سے اور اس سبب سے بھی کہ گورنمنٹ انتہائی قدم اٹھانے سے ، جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے ، احتراز کرتی رہی ۔ ان دونوں وجوہ سے گورنمنٹ نے ، اس آخری تنبیہ پر جو آج سے سات سال قبل ۱۸۴۷ء میں بادشاہ کو دی گئی تھی ، کوئی عمل نہیں کیا ۔

" مگر آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرس نے اس عرصے میں ، متعدد بار گورنر جنرل اِن کونسل سے دریافت کیا کہ سلطنت اودھ کے بارے میں کون سا طریقہ اختیار کیا جائے ۔ ہماری سابق "تنبیہ" ابھی تک قائم ہے اور ہمیں ہر طرح سے یقین ہے کہ مملکت اودھ

۱- قیصر التواریخ ، ص ۳ - ۱۰۲

میں ان اصلاحات کے اثرات بالکل پائے نہیں جاتے جن کو گورنر جنرل نے ۱۸۴۷ء میں لازمی قرار دیا تھا اور ہماری دھمکیوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوا ......

" ہز لارڈ شپ محسوس کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ اس طرح سے غیر تشفی بخش صورت میں چھوڑا نہیں جا سکتا ۔

" اس لیے گورنر جنرل ِان کونسل نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں آپ کو ہدایت کروں کہ لکھنؤ پہنچتے ہی آپ اس ملک کے موجودہ حالات کی تحقیقات میں منہمک ہو جائیں تاکہ یہ دریافت ہو سکے کہ وہاں کے حالات ابھی تک اسی حالت میں ہیں جس کا ذکر کرنل سلیمن نے وقتاً فوقتاً کیا ہے، آیا جن اصلاحات کو لارڈ ہارڈنگ نے سات سال قبل بادشاہ کو نافذ کرنے کے لیے حکم دیا تھا ، معاہدہ ۱۸۰۱ء کے بموجب ، ان پر کچھ بھی عمل ہوا اور آیا برٹش گورنمنٹ پر جو فریضہ اس معاہدے کے مطابق عائد ہوتا ہے ، جس فریضہ کو لارڈ ولیم بینٹنگ نے ۱۸۳۱ء میں تسلیم کیا اور جس کا اعادہ لارڈ ہارڈنگ نے ۱۸۴۷ء میں کیا اور آیا ایمانداری کے ساتھ ہم اب بھی ان انتہائی اقدامات سے احتراز کر سکتے ہیں ، جو تنہا ان خرابیوں کے دور کرنے میں ، جن سے اب تک مملکت اودھ کو نقصان پہنچتا رہا ، صحیح طور سے مفید ثابت ہوسکتے ہیں " - (۱)

یہ تو وہ الفاظ تھے جن کو ڈلہوزی اور اس کا سکریٹری ضبط تحریر میں لایا اور جس کو وہ سمجھتے تھے کہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنے ہوں گے اور جو پارلیمنٹ میں زیر بحث آئیں گے ۔ اس کے علاوہ یقیناً ڈلہوزی نے کچھ خاص ہدایات اوٹرم کو راز دارانہ طور پر دی ہوں گی ۔

" وزیر نامہ " کی عبارت صاف بتاتی ہے کہ اوٹرم اسی کار خاص کے لیے لندن سے بلایا گیا تھا :

" آرای اهالی اعالی چنان آماده شد که سر رشتهٔ انتظام مهام

۱- کاغذات متعلق بہ اودھ: پیش کردہٴ پارلیمنٹ ، ۱۸۵۶ء ص ، ۴

سلطنت اودھ بکف کفایت خود در گیرند چنانچہ حکمی درین خصوص بنام نواب ، گورنر جنرل بہادر نفاذ یافت و میجر جنرل اوٹرم صاحب بہادر رزیڈنٹ لکھنؤ از برای اجرای ھمین حکم حسب طلب نواب گورنر جنرل بہادر بہ کلکتہ فرا رسید و بسر کردگی افواجی کہ برای ضرورت این سہم اھم فراھم آمدہ بود باز پس روانہ اودھ گردید'' ۔(۱)

اوٹرم نے لکھنؤ پہنچتے ھی ، ڈلہوزی کی ھدایت کے بموجب ، اودھ کی ابتری اور لا قانونیت کے ثبوت مہیا کرنا شروع کر دئے ، مگر سلیمن کے ''شواھد'' اور اوٹرم کے ''شواھد'' میں ایک بین فرق ھے ۔ سلیمن نے تو اودھ کا تین ماہ تک دورہ کر کے اور رعایا کو آکسا کر جھوٹی سچی ''شہادتیں'' مہیا کی تھیں مگر اوٹرم صاحب کو نہ اتنی فرصت تھی کہ موقع بر جا کر '' تحقیقات '' کریں اور جھوٹی سچی رپورٹ پیش کریں اور نہ بڑے صاحب (اوٹرم) اتنی زحمت گوارا کر سکتے تھے ، لہذا اوٹرم نے لکھنؤ ھی میں بیٹھ کر ، جس طرح پرانا تجربہ کار تھانیدار اپنے تھانے ھی میں بیٹھ کر ڈکیتی اور قتل کی تفتیش کر کے فرسٹ کلاس رپورٹ لکھ دیتا ھے ' اسی طرح مفصل رپورٹ لکھنؤ ھی میں بیٹھ کر اودھ کی تباھی کی تیار کر لی اور اس کو قابل قبول بنانے کے لیے مختلف واقعات کو سن سنا کر اور بڑھا چڑھا کر رنگ و روغن کے ساتھ زیب داستاں کے لیے داخل رپورٹ کر کے ' صرف تین مہینوں میں یعنی ۱۰ مارچ ۱۸۵۵ء کو بخدمت گورنر جنرل بہادر ارسال کر دی ۔ (بعض الزامات جن کا ذکر اوٹرم نے کیا ھے ، مع بادشاہ کے جواب کے آگے بیان ھوں گے) اتفاق سے اوٹرم لے خود ھی اس معمے کو حل کر دیا کہ پوری مملکت اودھ کی خرابیوں کی تحقیقات لکھنؤ ھی میں بیٹھ کر

۱- وزیر نامہ ' ص ۱۹۸ ۔ نواب سید محمد امیر علی خان بہادر ، جن کو واجد علی شاہ نے وزیر السلطان کا خطاب دیا تھا، عمائدین بہار میں سے تھے اور کلکتے کی صدر عدالت دیوانی و فوجداری کے وکیل تھے اور اعلیٰ سوسائٹی کے ایک رکن تھے اور بڑے حکام رس تھے ۔ اسی لیے ان کا لکھنا کہ اوٹرم اسی غرض سے لندن سے بلایا گیا تھا اور جو انگریزی فوج اس غرض کے لیے جمع کی گئی تھی اس کو لے کر اوٹرم لکھنؤ روانہ ھو گیا ، بہت اھم اور وقیع ھے ۔ راقم الحروف نے نواب صاحب کے صاحبزادے خان بہادر سید اشرف الدین احمد صاحب کو دیکھا ھے ، وہ ھوگلی اامباڑہ کے جلیل القدر متولی تھے ۔

اتنے کم عرصے میں اوٹرم نے کیسے کر دی - اپنی رپورٹ میں اوٹرم لکھتا ہے کہ "اس ملک کا ذاتی تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے میں معلومات کے لیے رزیڈنسی کے کاغذات (ریکارڈ) پر کلیتاً انحصار کرتا ہوں اور انہیں ذرائع سے (واقعات کی) توثیق کر سکتا ہوں جنھوں نے میرے پیشرو (Sleeman) کو اطلاعات مہیا کی تھیں" (۱) - اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اوٹرم کو ان الزامات کی صحت اور عدم صحت کے متعلق ، جو اس نے واجد علی شاہ پر لگائے تھے ، کوئی ذاتی علم نہیں تھا - اس نے صرف ڈلہوزی کے حسب الحکم پرانے الزامات کو اپنے الفاظ میں دوبارہ پیش کر دیا - ڈلہوزی نے جو صرف بہانے کی تلاش میں تھا ، سلیمن اور اوٹرم کے عائد کردہ الزامات کو ، جو در اصل ایک ہی تھے اور جن کا کذب بادشاہ نے اپنے جوابات میں ثابت کر دیا ہے ، کورٹ آف ڈائرکٹرز کو اپنی عبارت آرائی کے ساتھ بھیج کر الحاق اودھ کی پر زور سفارش کر دی -

۳ جولائی ۱۸۵۵ء کو ڈلہوزی نے اوٹکمنڈ (Ootacamund) سے ایک مراسلہ کورٹ آف ڈائرکٹرز کو حسب ذیل بھیجا ، جو Oude Blue Book میں سب سے پہلا مراسلہ ہے :

> "میں درخواست کرتا ہوں کہ اودھ کے مسئلے کا جلد از جلد فیصلہ ہو جانا چاہئے - اس مسئلے میں کاغذات (Record) سے جو آپ کا رجحان معلوم ہوتا ہے اور جس عنوان سے یہ معاملہ آپ کے سامنے اب پیش ہوا ہے ، اس سے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس طریقے کو اختیار کرنے سے احتراز کر سکیں جس کو فوراً اختیار کرنے کی سفارش کی گئی ہے" -

اس کے بعد ایک ایسا فقرہ آتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈلہوزی خود کس قدر بے چین تھا کہ اودھ کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا جائے ، چنانچہ ڈلہوزی لکھتا ہے کہ :

> "ان حالات میں اگر آپ خیال کریں کہ آٹھ سال کا تجربہ مجھے مجوزہ کام کے لیے زیادہ اہل قرار دیتا ہے ، بہ نسبت کسی دوسرے گورنر جنرل کے جو اس سلطنت کے انتظام کے لیے نیا مقرر ہو تو میں اجازت چاہتا ہوں کہ آپ کو یقین دلاؤں کہ میں اس فرض منصبی کو

۱- "کاغذات متعلق بہ اودھ" پیش کردہ پارلیمنٹ (۱۸۵۶) ، ص ۱۲

انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔"
پھر لکھتا ہے کہ:

"اگر آپ اس تجویز سے اتفاق کریں جو میں نے انتظام اودھ کے لیے کی ہے اور چاہتے ہوں کہ اس کا جلد سے جلد نفاذ ہو جائے تو میں عرض کروں گا کہ بغیر وقت ضائع کئے اس کام کو سر انجام دینے کے لیے مجھ کو ضروری احکام صادر فرمائے جائیں"۔

"اسی ڈاک سے میں نے اجازت مانگی ہے کہ گورنر جنرل کے عہدے سے ماہ فروری سے سبکدوش کر دیا جاؤں"۔

"اگر آپ مجھے مختار بنانا چاہتے ہیں کہ سلطنت اودھ کے بارے میں مجوزہ پالیسی کو سر انجام دوں تو پھر درخواست کروں گا کہ یکم مارچ ۱۸۵۶ء سے مجھے سبکدوش کیا جائے"۔ (۱)

ممبران کورٹ نے جن کی دولت و ثروت اور ترفع کا ذریعہ ہی ہندوستانی ریاستوں کی لوٹ کھسوٹ تھی، فوراً اجازت دے دی کہ اسکاٹ لینڈ کا یہ بگڑا ہوا رئیس (ڈلہوزی) اپنے دل کی آخری تمنا بھی پوری کرلے۔ اتفاق سے جس زمانے میں ڈلہوزی ہندوستان کا گورنر جنرل تھا، اس وقت بدقسمتی سے ہندوستان کا سکرٹری آف اسٹیٹ سرجان ہوبہاؤس تھا Sir John Hobhouse جو بعد کو Lord Boughton کے خطاب سے مشہور ہوا۔ یہ سزا یافتہ مجرم تھا اور ڈلہوزی کا چچا یا ماموں (uncle) تھا۔ پھر کیا تھا، ہندوستان کے لارڈ صاحب نے جو چاہا سو کیا اور لندن کے بڑے لارڈ صاحب نے صلہ رحمی کا لحاظ کرتے ہوئے ہر بے ایمانی اور بددیانتی کو سراہا اور اس پر صاد کر دیا۔

الحاق کی اجازت:

ڈلہوزی کا مراسلہ مورخہ ۳ جولائی ۱۸۵۵ء (دربارۂ الحاق اودھ) کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ۲۱ نومبر ۱۸۵۵ء کو منظور کرلیا اور الحاق سلطنت کے متعلق کل اختیارات ڈلہوزی کو سونپ دیئے گئے۔ اواخر ۱۸۵۵ء میں گورنر جنرل نے کانپور میں فوج جمع کرنے کا حکم دے دیا اور تیرہ ہزار فوج، علاوہ اس کے جو اودھ میں پہلے سے انگریز افسروں کے ماتحت موجود تھی، لکھنؤ میں داخل ہونے کے لیے تیار ہوگئی تاکہ ان لوگوں کو دہشت زدہ

۱۔ "کاغذات متعلق بہ اودھ" پیش کردہ پارلیمنٹ (۱۸۵۶ء)، ص ۱

کر کے اپنے زیر نگین لے آئیں جن کو، بقول سلیمن و دیگر افسران کمپنی، ظلم و تعدی سے بچانے اور انھیں کے بلانے پر انگریز آئے تھے (۱) ۔ انتزاع سلطنت کے وقت انگریزوں کا کافی فوج جمع کر کے لکھنؤ میں داخل ہونا صاف بتاتا ہے کہ رعایا انگریزوں کے خلاف تھی اور انگریزوں کو لکھنؤ میں کشت و خون کا خاصا خطرہ تھا ۔

نومبر ۱۸۵۵ء میں نجی ذرائع سے جب لکھنؤ میں لوگوں کو معلوم ہوا کہ بادشاہ کے خلاف کوئی کاروائی ہو رہی ہے تو رزیڈنسی سے دریافت کرنے کی کوشش کی گئی مگر بے سود ۔ شروع جنوری ۱۸۵۶ء میں اوٹرم کلکتہ گیا ۔ اس کی غیر موجودگی میں کپتان ہیز (Hayes) قائم مقام رزیڈنٹ سے دریافت کرنے پر کہ اس قدر فوج کانپور میں کیوں جمع کی جارہی ہے، علی نقی خان وزیر کو یقین دلایا گیا کہ انگریزی فوج نیپال گورنمنٹ کی روک تھام کے لیے بلائی گئی ہے جو ضلع لانپارہ پر حملہ کرنا چاہتی ہے ۔ مزید برآں یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اودھ کے خلاف کوئی بری نیت نہیں ہے اور عوامی ہیجان کو رفع کرنے کے لیے کپتان ہیز (Hayes) کے کہنے پر اور اس کی صدارت میں ہاتھیوں اور دیگر جنگلی جانوروں کی لڑائی کرائی گئی ۔ لطف یہ کہ انھیں کھیل تماشوں کو، جن کا محرک خود قائم مقام رزیڈنٹ تھا، بادشاہ کی نالائقی اور طفلانہ حرکتوں کے ثبوت میں یہ کہہ کر پیش کیا گیا کہ واجد علی شاہ بادشاہت کے عہدہ جلیلہ کے لیے بالکل ناموزوں تھے اس لیے کہ ان کا احساس ذمہ داری یہاں تک مٹ چکا تھا کہ جس وقت سلطنت ضبط ہو رہی تھی، اس وقت وہ بچوں کی طرح کھیل تماشوں میں اپنی طبیعت بہلا رہے (۲) تھے ۔ غرضکہ اس طریقہ سے بادشاہ کو بھلاوے میں رکھا گیا جب تک کہ اوٹرم کلکتہ سے نہ آگیا ۔

۳۰ جنوری ۱۸۵۶ء کو اوٹرم کلکتہ سے واپس ہو کر لکھنؤ میں داخل ہوا ۔ " بعد زوال شمسی حضور عالم (علی نقی خان) باطمینان کاشی استقبال کو تشریف فرما ہوئے، اس وقت تک کسی طرح کا کھٹکا و وسوسہ بلکہ گمان بھی پیرامون خاطر نہ تھا ...... غرض ۳ بجے جنرل صاحب داخل

---

(۱) ۔ کپتان برڈ : لکھنؤ کی لوٹ، ص ۱۳۹

(۲) ۔ ایضاً ۔ ص ۱۴۰

رزیڈینٹی ہوئے ، پھر سلامی توپ ہوئی - اس وقت صاحب نے حضور عالم سے کہا کل دس بجے ہمارے پاس آؤ اور احکام گورنرجنرل تمھیں سنائیں گے اور فوج سرکاری انتظام ممالک محروسہ کو آئی ہے ۔کسی امین کو اہتمام رسد کو روانہ کر دو - ایک اور امر تازہ یہ ہے کہ جب اجتماع فوج انگریزی کانپور میں مشہور اور زبان زد خاص و عام ہوا ، بادشاہ نے صاحب اسسٹنٹ سے اس باب خاص میں پوچھا ، جواب دیا کہ راجہ نیپال لاکھ آدمیوں سے اپنے مقام پرستش کو جاتا ہے ، اس کے اہتمام کو فوج سرکار جمع ہوئی ہے لیکن آپ تشفی رعایا کو اشتہار حکم فرمائیں کہ مظنہ فوج کا دل سے جاتا رہے اور در صورت تصور خلاف مجرم سرکار ہو گا اور نیاز مند بھی صاحب مجسٹریٹ کانپور کو منادی شہر کو لکھتا ہے - غرض اسی وقت حسب الحکم راجہ جے لال سنگھ اہتمام رسد کو روانہ ہوئے '' - (۱)

سرکاری کاغذات اور قیصر التواریخ کے بیان میں تھوڑا سا فرق ہے ، اس لیے میں اس اہم ملاقات کی روئداد سرکاری کاغذات سے بھی نقل کرتا ہوں :

'' رزیڈنٹ جب مضافات لکھنؤ میں پہنچے تو (علی نقی خان) وزیر اعظم سے ملاقات ہوئی جو حسب دستور ان کے استقبال کے لیے موجود تھے - تھوڑی سی گفتگو کے بعد رزیڈنٹ نے وزیر سے رزیڈنسی آن کے ساتھ چلنے کو کہا تاکہ اہم امور پر گفتگو کی جا سکے -

'' ۳ بجے سہ پہر کو وزیر رزیڈنٹ کی خدمت میں حاضر ہوئے جنھوں نے ابتدائی فقروں کے بعد وزیر کو بتایا بادشاہ ' کی اطلاع کے لیے ، کہ وہ کلکتہ میں حسب ذیل وجوہات سے روک لئے گئے تھے -

'' پھر رزیڈنٹ نے وزیر سے کہا کہ آخرش وہ وقت آ گیا ہے کہ برٹش گورنمنٹ اپنے کو وہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور پاتی ہے جس کو اب ٹالا نہیں جا سکتا - آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اس پالیسی کا حکم دیا ہے اور وزرائے شاہی نے اس کو منظور کر لیا ہے - بادشاہ کو علم ہو گا کہ لکھنؤ آنے کے بعد ہی رزیڈنٹ کو انتظام ملکی اور اودھ کے عام حالات کے متعلق رپورٹ کرنے کو حکم دیا گیا تھا - گورنر جنرل اس رپورٹ کو اپنے حواشی کے ساتھ ہوم (Home) گورنمنٹ کے احکام کے لیے بھیجنے پر مجبور

۱- قیصر التواریخ ، ص ۱۲۹

ہو گئے اور گزشتہ چند ہفتوں میں احکام صدر ہندوستان پہنچ گئے ہیں اور ان پر اب عمل ہوگا۔

" رزیڈنٹ نے پھر جو تبدیلیاں ہونے والی تھیں وہ بتائیں اور وہ ہدایات بھی بتائیں جو گورنر جنرل نے دی تھیں - اور یہ بھی بتایا کہ اس خیال سے کہ کوئی فساد و ہنگامہ نہ ہو، ایک کافی مضبوط فوجی بریگیڈ کو حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ گنگا پار کر کے دارالسلطنت (لکھنؤ) پر پیش قدمی کرے...... رزیڈنٹ نے وزیر کو یقین دلایا کہ بادشاہ برٹش گورنمنٹ کے الطاف و مراحم پر پورا بھروسا رکھیں ، جو اس بات کا ذمہ لے گی کہ کوئی قدم بھی ایسا نہ اٹھایا جائے جس سے بادشاہ کے منصب و حیثیت یا ان کے ذاتی آرام میں کسی طرح کی کمی ہو یا کسی طریقے سے بھی بادشاہ کے مرتبے اور عزت میں کمی ہو - وزیر نے جواب دیا کہ اگر ملک لے لیا جائے گا تو پھر اس طرح کی کسی شرط کا کوئی محل نہیں اور گورنمنٹ کو اختیار ہے کہ جو دیا تھا وہ واپس لے لے - پھر انھوں نے موجودہ بادشاہ کی حکومت کا ما سبق فرمانروایان اودھ کی حکومت سے تقابل کیا اور جو اس زمانے میں اصلاحات ہوئی تھیں اور جو ہر طرف مشاہدے میں آتی تھیں ان کا ذکر کیا، مگر رزیڈنٹ نے جواب دیا کہ اب اس معاملے میں بحث کرنا یا کسی اور مسئلے کو چھیڑنا بالکل بیکار ہے اور وہ اپنی ہدایات کی رو سے مجبور ہے کہ بادشاہ کے سامنے وہ متبادل تجاویز رکھے جن کا ذکر رزیڈنٹ کر چکا تھا - وزیر نے دوبارہ فوج کی آمد کو غیر ضروری قرار دیا مگر رزیڈنٹ نے کہا فوج کا آنا ضروری ہے اور کہا کہ بادشاہ کا کوئی معتبر ملازم فوج کے ساتھ رہے۔ (۱)

۱- کاغذات متعلق بہ اودھ، پیش کردہ پارلیمنٹ (۱۸۵۶ء) ، ص ۲۷۹-

غلط بیانیوں کے علاوہ انگریزی فوج کے مضبوط بریگیڈ کو لے کر آنا صاف بتاتا ہے کہ اوٹرم کو، جیسے اس کے پیشرو سلیمن کو ، اس کا خطرہ تھا کہ اودھ کی رعایا آسانی سے واجد علی شاہ کو تخت سے اتارنے پر راضی نہ ہو گی - اسی لیے ۱۳ ہزار تازہ دم فوج کو لے کر اوٹرم آیا اور دوسرے ہی دن لکھنؤ میں داخل ہونے کا حکم دے دیا - ادھر کپتان ہیز (Hayes) اور وٹرم نے نیپال کا بہانہ بنا کر اہالیان لکھنؤ و اودھ کو دھوکے میں رکھا -

(جاری)

اوٹرم نے علی نقی خان کو ایک نئے معاہدے کی نقل دی تاکہ اس پر بادشاہ دستخط کر دیں اور اس کے صلے میں بادشاہ کو کچھ مراعات دی جانے کا وعدہ کیا گیا (اس کا ذکر آگے آئے گا) ۔ اوٹرم نے انتہائی چالاکی سے بادشاہ پر نفسیاتی اثر ڈالنا شروع کیا تاکہ وہ معاہدے پر دستخط کر دیں اور اس میں علی نقی خان کو شریک کر لیا ۔ جناب عالیہ کو بھی لالچ دے کر شریک کرنا چاہا مگر وہ لالچ میں نہیں آئیں ۔ اگر اوٹرم اپنی چال میں کامیاب ہو جاتا اور بادشاہ اس معاہدے پر دستخط کر دیتے تو واجد علی شاہ کی نالائقی اور نا اہلی کا دستاویزی ثبوت انگریزوں کے ھاتھ آ جاتا جس کا جواب خود بادشاہ کے پاس نہ ھوتا ۔

(جاری)

راقم الحروف نے اپنے والد سے سنا تھا کہ ان کے والد اور چچا بیان کرتے تھے کہ جب کانپور میں انگریزی فوج جمع ہونے لگی تو لکھنؤ میں ھیجان پیدا ھوگیا ۔ رعایا ھتھیار بند اور سپاہی پیشہ تھی ، سب لڑنے مرنے پر تیار ھو گئے ۔ اوٹرم نے علی نقی خان کو سلا لیا اور واجد علی شاہ کو ھٹا کر علی نقی خان کو مسند پر بٹھانے کا وعدہ کیا ۔ اسی لیے انھوں نے صحیح حالات بادشاہ کو نہیں بتائے ۔ سب سے پہلے مہاراجہ بنارس نے اطلاع دے کر اجازت چاھی کہ جو فوج کانپور جا رھی تھی وہ روکی جائے مگر اس کی بھی اطلاع علی نقی خان نے بادشاہ کو نہیں کی ۔ جب کانپور سے انگریزی فوج اودھ میں داخل ھونے لگی تو شہر میں بڑا ھیجان پیدا ھوگیا اور راستے میں اناؤ سے لے کر لکھنؤ تک سب مقابلہ کرنے کے لیے تیار ھو گئے ۔ اوٹرم نے علی نقی خان کے ذریعے نیپال کا قصہ گھڑا اور بادشاہ اور رعایا کو مطمئن کیا اور علی نقی خان سے کہہ کر راجہ جئے لال سنگھ کو بہمرسانی رسد کے بہانے سے فوج کے ھمراہ کیا تاکہ جب رعایا دیکھے گی کہ بادشاہ کا خاص آدمی فوج کے ساتھ ھے تو اطمینان ھوگا ، اور یہی ھوا ۔ اس طرح سے دھوکا دے کر انگریزی فوج نے لکھنؤ پر قبضہ کیا ۔ اوٹرم کا انگریزی فوج کے ساتھ کسی افسر شاھی کا لانا اس بات کو واضح کرتا ھے کہ اوٹرم کو یقین تھا کہ جب انگریزی فوج اودھ میں داخل ھو گی تو مضافات شہر اور لکھنؤ میں سخت خونریزی ھو گی ، اسی لیے وہ مصر تھا کہ کوئی شاھی افسر فوج کے ساتھ آئے ۔

علی نقی خاں نے جب بادشاہ کو مطلع کیا تو بادشاہ کو بہت حیرت ہوئی اور صدمہ ہوا اور یکم فروری کو بادشاہ نے ایک خط رزیڈنٹ کو لکھا.........
'' لارڈ ہارڈنگ کی تحریر کے بعد پورے ملک میں نیا مالی انتظام (یعنی امانی) جاری کر دیا گیا ہے اور پولیس کے تھانے قائم کر دئے گئے ہیں اور برٹش گورنمنٹ کے ساتھ معاہدے جو ہوئے تھے وہ اس طرح مملکت اودھ پر قبضہ کرنے کا جواز نہیں دیتے ۔ رزیڈنٹ نے اسی دن اس کا جواب یہ دیا کہ وہ اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے اور نہ ہز مجسٹی کے کسی بیان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں اور انہوں نے ہز مجسٹی پر صاف صاف الفاظ میں واضح کر دیا کہ گورنمنٹ ہند نے اٹل فیصلہ کر لیا ہے اور ہدایات کے بموجب وہ ۳ روز سے زائد مہلت دے نہیں سکتے .... جس کے بعد وہ بادشاہ کی منظوری اور دستخط کے لیے حاضر ہوں گے ۔ اس تحریر کے پاتے ہی بادشاہ نے اپنی فوج کو ہتھیار رکھ دینے کا حکم دے دیا اور توپوں کو چرخیوں سے اتروا دیا تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے اس ناجائز فعل کے لیے کوئی بہانہ نہ مل سکے'' ۔ (۱)

اس کے بعد کپتان برڈ ذیلی نوٹ میں لکھتا ہے :

'' ہز مجسٹی کا یہ فیصلہ اس لیے زیادہ قابل تعریف تھا کہ ان کو معلوم تھا کہ ان کی ہندو اور مسلمان پوری فوج نے سخت ترین قسمیں کھائی تھیں کہ اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کے لیے تیغ بدست (لڑتے ہوئے) جان دے دیں گے اور انگریزی (فوج کے) سپاہی بھی' جو زیادہ تر اودھ کے باشندے ہیں اگر جنگ شروع ہو جاتی، تو اپنے باپ، بھائی اور دوسرے عزیزوں کے خلاف گولی چلانے سے انکار کر دیتے ۔ راجاؤں (تعلقداروں) اور زمینداروں نے بھی ہز مجسٹی کو متواتر یقین دلایا تھا کہ اگر وہ اجازت دیں تو ایک لاکھ فوج اور ایک ہزار توپوں سے کمپنی کی الحاق اودھ کی پالیسی کو ناکام بنا دیں ۔ ان پیشکشوں کو بادشاہ نے فوراً مسترد کر دیا جس سے بہت زیادہ بد دلی پھیلی اور کافی شکایت کا موقع ملا''۔ (۲)

قبل اس کے کہ واجد علی شاہ اور اوٹرم میں جو گفتگو ۴ فروری ۱۸۵۶ء کو ہوئی تھی ، بیان کی جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ مجوزہ معاہدے کی

۱- کپتان برڈ '' لکھنؤ کی لوٹ '' ص ۱۳۱ ۔
۲- کپتان برڈ '' لکھنؤ کی لوٹ '' ص ۱۳۱ کا ذیلی نوٹ ۔

شقیں (Articles) پیش کر دی جائیں تاکہ قارئین سمجھ سکیں کہ برٹش گورنمنٹ کے نمائندے یعنی ڈلہوزی اور اوٹرم کس قسم کے معاهدے پر واجد علی شاہ کے دستخط لینے کے لیے اس قدر بے چین تھے ۔

مجوزہ معاهدہ سات شقوں پر مشتمل تھا اور جو معاهدہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور نواب سعادت علی خاں کے درمیان ۱۸۰۱ء میں ہوا تھا اور جو اب تک جاری و ساری تھا ، اس کے متعلق دیباچے (Preamble) میں لکھا تھا "چونکہ معاهدہ (۱۸۰۱ء) کی شق ۱۶ والیٔ اودھ کو پابند کرتی ہے کہ وہ اپنے محفوظ (Reserved) ملک میں اپنے افسروں کے ذریعے سے ایسا انتظام کریں گے جو ان کی رعایا کی بہبودی کا سبب ہو اور باشندوں کی جان و مال کی حفاظت ہوسکے اور چونکہ معاهدے کی اس اہم پابندی کی نافرمانی ہر والیٔ اودھ نے ، یکے بعد دیگرے ، مسلسل کی ہے اور جس کو عام طور سے شہرت ہو چکی ہے .... اور چوں کہ اب برٹش گورنمنٹ کا یہ فرض اولین ہو گیا ہے کہ ایسے موثر اقدام کئے جائیں جن سے ، مستقل طور سے ، اہالیان اودھ کے لیے ایسا منصفانہ اور منفعت بخش طریقهٔ انتظام جاری کیا جائے جو اصلی منشا معاهدهٔ ۱۸۰۱ء کا تھا مگر جس میں کامیابی نہیں ہوئی ۔ اس لیے حسب ذیل سات شقوں پر مشتمل معاهدہ درمیان مارکوئس ڈلہوزی .... اور واجد علی شاہ ، بادشاہ اودھ ، خود اور ان کے ورثا وغیرہ وغیرہ ۔

شق اول ۔ اس (معاهدے) کے ذریعے سے اقرار کیا جاتا ہے اور اس پر رضامندی (درمیان فریقین) ظاہر کی جاتی ہے کہ ممالک اودھ کی دیوانی اور فوجی (Civil & Military) حکومت اب سے ہمیشہ کے لیے آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو تفویض کی جاتی ہے ، مع ان کے محاصل کے (جزو و کل) کلی اختیارات کے ۔ کمپنی اس کا اقرار کرتی ہے کہ شاہی احترام کو قائم رکھنے کے لیے پورا بندوبست کرے گی ، جیسا کہ اس کے بعد ذکر کیا گیا ہے اور ان ممالک کی ترقی کے لیے بھی (انتظام کرے گی) ۔

شق دوم ۔ یہ طے کیا جاتا ہے اور اس پر (فریقین) متفق ہیں کہ ہزمجسٹی کا لقب "شاہ اودھ" قائم رہے گا اور ان کے ورثا اولاد ذکور میں سے جو جائز اولاد ہوں گے وہ بھی اس لقب کے نسلاً بعد نسلٍ مستحق ہوں گے ۔

شق سوم - یہ طے کیا جاتا ہے اور اس پر (فریقین) متفق ہیں کہ ہزمجسٹی شاہ اودھ اور ان کے ورثا کے ساتھ ، ہر موقع و محل پر مثل خود مختار شاہزادوں کے پوری توجہ اور عزت و توقیر کے ساتھ برتاؤ کیا جائے گا -

شق چہارم - یہ بھی طے کیا جاتا ہے اور اس پر (فریقین) متفق ہیں کہ موجودہ معاہدے کی شق اول کے باوجود ہزمجسٹی شاہ اودھ اور ان کے ورثا کو لکھنؤ کے محل اور دلکشا اور بیساپور میں اختیارات کلی ہوں گے ' سوائے اس کے کہ بادشاہ کے حکم سے موت کا حکم حدود محل و باغات کے اندر جاری نہیں کیا جائے گا -

شق پنجم - چونکہ یہ ضروری اور مناسب ہے کہ ہز مجسٹی شاہ اودھ کے رتبہ و مرتبہ کو پوری عزت و وقار کے ساتھ قائم رکھا جائے ، یہ طے کیا جاتا ہے اور اس پر (فریقین) متفق ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہز مجسٹی محمد واجد علی شاہ کو ، محاصل اودھ میں سے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرے گی - ہزمجسٹی کے محل کے عملہ کے لیے بھی کمپنی تین لاکھ روپیہ سالانہ تک مصارف برداشت کرے گی - اس پر بھی اتفاق کیا جاتا ہے کہ ہزمجسٹی کے ہر وارث کو کمپنی بارہ لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرے گی -

شق ششم - چونکہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی ہزمجسٹی شاہ اودھ کے ساتھ انتہائی سیرچشمی کے ساتھ پیش آنا چاہتی ہے ' اس لیے اس پر بھی اتفاق کیا جاتا ہے کہ خاندان شاہی کے جن افراد کے مصارف اس وقت بادشاہ برداشت کرتے ہیں ، ان کے مصارف کی بھی کمپنی ذمہ دار ہوگی -

شق ہفتم - آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی اور والیان اودھ کے ساتھ جو معاہدات آج تک نافذ العمل ہیں اور اس اقرار نامہ کے مخالف نہیں ہیں ، ان کی بھی (اس معاہدے سے) توثیق کی جاتی ہے - (۱)

۱- کاغذات متعلق بہ اودھ ، پیش کردہ پارلمینٹ (۱۸۵۶ء) ، ص ۲۰۱

متذکرہ بالا وہ معاہدہ تھا جس پر واجد علی شاہ کے دستخط کے لیے اوٹرم انتہائی بے چین تھا اور اس معاہدے کا نجی طور پر ایک نسخہ بادشاہ کو علی نقی خاں کے ذریعے سے پہلے بھیج دیا تھا تا کہ وہ بادشاہ کو اس پر راضی کر کے دستخط کرادیں۔ بادشاہ نے اس مسودے کو دیکھ کر یکم فروری کو اوٹرم کو ایک خط بھیجا تھا (جو اوپر نقل کیا جاچکا ہے)۔ جناب عالیہ واجد علی شاہ کی والدہ نے بھی اوٹرم کو بلایا، چناں چہ اوٹرم (یکم فروری) سہ پہر کو ۳ بجے جناب عالیہ سے زرد کوٹھی میں ملا، جناب عالیہ نے دوران گفتگو میں کہا کہ ''اگر امور سلطنت میں غفلت اور عدم توجہی بہ سبب بادشاہ ہے تو آپ نے پہلے بروقت جلوس امتحان لیاقت و قابلیت کا لیا ہوتا اور اگر بہ سبب مدارالمہام سلطنت ہے، پس قصور نارسائی منتظمان سلطنت ہے، مواخذہ سیاست ان کے ذمے ہے اور اس کا آپ کو اختیار ہے، کوئی بھی انتظام اور اصلاح حال کے حیلے سے کسی کا گھر چھین لیتا ہے؟ یہ انصاف سے دور ہے ....'' ۔ پھر جناب عالیہ نے ارشاد کیا کہ ''اگر آپ واجد علی شاہ سے ناراض ہیں، میرے دوسرے بیٹے جنرل سکندر حشمت(۱) کو وارث سلطنت کیجیے یا مرزا ولیعہد کو'' پھر نواب مخدرہ عظمیٰ نے کہا کہ '' سب سے بالا تر یہ ہے کہ مصطفیٰ علی خان جنت مکان کے بیٹے (واجد علی شاہ کے مختلف البطن بھائی) کو بٹھائیے' اگرچہ ہماری غیر جنس ہے''۔ (اوٹرم نے) کہا: ان کی منصوبی سے آپ کو کیا فائدہ؟ فرمایا: اس نظر سے کہ نام سلطنت باقی رہے اور یہ بدنامی ہمارے نام سے جاتی رہے۔ یہ سن کر جنرل صاحب رخصت ہوئے۔ اگر سرکار کو قید لیاقت ہوتی تو البتہ کچھ نہ کچھ ہو جاتا اور جب لینا ہی منظور ہوا پھر بے فائدہ '' ۔ (۲)

---

۱ ۔ ان کے متعلق جنرل سلیمن کی رائے اچھی تھی اور اپنے خط مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۴۹ء میں ریجنسی کے متعلق ان سے بھی رائے لینے کو کہا تھا ۔ جنرل سلیمن : سلطنت اودھ کا دورہ ' دیباچہ ۔

۲ ۔ قیصر التواریخ ، ص ۳-۱۳۲ ۔ قیصر التواریخ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یکم فروری ۱۸۵۶ء بروز جمعہ اوٹرم نے واجد علی شاہ سے بھی ملاقات کی ۔ مگر '' کاغذات اودھ '' سے ثابت ہوتا ہے کہ یکم فروری کو اوٹرم صرف جناب عالیہ سے ملنے زرد کوٹھی گیا تھا ۔ بادشاہ سے بذریعہ تحریر گفت و شنید ہوئی تھی ۔ '' کاغذات متعلق بہ اودھ '' ص ۲۸۴ ۔

۴ فروری ۱۸۵۶ء کو انگریزی فوج لکھنؤ سے آٹھ میل کے فاصلے پر خیمہ زن تھی اور بقیہ فوج دوسرے دن آنے والی تھی - بقول مصنف قیصر التواریخ ''نظر باحتیاط دو کمپ انگریزی داخل شہر ہوئے۔ اس عرصے میں فوج انگریزی بٹالین گورہ رجمنٹ سوار رسالہ ترک سواران ہندوستانی و گورہ توپ خانہ اسپی ۱۲ ضرب، توپ خانہ نرگاوان ۱۲ (ضرب) تقریبا دو کمپ کربلائے تال کٹورہ میدان مقابل عالم باغ مضروب خیام تھے .... جانتے تھے کہ اگر نوبت محاربہ آئے گی، تین ساعت تک لوٹ سارے شہر کی ہمیں معاف ہونے کا حکم ہوا ہے کہ موجب تسکین ہمارے چار پانچ مہینے کے سفر راہ کا ہوگا - اور افسران فوج یعنی صاحب قیصر باغ کو قصر گلہ جانتے تھے وگرنہ اس قدر فوج کا لانا فعل عبث تھا مگر از راہ تقدم بالحفظ اور کیوں کر شبہ نہ ہوتا جہاں فوج شاہی سوائے کثرت رعایا کے پچاس ہزار سے کم نہ تھی، سوائے مردم سپاہ زمیندار و تعلقدار اور راجہ ہائے ممالک محروسہ - اکثر لوگ شہر کے جو فوج دیکھنے جاتے تھے افسران اہل اسلام اپنا راز انتہائی حمیت اسلام سے بیان کرتے تھے کہ ہمیں یقین تھا کہ لکھنؤ بے لڑائی ہاتھ نہ آئے گا اور سب وقت کارزار شریک ہو جائیں گے کس واسطے کہ لکھنؤ چراغ ہندوستان ہے، اس کے بجھنے سے بھی سارے ہندوستان میں اندھیرا ہو جائے گا، مگر افسوس ہے یہاں سب نے نامردی کی اور اہکاروں نے بڑی نمک حرامی کی - (۱)

اسی دوران میں واجد علی شاہ نے بعض معتمدین خاص مثلاً نواب محسن الدولہ بہادر، نواب منورالدولہ و شرف الدولہ محمد ابراہیم خان کو مشورے کے لیے طلب کیا (۲)۔ ''غرض رائے خاص و عام و صغیر و کبیر و فہیم و نا فہم کی اس پر قرار پائی کہ بادشاہ نے جو مہر راضی نامہ پر انکار کیا ہے، اس پر مستقل و قائم رہیں اور بنا بر رفع مظنہ و شک و شبہ صاحبان عالیشان اور ملازمین شاہی کو حکم قطعی پہنچے کہ کوئی شخص ہتھیار نہ باندھے اور توپیں جہاں جہاں ہیں چرخ سے گرادی جائیں اور در دولت کے سپاہی گارد اور پہرے کے اپنے اپنے ہتھیار گودام میں داخل کر دیں، بے اسلحہ فقط چوب دستی سے پہرہ

۱- قیصر التواریخ، ص ۱۳۴ -

۲- علی نقی خان جو دستور معظم تھے ان کا کہیں نام نہیں آیا، معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ ان سے مشکوک ہو گئے تھے، اسی لیے ان کو اس مشورے میں شریک نہیں کیا -

دیں ، یہ اول مرحلہ رفع خدشہ صاحبان ممدوح ہوا ، جس خیال سے نظرُ باحتیاط دو کمپ انگریزی داخل شہر ہوئے '' - (۱)

۴ فروری ۱۸۵۶ء صبح کو ، حسب الطلب ، اوٹرم مع کپتانٌ ہیز (Hayes) اور ویسٹن (Weston) کے ، بوقت ۸ بجے زرد کوٹھی محل میں حاضر ہوئے - محل میں غیر معمولی سناٹا تھا ، محل کے توپچی اور ہز مجسٹی کا محافظ پیدل دستہ بغیر ہتھیاروں کے تھا اور سلامی بھی انھوں نے بغیر اسلحہ کے دی - توپیں چرخیوں سے گرا دی گئیں تھیں اور درباریوں اور حکام سلطنت کے پاس ، جو رزیڈنٹ کے استقبال کے لیے جمع ہوئے تھے ، ایک ہتھیار بھی نہیں تھا - بادشاہ نے خود رزیڈنٹ کا استقبال حسب دستور کیا -

'' کانفرنس میں علاوہ وزیر اعظم کے ، ہز مجسٹی کے بھائی سکندر حشمت ، رزیڈنسی کے وکیل مسیح الدولہ ، ان کے نائب صاحب الدولہ اور وزیر مال راجہ بال کرشن موجود تھے - رزیڈنٹ نے کہا کہ گورنر جنرل کے خط کی ایک نقل وزیر اعظم کے ذریعہ دو روز قبل بھیجی جا چکی ہے کہ بادشاہ کو کافی وقت اس کے پڑھنے اور اس کے مضمون پر غور کرنے کے لیے ملے - ہدایات کے بموجب اب ان کا فریضہ ہے کہ گورنر جنرل کے اصل خط کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیں - ہز مجسٹی نے خط کر غور سے پڑھ کر کہا کہ اس کے مضمون کی ان کو اطلاع کر دی گئی تھی ... تھوڑے سے وقفے کے بعد ہزمجسٹی نے رزیڈنٹ کی طرف رخ کر کے کہا : یہ (برتاؤ) میرے ساتھ کیوں کیا جا رہا ہے ، میں نے کیا کیا ہے ؟ رزیڈنٹ نے جواب دیا کہ اس نئی پالیسی کے اسباب گورنر جنرل کے خط میں صاف طور سے کافی وضاحت کے ساتھ بتا دئے گئے ہیں اور وہ اس مضمون پر گفتگو نہیں کر سکتے ، اور نہ ذرہ برابر ہدایت سے انحراف کر سکتے ہیں ، مگر رزیڈنٹ کو ذرا بھی شک نہیں کہ کافی غور کرنے کے بعد برٹش گورنمنٹ کی تجاویز سے بادشاہ اتفاق کریں گے - ہز مجسٹی کو سوچنا چاہیے کہ گورنمنٹ نے بادشاہ کے مصارف کے لیے کس قدر کافی اور وافر (رقم) مختص کی ہے - بادشاہ کے خطابات و القاب ، اعزازات و مراتب اسی طرح سے قائم رہیں گے

۱- قیصر التواریخ ص ۴ - ۱۳۳

اور ہز مجسٹی کی اولاد ذکور بھی ابدالاباد تک مستحق ہوگی۔ ہز مجسٹی کے احکام ' ان کے محل اور مکانات میں ، علاوہ زندگی و موت کے اختیار کے ، بادشاہ کے ملازمین و متوسلین پر رہیں گے۔ ہز مجسٹی کے اعزا اور خاص ملازمین کے لیے بھی معقول انتظام کیا جانے گا ، رزیڈنٹ کو پوری امید ہے کہ ہز مجسٹی کی عقل سلیم گورنمنٹ کی توقعات کو پورا کرنے پر بادشاہ کو آمادہ کر دے گی۔ رزیڈنٹ ... یہ اعلان کرنے پر مجبور ہے کہ ۱۸۰۱ء کا معاہدہ اب قائم نہیں ہے (یعنی منسوخ ہوگیا)۔ مسلسل ظلم و بد انتظامی جو اس (معاہدہ ۱۸۰۱ء) کی توثیق کے وقت سے اودھ میں پائی جاتی ہے اور بحیثیت ایک فریق کے اس معاہدے کے تحت جن ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا والیان اودھ نے وعدہ کیا تھا ، ان کو پورا نہ کر کے اس معاہدے کی تنسیخ کردی۔ لہذا برٹش گورنمنٹ کو مجبوراً ایسی پالیسی اختیار کرنا پڑی جس سے ہز مجسٹی کی رعایا کے جان و مال کا تحفظ ہو سکے۔ آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرز نے حکم دے دیا ہے اور ہرمجسٹی (ملکہ وکٹوریہ) کے وزراء نے اس کو متفقہ طور سے منظور کر لیا ہے اور گورنر جنرل کو حکم دیا ہے ...... کہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے اس کو نافذ کر دیں۔ ہزمجسٹی بھی اس کو تسلیم کریں گے کہ برٹش گورنمنٹ کو اب کوئی اختیار نہیں ، سوائے ہوم گورنمنٹ (Home Government) کے احکام کو جاری کرنے کے۔ اسی لحاظ سے حکم دیا تھا کہ ہزمجسٹی کی خدمت میں ایک معاہدہ پیش کرنے کے لیے تیار کیا جائے جس میں ہزمجسٹی کے مصارف کا مناسب اور کافی لحاظ رکھا گیا ہے اور کسی بات کو فروگزاشت نہ کرتے ہوئے ، جو بادشاہ کے ازدیاد اعزازات و خطابات و مراتب کا باعث ہوں ، حکومت اودھ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں منتقل کر دیا ہے۔ اس معاہدے کی ایک نقل رزیڈنٹ اس وقت پیش کرنے کا شرف حاصل کرتا ہے ، ہزمجسٹی کے ملاحظے اور غور کے لیے اس وثوق کے ساتھ کہ برٹش گورنمنٹ کی سخاوت کو بادشاہ تسلیم کریں گے اور اس کی توقعات کو پورا کریں گے۔

''ہزمجسٹی نے معاہدہ نہایت ہی اضطراب کے ساتھ لیا اور صاحب الدولہ کو دے کر کہا کہ بآواز بلند پڑھیں۔ مگر بادشاہ کا وہ معتمد

ملازم چند سطروں سے زیادہ جذبات سے مجبور ہو کر ' نہ پڑھ سکا۔ بادشاہ نے معاہدہ ان کے ہاتھ سے لے کر ہر شق کو بغور پڑھا۔

''ہزمجسٹی ضبط نہ کر سکے اور انتہائی غم سے مجبور ہو کر بول اٹھے ، معاہدے صرف برابر کے لوگوں میں ہوتے ہیں۔ اب میری حیثیت کیا ہے کہ برٹش گورنمنٹ میرے ساتھ معاہدہ کرے ؟ ایک سو سال یہ خاندان اودھ میں پھولا پھلا اور ہمیشہ برٹش گورنمنٹ کی امداد ملتی رہی اور اس کی حفاظت میں رہا۔ اس نے ایمانداری سے اور کلیتاً برٹش گورنمنٹ کی خدمات انجام دیں۔ بادشاہت انگریزوں کی بنائی ہوئی ہے جو بنا بگاڑ سکتے ہیں ، جو ترقی دے سکتے ہیں اور مرتبے سے گرا سکتے ہیں۔ ان کے احکام کی دیر ہے جو فوراً تعمیل کئے جائیں گے۔ برٹش گورنمنٹ کی خواہشات کی ذرہ برابر بھی مخالفت کی کوشش نہ کی جائے گی۔ میں اور میری رعایا اس کی خدمت گزار ہے۔

'' مسیح الدولہ نے کہا کہ ہز مجسٹی نے حکم دے دیا ہے کہ توپیں گرادی جائیں اور فوج سے ہتھیار لے لیے جائیں ، جس کو ہزمجسٹی نے فوراً دھرایا اور کہا کہ رزیڈنٹ نے خود دیکھا ہوگا کہ ان کی فوج و رعایا کس قدر نہتی اور بے دست وپا ہے اور مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

'' ہز مجسٹی نے پھر معاہدے کو غیر ضروری قرار دیا (اور کہا کہ) وہ کسی معاہدے پر دستخط کرنے کا حق ہی نہیں رکھتے۔ یہ فضول ہے۔ ان کی عزت بھی جاتی رہی اور ان کا ملک بھی جاتا رہا۔ مصارف کے لیے وہ گورنمنٹ کو پریشان کرنا نہیں چاہتے بلکہ انگلستان جا کر ملکہ سے احکام پر دوبارہ غور کرنے کی اور رحم کی درخواست کریں گے۔ ہز مجسٹی سے رزیڈنٹ نے عرض کیا کہ وہ غور کریں کہ جب تک وہ معاہدے پر دستخط نہ کریں گے ، ان کے آئندہ اخراجات کا کوئی تحفظ نہ ہوگا اور نہ ان کے خاندان کے لیے (کوئی تحفظ ہوگا) ۔ برٹش گورنمنٹ نے (ان کے حق میں) جو فیاضانہ سلوک کیا ہے اس پر (دستخط نہ کرنے سے) لازماً دوبارہ غور ہوگا اور اس کو کم کر دیا جائے گا۔ ہز مجسٹی کے مستقبل کے لیے کوئی انتظام نہ ہوگا اور گورنمنٹ کی فیاضی پر کوئی حق نہ ہوگا۔ رزیڈنٹ

کے لیے احکام صاف اور غیر مبہم ہیں ، گورنمنٹ کا فیصلہ مختتم اور اٹل ہے - رزیڈنٹ نے بادشاہ سے التجا کی کہ وہ غور کریں کہ ہزمجسٹی اور ان کے خاندان کو برے نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا، اگر غلط فیصلے کی وجہ سے کوئی طریقہ' کار اختیار کیا گیا - وزیر اعظم نے رزیڈنٹ کے مشورے کی پر زور اور گرم جوشی سے تائید کی اور بیان کیا کہ ان کے امکان میں جہاں تک تھا انھوں نے برٹش گورنمنٹ کی خواہشات کو منظور کرنے کے لیے بادشاہ کو راضی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی- اس پر ہزمجسٹی کے بھائی (مرزا سکندر حشمت) بول اٹھے کہ معاہدے کا کوئی موقع ہی نہیں ہے ' ہز مجسٹی اب خود مختار نہیں اور فریق معاہدہ ہونے کی حیثیت نہیں رکھتے - ان کا عہدہ ختم ہوگیا اور برٹش گورنمنٹ پورے طور سے حاوی ہے - ہز مجسٹی نے آبدیدہ ہوکر ان عنایات کا ذکر کیا جو برٹش گورنمنٹ نے ان کے اسلاف پر کی تھیں اور اپنی حالت زار کا تذکرہ کیا - اپنا شملہ اتار کر رزیڈنٹ کے ہاتھوں میں رکھ دیا اور کہا کہ اب ان کے اعزازات و خطابات و مراتب سب ختم ہوگئے ، اب وہ دستخط نہیں کر سکتے اور نہ کسی طرح کی (معاہدے کے بارے میں) گفتگو کر سکتے ہیں- وہ برٹش گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہیں جس نے ان کے دادا (محمد علی شاہ) کو تخت نشیں کیا تھا اور اب انہیں گوشہ' عزلت میں بٹھا سکتی ہے - انھوں نے اپنے ورثا کی بدنصیبی کا بھی ذکر کیا اور مصمم ارادے کا اظہار کیا کہ وہ یورپ جا کر تلافی کی کوشش کریں گے، جس کا ہندوستان میں حاصل کرنا ناممکن ہے -

''رزیڈنٹ نے ہدایات سے انحراف کرنے سے لاچاری ظاہر کی اور ہز مجسٹی کو یقین دلایا کہ تین روز ختم ہونے پر اگر ہز مجسٹی نے برٹش گورنمنٹ کی خواہشات کو پورا نہ کیا تو رزیڈنٹ کے پاس کوئی چارہ نہ ہوگا، سوائے انتظام سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کے -

''مزید کچھ گفتگو کے بعد اور اس وقت معاہدے پر دستخط ثبت کرنے سے بادشاہ کے انکار کرنے پر، جس میں تبدیلی کی گنجائش نہ تھی ، رزیڈنٹ نے مطلع کردیا کہ تین روز سے زیادہ کی تعویق کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور پھر..........رزیڈنٹ نے بادشاہ سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی '' - (۱)

۱- ''کاغذات متعلق بہ اودھ'' پیش کردہ' پارلیمنٹ (۱۸۰۶) ص ۲۸۷

یہ تو سرکاری رپورٹ تھی جو اوٹرم نے کلکتے بھیجی تھی مگر حسب دستور اس میں اس کا کہیں ذکر نہیں کہ علی نقی خاں نے کس طریقے سے "بادشاہ کو راضی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی" - قیصرالتواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴ فروری کو زرد کوٹھی میں دوران گفتگو اوٹرم نے کہا "آج سے تین دن تک آپ کو اختیار ہے، بعد اس کے ہمارے احکام جاری ہوں گے۔ غرض اس سوال کا جواب شافی دیا، صاحب ساکت ہوئے اور راضی نامہ جو بواسطۂ دستور معظم ملا تھا، اسے دیا - بادشاہ نے فرمایا کہ میری مہر درست ہے، لیکن جب میں نے برضامندی مہر کی ہو تو پھر میرے انکار کا کیا سبب ہے اور جب آپ خود ہر امر جزئی کو بالمشافہ کہتے ہیں، پس ایسے امر عظیم کو مجھ سے کیوں نہ پوچھا اور یہ مہلت تین دن کی کیا ضروری ہے، آپ کو ہروقت اختیار ہے - پھر صاحب نے کہا کہ اگر بموجب ہماری رضامندی کے کیجیے گا، ہم وہ امر کریں گے جو باعث مزید مسرت اور سبب استقلال و بقائے سلطنت دوام ہوگا اور اگر ناراضی ہماری منظور ہے، شاید قیام لکھنؤ بھی دشوار ہو جائے، بلکہ فیض آباد میں سکونت ہو - جناب عالیہ نے ارشاد کیا، جو خرابی اس گھر کی تمہاری بدولت ہونی تھی ہوچکی، اس سے بدتر اور کیا ہوگا، اب قیام اس شہر اور دوسرے کا اور جو چاہو دونوں برابر ہیں، اس سے زیادہ ہماری آبرو ریزی کیا ہوگی اور جبر صریح اس سے زیادہ کیا ہوگا - (۱)

عبارت محولہ بالا صاف ظاہر کرتی ہے کہ اوٹرم نے علی نقی خاں کو پہلے سے ملا لیا تھا اور وزیر ناسعود نے پہلے ہی سے معاہدے پر بادشاہ کی مہرثبت کر کے اوٹرم کے حوالے کر دیا تھا اور امید یہ تھی کہ اوٹرم کے سمجھانے بجھانے سے بادشاہ، بوجہ اپنی نیک نفسی کے اور اس خوف سے کہ برٹش گورنمنٹ اگر خفا ہو گئی تو آئندہ اخراجات کیسے چلیں گے جس کو اوٹرم نے بار بار دھرایا ہے، ان سب امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے فوراً دستخط کردیں گے - معاہدہ مہر شدہ پہلے ہی سے تیار تھا - ادھر جناب عالیہ کو ایک لاکھ روپیہ سالانہ کا وعدہ کر کے اور لالچ دے کر توڑنے کی کوشش کی تھی۔ اوٹرم چال اچھی چلا تھا اور گوٹیں اچھی بٹھائی تھیں مگر خلاف توقع بادشاہ' مرزا سکندر حشمت اور جناب عالیہ تینوں نے شروع ہی سے اس کی مخالفت کی اور اس طرح علی نقی خاں کی غداری کھل گئی، ورنہ واجد علی شاہ اگر دستخط

۱- قیصر التوارخ، ص ۱۲۵

کر دیتے تو انگریزوں کو کس قدر اچھا بہانہ ہاتھ آتا کہ واجد علی شاہ نے اپنی نالائقی اور نا اہلی کا خود اعتراف کر کے سلطنت اودھ ہمارے حوالے کردی، ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں -

۵ فروری ۱۸۵۶ء کو جو مراسلہ گورنمنٹ ہند کو بھیجا اس میں اوٹرم نے یہ خیال ظاہر کیا "دستاویزات (اشتہارات وغیرہ) کی عبارت اور مادر ملکہ (جناب عالیہ) کی طرف سے جو پیغام آج ملا ہے، وہ مجھے امید دلاتے ہیں کہ بادشاہ کو اپنے اصل مفادات کا خیال ہونے لگا ہے (کیوں کہ ابھی تین دن کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی اور اوٹرم کے اجنٹ بادشاہ کو راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے) - میں نے اس کو مناسب سمجھا، اگرچہ مجھے کسی ہنگامے کا خوف نہیں ہے کہ دیسی ریجمینٹ کے ایک حصے کو چھاؤنی سے بلا کر رزیڈنسی کے قریب ٹھیرا دوں اور دوسرے کو یوروپین افسروں کے مکانات کے قریب (ٹھیرادوں) تاکہ اگر ضرورت پڑے تو ان کی حفاظت ہوسکے اور میں نے بریگیڈیر وھیلر Wheler کو ھدایت کردی ہے کہ وہ کل صبح شہر سے دو میل کے فاصلہ پر مورچہ سنبھال لیں" - (۱)

۶ فروری ۱۸۵۶ء کو ۴ بجے سہ پہر علی نقی خاں رزیڈنسی پہنچے - اوٹرم نے "ان بے بنیاد افواہوں کا ذکر کیا جو کہ بدطینت لوگوں نے پھیلادی تھیں کہ رزیڈنٹ وزیر کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں اور امید ظاہر کی کہ وزیر نے ایک لحظہ کے لیے بھی ایسی خود ساختہ افواہوں پر یقین نہ کیا ہوگا اور امید ظاہر کی کہ ایسے خدشات کو وہ (وزیر) اپنے دل سے نکال دیں گے - وزیر نے کہا کہ انھوں نے ایک لحظہ کے لیے بھی ایسی خبروں پر یقین نہیں کیا اور اور وہ خوب جانتے ہیں کہ رزیڈنٹ ایسے طریقہ کار سے بالا تر ہیں - مگر وہ رزیڈنٹ سے یہ چھپا نہیں سکتے کہ انھوں نے جو پرخلوص اور انتھک کوششیں بادشاہ کو برٹش گورنمنٹ کی خواہشات ماننے اور معاھدے پر دستخط کرنے کے لیے آمادہ کرنے کی ہیں، ان سے ان کے دشمنوں کا ایک جم غفیر پیدا ہو گیا ہے، جس کے غیض و غضب اور حرکتوں سے نہ ان کی جان محفوظ ہے اور نہ ان کا خاندان محفوظ ہے - اگر یہ معلوم نہ ہوتا کہ وہ (وزیر) رزیڈنٹ کی امان میں ہے تو اس کی جائداد اور اس کے مکانات کبھی کے لوٹ

۱- قیصر التواریخ، ص ۱۳۵

لیے گئے ہوتے اور اس کی انتہائی ذلت کی جاتی - رزیڈنٹ اس معاملہ میں وزیر کے عقیدت مندانہ اور انتھک رویہ سے بخوبی واقف تھے - انہوں (رزیڈنٹ) نے یقین دلایا کہ جب تک وہ (وزیر) اس طرز عمل پر گامزن رہیں گے انہیں کسی بات کا خوف نہ کرنا چاہیے - رزیڈنٹ نے انہیں اس لیے بلایا تھا...... کہ آیا ہز مجسٹی کی خوشنودی اس میں ہے کہ رزیڈنٹ بادشاہ کی خدمت میں دوسرے دن صبح کو حاضر ہوکر معاہدے پر دستخط اور اس کی توثیق کے شاھد ہوں یا بادشاہ کا منشا یہ ہے کہ وہ معاہدے پر دستخط نہ کرنے کے فیصلے اور اعلان کو تحریر میں بھیجیں گے - کل صبح ۹ بجے سے زیادہ دیر کی اجازت نہیں دی جائے گی ، اس لیے یہ مناسب بلکہ انتہائی اہم ہے کہ ہز مجسٹی کے ارادے جلد سے جلد معلوم ہو جائیں - وزیر نے جواب دیا کہ وہ فوراً محل جاتے ہیں اور جہاں تک ان سے ہو سکے گا وہ بادشاہ کو دستخط کرنے پر آمادہ کریں گے -

" رزیڈنٹ نے ایک مرتبہ اور زور دیتے ہوئے ان نقصانات کو بتایا جو ہز مجسٹی کو پہنچیں گے ، اگر انہوں نے دستخط کرنے سے انکار کیا - اور پھر دہرایا ، جیسا پہلے بھی کہا تھا کہ رزیڈنٹ نے اپنی ذمہ داری پر ایک لاکھ روپے سالانہ مادر ملکہ کے لیے منظور کئے تھے ' کیوں کہ گورنمنٹ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ توقع کرے کہ مادر ملکہ کے ، بوجہ نزدیک ترین عزیز ہونے کے ، ہز مجسٹی کے وظیفے سے مصارف پورے ہوں گے - بہر حال رزیڈنٹ اس پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے اور جو رقم انہوں نے مقرر کی ہے وہ دی جائے گی - مزید برآں رزیڈنٹ نے وزیر سے انتہائی لجاجت سے اس امر کو سمجھانے اور بادشاہ کے ذہن نشین کرانے کی درخواست کی کہ تمام محلات اور عمارات جو ہز مجسٹی کے خاندان کی عورتوں کے قبضے میں ہیں ، وہ سب انھی کے قبضہ میں رہیں گی ، صرف سرکاری (public) عمارات اور دفتر برٹش حکام کے لیے منتقل کئے جائیں گے ...... رزیڈنٹ نے وزیر کے یہ بھی ذہن نشین کرایا کہ وہ ہزمجسٹی کے سامنے یہ سب اہم فوائد و مراعات پیش کریں اور ہزمجسٹی سے عرض کریں کہ مادر ملکہ کا ایک لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ بڑی حد تک معاہدے پر دستخط کرنے پر منحصر ہے - وزیر نے رزیڈنٹ کی گفتگو کا خلاصہ رزیڈنسی کے وکیل سے لکھوا کر وعدہ کیا کہ بادشاہ کی خدمت میں فوراً پیش کریں گے اور ان کو تیار کریں گے ، جہاں تک ان کے بس میں ہے ،

کہ فوراً دستخط کرنے پر راضی ہو جائیں - رزیڈنٹ نے آخری مرتبہ پھر ان فوائد کو بتایا جو گورنمنٹ کے ایما کے مطابق کام کرنے سے بادشاہ کو پہنچیں گے اور اس کے برعکس طرز عمل کے اختیار کرنے کی حماقت کو واضح کیا کہ اس سے بادشاہ کے مستقبل کا کوئی تحفظ نہ ہو گا اور ان عیار و مکار لوگوں کے (بادشاہ) شکار ہو جائیں گے ، جو بخوبی واقف ھیں کہ ان کا طریقہ' کار بادشاہ کے لیے تباہ کن ، اگرچہ ان کے لیے منفعت بخش ثابت ہو گا - وزیر نے ...... رخصت ہوتے ہوئے وعدہ کیا کہ کسی کو بھیج کر ھز مجسٹی کے عندیہ سے مطلع کریں گے'' - (۱)

اوٹرم کی بادشاہ کے ساتھ ۴ فروری کی ملاقات میں سب سے بڑا عقدہ یہ کھلا کہ علی نقی خان کی انگریزوں سے سازش کا بھانڈا پھوٹ گیا - اپنے ولی نعمت اور داماد یعنی واجد علی شاہ کے ساتھ غداری اور انگریز نوازی کے قصے تو عام طور سے لکھنؤ میں مشہور تھے جو راقم الحروف نے بھی اپنے بزرگوں سے سنے تھے ، مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ علی نقی خان یہاں تک اپنے منصب اور قرابت قریبہ کو بھول گئے تھے کہ بادشاہ کی بلا اجازت معاھدے پر ان کی مہر لگا کر اوٹرم کو معاھدہ دے دیا تھا - لکھنؤ میں متوسلین دربار کے ذریعے سے لوگوں کو ضرور معلوم ہو گیا ہوگا ، جب ھی علی نقی خان نے اپنے جان و مال کو کمال خطرے میں پتا کر اوٹرم کی پشت پناھی چاھی - دوسری بات جو اس واقعہ سے ظاھر ھوتی ھے وہ یہ کہ اوٹرم اب تک یہ سمجھتا تھا کہ علی نقی خان کو اس نے گانٹھ لیا ھے - جناب عالیہ کو بھی ایک لاکھ روپے کا لالچ دے کر توڑ لیا ھے - بادشاہ کی مہر تو علی نقی خان لگا ھی چکے ھیں ، اب صرف معاھدے پر بادشاہ کے دستخط باقی ھیں ، وہ اپنی لسّانی سے بادشاہ کو متاثر کرکے یہ کام کرا ھی لے گا - مگر ۴ فروری کو جو گفتگو بادشاہ ، مرزا سکندر حشمت اور جناب عالیہ سے ھوئی ' اس نے اوٹرم کی آنکھیں کھول دیں اور واجد علی شاہ کے صاف صاف انکار سے اور جناب عالیہ کے چبھتے ھوئے فقروں سے وہ سمجھ گیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھتی معلوم نہیں ھوتی، اسی لیے اب اس نے ایک دوسرا داؤں کھیلا - ایک طرف تو علی نقی خان کے ذریعے سے اور خود بھی بادشاہ

۱- ''کاغذات متعلق بہ اودھ'' پیش کردہ' پارلیمنٹ (۱۸۵۶) ص ۲۹۳

کو ڈرایا کہ اگر گورنمنٹ کا کہنا نہیں مانا تو ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ نہیں ملیں گے اور اخراجات کی مشکل ہوگی ۔ دوسری طرف بادشاہ کو ایک اور لالچ یہ دیا کہ اب تک تو صرف قیصر باغ ، پیپا پور کی کوٹھی اور دلکشا پر واجد علی شاہ قابض ہوتے مگر اب یہ بھی اضافہ کرنے کا وعدہ کیا کہ جتنے محلات اور مکانات بادشاہ کے خاندان کی عورتوں کے قبضے میں ہیں یا ان کے اسلاف کی عورتوں کے قبضے میں ہیں وہ سب انہیں لوگوں کے قبضے میں رہیں گے ۔ علاوہ بریں اوٹرم جس بے چینی کے ساتھ علی نقی خاں کے ذریعے سے کوشش کر رہا تھا کہ مجوزہ معاہدے پر بادشاہ دستخط کر دیں ، وہ ثابت کرتی ہے کہ اوٹرم سمجھتا تھا کہ بغیر ایسے معاہدے کے ، جس میں واجد علی شاہ نے خود اپنی نا اہلی تسلیم کر کے اگر انتظام سلطنت منتقل نہ کیا تو برٹش گورنمنٹ کی بڑی بدنامی ہوگی ، مگر واجد علی شاہ نے خلاف توقع حیرت انگیز طریقے پر ثبات قدم دکھایا اور کسی لالچ یا خوف میں نہ آ کر دستخط کرنے سے انکار کرتے رہے ۔ مرزا سکندر حشمت اور جناب عالیہ نے بھی بالمشافہ اوٹرم کو ایسے مسکت جواب دئے جن کی وہ تردید نہ کر سکا اور واجد علی شاہ کو اپنے ارادے میں ثابت قدم رہنے میں مدد پہنچی ۔ ان دونوں (بھائی اور والدہ) کے علاوہ نواب محسن‌الدولہ ، نواب منورالدولہ اور نواب شرف‌الدولہ محمد ابراہیم خاں نے بھی (صفحہ ۳۱) صحیح مشورہ دے کر اپنی نمک حلالی کا ثبوت دیا ۔

الغرض ۴ فروری کی ملاقات کے بعد سے اوٹرم کو خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں بادشاہ معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار نہ کر دیں اس لیے علی‌نقی‌خان کے ذریعے اپنی کوششیں تیز تر کردیں جیسا علی نقی خان کے ساتھ ۶ فروری کی ملاقات سے ثابت ہے ۔

۷ فروری ۱۸۵۶ء کی صبح کو ، جب تین روز کی مہلت ختم ہوتی تھی ، واجد علی شاہ نے ایک مختصر تحریر کے ذریعے مطلع کر دیا کہ '' معاہدہ پر دستخط کرنے کے متعلق بادشاہ اپنا ارادہ (۴ فروری ۱۸۵۶ء) ۲۶ جمادی الاول کو دوران ملاقات بتا چکے ہیں '' ۔ اوٹرم نے اس دن (۷ فروری) جو مراسلہ گورنمنٹ کو بھیجا اس میں لکھا :

''مجھے افسوس کے ساتھ مطلع کرنا پڑتا ہے کہ بادشاہ نے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ۔ ہز مجسٹی کا فیصلہ آج

۸ بجے صبح ایک مختصر نوٹ کے ساتھ پہنچایا گیا .... میں نے مادر ملکہ (یعنی جناب عالیہ) سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر بادشاہ نے معاہدے پر دستخط کر دیے تو ان کو ایک لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ دیا جائے گا .... یہ بھی میں ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے جو اختیار دیا گیا تھا کہ اگر بادشاہ وظیفے کی کمی کی وجہ سے دستخط کرنے سے انکار کریں تو میں رقم کو بارہ لاکھ سے بڑھا کر پندرہ لاکھ کردوں، اس کو میں نے نہیں برتا ۔ اس لیے کہ کسی ملاقات میں بھی بادشاہ یا ان کے مشیران کار نے کمی وظیفہ کو انکار کا سبب قرار نہیں دیا ۔ انہوں (بادشاہ) نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنی شکایات کو ملکہ کے سامنے پیش کریں گے تا کہ ان کی پوری سلطنت ان کو واپس کردی جائے اور چوں کہ مجھ کو یقین تھا کہ دوگنی رقم یا کوئی رقم بھی ان کو رائے بدلنے پر تیار نہ کرتی (اگرچہ مجھے امید تھی کہ دوسرے اثرات نتیجہ مطلوبہ کو سرانجام دے دیں گے) اس لیے میں نے، اس گورنمنٹ کے رتبہ سے جس کا میں نمائندہ ہوں، یہ بات گری ہوئی خیال کی کہ مجوزہ ذاتی وظیفے کو ایک لاکھ یا دو لاکھ روپیہ سالانہ بڑھا کر پیش کروں، خصوصا اگر زیادہ رقم حاصل کرنے کا منشا ہوتا تو مادر ملکہ سے ایک لاکھ کا جو وعدہ کیا تھا، ان کے ارادے کو متزلزل کردیتا اور یہ دریافت کرنے پر تیار کر دیتا کہ اگر وہ (بادشاہ) فوری طور سے تعمیل کریں تو کیا گورنمنٹ زیادہ دینے پر تیار ہوگی، مگر یہ احتمال یا اس کا اشارہ بھی، کہ وظیفہ کی بیشی بادشاہ کو اپنے فیصلے کے بدلنے پر آمادہ کردے گی، کسی ملاقات میں نہیں ہوا، .... گزشتہ دو روز سے ایک تحریری اعلان بادشاہ کی حکومت سے اظہار اطمینان کا شہر میں دستخطوں کے لیے گشت کررہا ہے جس میں احتمال ہے کہ بہت کامیابی ہوگی، اس لیے کہ لکھنو کے بہت سے طبقوں کو کم و بیش نقصان پہنچے گا کیوں کہ قومی لوٹ جو شہر میں اڑائی جاتی ہے، اس سے وہ (طبقے) محروم ہوجائیں گے ۔

"شہر میں امن و امان ہے اور قرائن بتاتے ہیں کہ ہماری حکومت آسانی سے قائم ہو جائے گی ۔ آج صبح کو کانفرس میں، جو

۱- "کاغذات متعلق بہ اودھ" پیش کردہ پارلمنٹ (۱۸۵۶) ص ۲۹۱

میرے اور جوڈیشل کمشنر اور فنانشل کمشنر کے درمیان ہوئی تھی ....
شہر کو میجر بینکس (Banks) کے حوالے کردیا گیا ، جو فوراً اپنے فرائض کی تکمیل میں مصروف ہو گیا ، کوتوال کی اعانت سے ، جو بہت ہی پھرتیلا اور جوشیلا افسر ہے اور جس کا نام میں گورنمنٹ کی توجہات خصوصہ کے لیے پیش کروں گا ۔

" جو افسران کانپور میں جمع ہیں ، ان کو بلانے کے لیے میں نے فوری احکامات صادر کر دیئے ہیں کہ وہ لکھنؤ آ جائیں تا کہ وہ اپنے اپنے (نامزد) ضلعوں میں جا کر کار منصبی سنبھال لیں " - (۱)

انگریزی حکومت کا پہلا اشتہار :

مدت معینہ گزرنے کے ساتھ ہی اوٹرم نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر افسران و عملہ کو مقرر کردیا اور حسب ذیل اشتہار اطلاع عام کے لیے ہر تھانے پر چسپاں کرا دیا :

" ساکنان ملک اودھ کے لیے بموجب حکم بندگان نواب مستطاب معلی القاب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے جاری ہوا ، واقع ہفتم فروری ۱۸۵۶ء مطابق ۲۹ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ

"بموجب اس عہد نامے کے جو ۱۸۰۱ء میں موکد ہوا سرکار دولت مدار کمپنی انگریز بہادر نے حفاظت بقیہ ملک اودھ کی ایسے سر رشتہ بندوبست کے جاری کرنے کی معرفت اپنے اہل کاروں کے جملہ دشمنان اندرونی و بیرونی سے اپنے ذمہ قبول کی اور والئ اودھ خود ذمہ دار ہوا کہ اس کے باعث سے رفاہ خلائق و حفاظت جان و مال ساکنان ملک اودھ کی حاصل ہو ، چنانچہ اس عہد نامے کی رو سے ذمہ داری سرکار دولتمدار کمپنی انگریز بہادر کو عائد ہوئی - پچاس برس سے زیادہ عرصے سے اس کی تکمیل وعدہ وفائی کے ساتھ برابر تمام و کمال ہوتی رہی ، اگرچہ سرکار دولت مدار اس عرصے کے درمیان جنگ و جدال میں متواتر مصروف رہی ، تا ہم ملک اودھ کی سر زمین پر کوئی بیرونی دشمن قدم نہ دھرنے پایا اور کسی طرح کا فساد عظیم تخت اودھ کی پائداری میں خلل انداز نہیں ہوا - سرکاری فوج ہمیشہ

۱- " کاغذات متعلق بہ اودھ" پیش کردہ پارلمنٹ (۱۸۵۶ء) ص ۲۹۱

شاہ اودھ کے قرب و حضوری میں حاضر باش رہی اور جب کبھی بادشاہ کے اقتدار کی نسبت ناحق دھمکی دکھلائی تو اس فوج کی اعانت دینے میں ہر گز دریغ نہیں ہوا ۔ باوجود اس معاہدۂ عظیم اور استوار عہد نامے کے جملہ والیان ملک اودھ کی جانب سے بر عکس اس کے علی الاتصال بالکل تساہل و تغافل ہوتا چلا آیا ، ایسے سر رشتہ بندوبست کے اجرا کے واسطے جو میثاق ظہور میں ایا کہ اس کے بموجب رعایا و سکنائے ملک اودھ کی جان و مال کی حفاظت ہو ، وہ گویا دیدہ و دانستہ بطور اپنے رویے کے اس سے انحراف کرتے رہے ۔ اس میثاق سے انحراف کرنے کی وجہ سے ممکن تھا کہ سرکار دولتمدار کمپنی انگریز بہادر اس سے کبھیں پہلے اس عہد نامے کو ناجائز کر دیتی اور والیان ملک کی خبر گیری سے انکار کرتی ۔ لیکن اب تک کمپنی انگریز بہادر کو ایسے امور کا اجرا جو ایک دودمان عالیشان کے اقتدار و اختیار کے مخل ہوں منظور نہ تھا ، اس لیے انہوں نے اپنی رعایا کی نسبت کیسے ہی احکامات خلاف عدل و انصاف جاری کئے لیکن کمپنی انگریز بہادر ہمیشہ دوستی و وداد پر قائم رہی ، تاہم کمپنی انگریز بہادر اس تعدیٔ عظیم اور پریشانی سے رعایائے ملک اودھ کو بچانے کے لیے جو اس کو علے الاتصال عائد حال ہوتی رہی بہ کمال کوشش متوجہ رہی ۔ بہت برس گزرے کہ گورنر جنرل بہادر لارڈ ولیم بنٹنک نے اس نظر سے کہ جو کوشش رعایائے ملک اودھ کی بربادی کے لیے ظہور میں آئی تھی، اس کی مزاحمت ہو، دربار اودھ میں اطلاع دی کہ ضرورتاً ملک اودھ کا تمام و کمال انتظام اہل کاران سرکار کمپنی انگریز بہادر کے اہتمام میں داخل کرنا پڑے گا ۔ چنانچہ جو کلمات تنبیہ ولیم بنٹنک کی جانب سے ظہور میں آئے تھے ، آٹھ برس کا عرصہ گزرا کہ لارڈ ہارڈنگ بہادر نے بذات خود ان کا اعادہ کیا ۔ اس زمانے میں والیٔ ملک اودھ کو بڑے اصرار کے ساتھ سمجھایا گیا کہ آیندہ ایسا ہی واقعہ وقوع میں آئے گا (کذا) ۔ یہ بات تمام عالم پر روشن ہو گئی کہ دوستانہ طور پر وقت مناسب میں تنبیہ و آگہی مناسب دی گئی مگر وزرا و بادشاہان اودھ کی تمردی و نالائقی یا سہل انگاری کے سبب سے سرکار کمپنی انگریز بہادر کے دوستانہ مقاصد رائگاں ہوئے ۔ پچاس برس کے عرصے سے زیادہ تک جو صلاح بے غرض و چشم نمائی ہائے

غضبانہ مع متواتر تنبیہات و اعتراضات و تہدیدات کے وقوع میں آئی ان میں سے کوئی بھی اصلاح پذیر نہ ہوئی ۔ اور عہد نامے کے اصل میثاق پر عمل نہ ہونے اور شاہ اودھ کے وعدے کے تعمیل نہ ہونے سے بسبب نالائقی و خیانت و تعدی کے ملک اودھ کی بیچاری مایوس رعایا ضائع و برباد ہوتی رہی ۔ یہ بات تمام ملک میں مشہور ہے کہ شاہ اودھ ملک مذکور کے اکثر والیان پیشین کی طرح اس ملک کی مہمات کے انتظام میں پوری مداخلت نہیں کرتے ہیں ۔ عموماً تمام ملک اودھ کی حکومت کا اختیار یا تو کمینہ مقربوں یا جابر و خائن شخصوں کو جو کارگزاری میں نالائق اور درجہٗ اعتبار سے ساقط ہیں، تفویض ہوتا ہے ۔ محصلان مالگزاری اپنے علاقوں میں سرخودی کے ساتھ حکمرانی کر کے رعایا سے بلا لحاظ اقرار سابق یا حال کے جبراً کوڑی پیسے تک محاسبہ کرتے ہیں ۔ اور شاہ اودھ کی اکثر فوج بے ربط و ضبط ہے اور بخشیان فوج کی بداعمالی کی وجہ سے تنخواہ سے محروم ہے اور اپنی محنت کے عوض میں دیہات کو گویا لوٹنے کے واسطے مجاز ہے، یہاں تک کہ جس ملک کی حفاظت کے واسطے جو فوج متعین ہے، اس پر وہی جابر و قاہر ہوتی ہے ۔ ڈاکوؤں کے غول علاقوں کو غارت کرتے ہیں، آئین و عدل کا نام و نشان نہیں، ہتھیار باندھ کر خانہ جنگی اور خون ریزی رات دن رہتی ہے اور کسی جگہ لحظہ بھر حفاظت جان و مال کی مطلق نہیں ہے ۔ اب وہ وقت آیا کہ سرکار انگریز بہادر ان برائیوں اور خرابیوں کی زیادہ متحمل نہیں ہو سکتی جن کو سرکار کے عہد نامہٗ مذکور کو اختیار کرنے کے وجہ سے مضبوطی حاصل ہوتی ہے اور سرکار اس قدر خبر گیری والیان ملک اودھ کی، جس کے باعث وہ اقتدار جس سے یہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں بحال و برقرار نہ رہے، رکھ سکتی ہے ۔ پچاس برس کے تجربے سے بخوبی ثابت ہوا کہ عہد نامہ ۱۸۰۱ء سے رعایا نے اودھ کے لیے کوئی رفاہ و خیروت پیدا نہ ہوئی۔ اور یہ بھی واضح ہوا کہ رعایائے ملک اودھ کی حفاظت اس تعدی عظیم سے جو کہ مدت سے لاحق ہے کسی صورت سے ممکن الوقوع نہیں ہے، بجز اس کے کہ ملک اودھ کا تمام انتظام ہمیشہ کے لیے سرکار کمپنی انگریز بہادر کے سپرد ہو ۔

" اس غرض سے حسب الحکم خاص استرضائے آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرز کے یہ بات ٹھہری کہ عہد نامہ ۱۸۰۱ء جس سے ہر ایک والیٔ اودھ نے انحراف و تجاوز کیا ہے، آج کی تاریخ سے بتمامہ ناجائز و ساقط ہے۔ چناں چہ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کو ایک نئے عہدنامے کے مقرر کرنے کے لیے نصیحت کی گئی جس کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے ملک اودھ کا انتظام بلا اشتراک غیر سرکار انگریز بہادر کے سپرد کیا جائے اور ضروری مراتب شاہ اور ان کے اقربا کی منزلت و دولت اور توقیر کے بحال و برقرار رکھنے کے لیے ظہور میں آئیں مگر شاہ موصوف نے ایسے دوستانہ عہدنامے کے انعقاد سے انکار کیا۔ شاہ اودھ واجدعلی شاہ جملہ والیان سابق ملک اودھ کی نسبت عہد نامہ ۱۸۰۱ء کی تعمیل میں منکر یا سہل انکار یا غافل ہوئے جس کی وجہ سے اصرار ایسے بندوبست کا ملک اودھ میں جو رعایا کی رفاہ اور خیریت کا موجب ہو، لازم کیا گیا۔ اور عہد نامہ ۱۸۰۱ء کو جس سے یوں ہی انحراف ہوا ناجائز و ساقط گردانا گیا اور چوں کہ شاہ موصوف عہدنامہ جدید کے انعقاد سے جو عہد نامہ سابق کی جگہ منظور تھا، انکار کرگئے اور عہد نامہ سابق کی شرائط جب کہ بحال تھیں، بسبب عدم مخالفت اہالیان کمپنی انگریز بہادر کے ملک اودھ میں نافع نہ ہوئیں اور بدون ایسی مداخلت کے شایستہ بندوبست کا جاری ہونا اس ملک میں ممکن نہیں، ان وجوہات سے تمام عالم کو ظاہر ہے کہ سرکار کمپنی انگریز بہادر کو دو صورتوں کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، یا تو ملک اودھ کی رعایا کو ترک کرے اور ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کے معرض ظلم و تعدی میں ڈال دے یا سرکار اپنے اقتدار عظیم کو ان لوگوں کے حق میں نفاذ کرے جن کی رفاہیت کے واسطے پچاس برس کے عرصے سے دست اندازی کا وعدہ کیا تھا، اور اودھ کے بندوبست کا تمام و کمال نظم و نسق ہمیشہ کے واسطے اپنے اختیار میں کر لے۔ ان دونوں صورتوں میں سے سرکار کمپنی انگریز بہادر نے بلا تامل دوسری صورت کو اختیار کیا ہے۔ اس لیے اشتہار دیا جاتا ہے کہ آج کے دن سے ملک اودھ کا نظم و نسق بلا شرکت غیر ہمیشہ کے لیے کمپنی انگریز بہادر کے قبضۂ اختیار میں آ گیا ہے۔ سب عامل و ناظم و چکلہ‌دار و جملہ نوکران دربار اور سب اہل کاران مالی و ملکی دیوانی و فوجی و سب سپاہیان دربار اور جملہ ساکنان اودھ کو لازم ہے کہ آیندہ کمپنی انگریز بہادر کے اہل کاران کی اطاعت اور فرماں برداری کلی کرتے رہیں۔ اگر کوئی اہل کار دربار یا جاگیردار یا زمین‌دار یا کوئی دوسرا شخص ایسی اطاعت و فرماں برداری سے اغماض کرے گا یا کوئی

مال گزاری دینے میں عذر کرے گا یا اور کسی طرح سرکار کمپنی انگریز بہادر کی حکومت میں تعرض و مزاحمت پہنچائے گا تو شخص مذکورہ مفسد گنا جائے گا ۔ اور قید بھی کیا جائے گا اور جاگیر یا اراضی اس کی ضبط سرکار کی جائے گی۔ اور وہ لوگ جو فوراً بلا عذر سرکار کمپنی انگریز بہادر کی تابعداری قبول کریں گے، عامل ہوں یا اہالیان دربار یا جاگیردار زمیندار یا سکنائے اودھ ، سب سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ وہ حفاظت و لحاظ و التفات اہالیان کمپنی انگریز بہادر کا پائیں گے یا پاتے رہیں گے۔ تعداد مال گزاری کا تعین انصاف اور بندوبست واجبی کے ساتھ عمل میں آئے گا اور ملک اودھ کی آبادی و آراستگی کے باب میں بتدریج کوشش برابر ہوتی رہے گی ۔ ہر کسی کی بلا طرف داری کسی کے عدل گستری ہوتی رہے گی ۔ جان و مال کی حفاظت کی جائے گی اور ہر ایک شخص اپنے حقوق واجبی پر بے اندیشہ اور بغیر کسی کی دست اندازی کے قابض و متصرف رہے گا ۔

محررہ شب یازدہم جمادی الثانی ۱۲۷۲ھ

قیصر التواریخ ص ۱۲۷

اقبال کا تصور زمان و خودی

سید محمد تقی *

اردو ادب کی تاریخ نے عالمی ادب کی سطح کے چار بڑے شاعر پیدا کئے ہیں - میر تقی میر، غالب، میر انیس اور اقبال - ان چار شعرا میں تین ایسے ہیں جو حیات و کائنات کے متعلق فلسفیانہ اور فکری رد عمل دیتے ہیں - میر، غالب اور اقبال —— میر اور غالب کا اختصاص یہ ہے کہ ان کا رد عمل مذہبی جذبات سے متاثر نہیں ہوتا اور اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے تاثر کا دائرہ بڑا ہے، جب کہ اقبال، فکر کے ساتھ مذہبی تجربات بھی شامل کرتے ہیں - لیکن اقبال کا اختصاص صرف یہی نہیں ہے - اقبال کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کی فکر ایک نظام بھی رکھتی ہے - یہ خصوصیت انہیں میر و غالب بلکہ اردو کے تمام شاعروں سے ممتاز کرتی ہے- اقبال صرف شعر کی زبان میں گویا نہیں ہوتے، وہ طاقت ور نثر لکھ کر بھی اپنے ذہن کی گتھیاں سلجھاتے ہیں - اقبال کے سامنے بھی وہی مسئلہ ہے جو نئے عہد کے دوسرے مسلم مفکروں کے سامنے رہا ہے- یعنی مسلم معاشرے کی ضرورتوں کو جدید زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا - لیکن اقبال اس طاقت ور فکری سوال کو دوسری سطح پر اٹھاتے ہیں - سر سید اور دوسرے متکلمین کے برعکس اقبال جدید عہد کی فکر سے براہ راست دست و گریباں ہوئے ہیں - اس لیے کہ اقبال یہ باور کرتے ہیں کہ تمام تہذیبی مسئلے مآل کار فکری مسائل میں حل ہو جاتے ہیں - اس لیے بنیادی چیز فکری مباحث ہیں جن سے نمٹ کر ہی دوسرے سوالات پر کچھ سوچا جاسکتا ہے -

---

* مدیر روزنامہ ”جنگ“ کراچی -

جدید عہد حرکی مزاج لے کر پیدا ہوا ہے۔ سائنس اپنے انداز میں حرکی ہے۔ سائنس ہی نہیں، جدید فلسفہ بھی حرکیت کو بنیاد بنا کر حیات و کائنات کے مسئلے سوچتا ہے۔ ارسطو کے مقولات عشرہ میں سے جدید عہد کو اضافت اور نسبت سے دلچسپی ہے، جو فی الواقع حرکت کے رشتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اقبال کو جدید عہد کے اسی فلسفے سے دو چار ہونا تھا۔ اپنے آخری تجزیے میں زمان حرکت میں بدل جاتا ہے۔ اس لیے اقبال کی زمان کی بحث جدید فلسفے کے مخصوص کردار کی بحث ہے۔

اقبال کے شعر اور فلسفے پر گفتگو کرنے والے عام طور پر برگساں اور نطشے پر آ کر رکتے ہیں اور اقبال کے تصور کو ان دونوں کے فکری انداز سے متاثر ثابت کرنا چاہتے ہیں، لیکن میرے خیال میں سوچ کا یہ طرز صحت پر مبنی نہیں ہے۔ اقبال کے سامنے کسی سے متاثر ہونے کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ جدید فکر کے مزاج کو مسلم تہذیب کے فکری سرمائے سے ملانا تھا اور یہاں میں جس چیز پر خاص طور سے زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ زمان سے برگساں کی دلچسپی اس وسیع فلسفیانہ بہاؤ کا ایک رخ ہے جسے جدید فکر کہا جاتا ہے اور اقبال اس جدید فکر سے الجھے ہوئے ہیں۔ اس لیے اقبال کے فکری سوتوں میں صرف برگساں کا نام لے کر گزر جانا ان مسائل کے ساتھ ناانصافی ہے جنھیں اقبال نے اٹھایا ہے۔ ان کی '' ری کنسٹرکشن آف رلیجس تھاٹ ان اسلام '' اس وقت میرے سامنے نہیں ہے، لیکن جہاں تک یاد پڑتا ہے اقبال نے زمان کے سلسلے میں اس بحث کو اٹھایا ہے جو زمان کے مسلسل بہاؤ یا اس کے آنات میں منقسم ہونے سے متعلق زینو کے عہد سے اب تک جاری ہے اور انسانی ذہنوں کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ کائنات کا حرکی تصور نہ تو نیا ہے، نہ جدید عہد سے مخصوص ہے اور نہ واحد تصور کائنات ہے۔ اس کے مقابل کائنات کا سکونی تصور بھی ہے۔ اس سکونی تصور میں زمان کے لیے کوئی گنجائش نکالنا ممکن نہیں۔ ارسطو نے انھی دونوں تصوروں کو دیکھ کر ان کے درمیان کی راہ نکالی ہے۔ اس نے کائنات کو ہیولے اور صورت میں بانٹ کر ہیولے کو سکون اور صورت کو حرکت کا نمایندہ قرار دیا ہے۔ اقبال نے زمان کی اس بحث کو صرف زمان کے نظریوں کی بحث تک محدود رکھا ہے، اور اقبال پر ہی کیا موقوف ہے، زمان پر بحث کرنے والے زمان کے دائرے سے آگے نہیں بڑھتے حالانکہ زمان کی بحث فی الواقع حرکت کی بحث ہے۔ لہذا سب سے بڑا سوال جو اس کائنات سے متعلق پیدا ہوگا، یہ ہے کہ یہ کائنات حرکت کی مختلف اشکال کا نام ہے یا سکون ہی ارسطو کے ہیولے

کی شکل میں کہیں موجود رہتا ہے ۔ اس بحث کے ضمن میں اگر میں یہ قضیہ وضع کروں کہ کوئی موجود ایسا ممکن نہیں ہے جو متحرک نہ ہو، یا زیادہ صحیح تر الفاظ میں یوں کہیے کہ کوئی موجود ایسا ممکن نہیں ہے جو متغیر نہ ہو تو اسے ناقابل قبول قرار نہ دیا جائے ۔ اس لیے کہ بہ ظاہر کسی ایسے وجود کا تصور نہیں ہوسکتا جو حرکت یا تغیر سے مستثنیٰ ہو ۔ کائنات سے متعلق یہ موقف واضح طور پر قابل فہم نظر آتا ہے مگر اس میں چند بڑی سنگین قباحتیں ہیں جن میں سے بعض کا یہاں ذکر ضروری ہے ۔ پہلی بات یہ کہ ایک ایسی کائنات میں جو دائم التغیر ہو ایسے قضایا کا موجود ہونا جو دائم الثبات ہوں اور کبھی متغیر نہ ہوتے ہوں ، متضاد سی بات ہے ۔ دوسری بات یہ کہ ایک ایسی کائنات کا جو لاانتہا کے تصور سے وجود میں آئی ہو تغیر پر مشتمل ہونا بھی متضاد سا معلوم ہوتا ہے ۔ تغیر حدوث پر مشتمل ہوتا ہے اور لا انتہا قدم کے ساتھ چلتا ہے ، اس لیے متغیر کائنات کا لاانتہا ہونا ممکن نظر نہیں آتا جب کہ کائنات کا لا انتہا ہونا ایک واضح سی حقیقت ہے ۔ کانٹ نے کئی ایسے مقولے معلوم کئے ہیں جو موجود بھی ہیں مگر خلاف عقل بھی ۔ میرے خیال میں اوپر کی جو مثال میں نے پیش کی ہے وہ اسی قسم کی خلاف عقل مگر موجود حقیقتوں یعنی متضاد قسم کے مقولوں میں شامل ہے ۔ لیکن میں اقبال کے تصور زمان پر بحث کر رہا تھا ۔ زمان کی اس بحث میں جو بات قابل توجہ ہے اور جس پر میں خاص طور سے زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ حقیقت ہے کہ یہ کائنات مآل کار حرکت سے عبارت ہے اور زمان بھی حرکت سے تعلق رکھتا ہے ۔ اسی لیے شیخ بو علی سینا نے کہا تھا کہ " الزمان هو مقدار الحرکته " زمان حرکت کی مقدار کا نام ہے ۔ لیکن جب ساری کائنات حرکت سے عبارت ہے تو انسان بھی حرکت ہی کے دائرے میں رہتا ہے ، گویا انسان کی انا بھی ایک متغیر و متحرک انا ہے ۔ یاد رہے یہ وہی انا ہے جس کے لیے اقبال نے 'خودی' کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ یہ انا یا خودی واضح طور پر متناہی ہے ۔ اقبال نے انا کی متناہی نوعیت تسلیم کی ہے لیکن وہ اس انا یا خودی کو پلوٹینسس اور اس کے مقلد نوفلاطونیوں کی انائے کل کا جزو ثابت نہیں کرتے ۔ اقبال کے سامنے دشواری یہ ہے کہ بریڈلے اور جدید نفسیات کے مکاتیب نے شعور ، انا، یا خودی کا صاف انکار کردیا ہے ۔ میں نے اس سوال پر اپنی کتاب " روح اور فلسفہ " میں تفصیلی بحث کی ہے، جس کے اعادے کا یہاں کوئی ارادہ نہیں لیکن یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ

انا یا خودی بعض دائمی قضایا کا ادراک کرتی ہے۔ یہ دائمی قضایا بہرحال دائمی ہیں۔ گویا مدرک ہے، یعنی وہ چیز جس کا ادراک کیا جا رہا ہے، دائمی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ مدرک کو ہم دائمی سمجھیں یا نہیں؟ میرے خیال میں اقبال اپنی خودی کی بحث اگر اس انداز پر آگے بڑھاتے تو وہ اب سے زیادہ مضبوط موقف پر کھڑے ہوتے، اس لیے کہ اتنی بات تو صاف ہے کہ فرد دائمی قضایا کو پانچ سال کے فرق سے جانچے یا دس سال کے فرق سے، وہ دائمی قضایا کا دوام تسلیم کرے گا، جب کہ فرد ہر لمحہ تغیر کی زد میں ہے۔ پھر تاریخ میں بھی دائمی قضایا کا دوام تسلیم کیا جاتا رہا ہے، جب کہ تاریخ تغیر مسلسل سے عبارت ہے۔ جس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ مدرک یعنی دائمی قضایا ہی تغیر کی زد سے باہر نہیں ہیں بلکہ انا یا خودی بھی تغیر کی زد سے باہر ہے۔ اقبال نے گو صاف الفاظ میں اس کا ذکر نہیں کیا لیکن ایک عظیم مفکر کی حیثیت سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ انا یا خودی متناہی ہونے کی حیثیت میں دوام کی مدعی نہیں ہوسکتی لیکن اس مرحلے پر اقبال کے لیے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ انا کو منتہی مان کر حیات بعدالممات کا انکار کر دیتے اور دوسری یہ کہ وہ انا کو لاانتہا سے وابستہ کر کے اس کے دوام کے قائل ہو جاتے لیکن اس آخرالذکر صورت میں وحدت الوجود کی پناہ لینی پڑتی، یعنی انا کو انائے کل کا جزو ماننا پڑتا جو وحدت الوجود تک پہنچ کر ختم ہوتی۔ اس لیے کہ انائے کل غیر منتہی ہوگی تو دائمی بھی ہوگی اور اس طرح ہم آسانی سے وحدت الوجود تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اقبال نہ پہلے نتیجے پر پہنچنے کے لیے تیار ہیں نہ دوسرے پر، اس لیے وہ سنگین تضاد کا شکار ہوگئے ہیں، جس سے ان کا پورا فلسفۂ خودی خطرے میں پڑ گیا ہے۔

یہ پہلو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ دوام اور لاانتہا اپنے آخری تجزیے میں ایک ہی چیز ہیں۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ اگر خودی منتہی ہے تو وہ دائمی نہیں ہوسکتی اور دائمی ہے تو غیر منتہی بھی ہوگی۔ اب دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی ایک صورت اختیار کرنے سے اقبال کا فلسفۂ خودی ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ پہلی صورت یعنی انا کا منتہی فرض کرنا اقبال کو اس لیے قابل قبول نہ ہوگا کہ منتہی انا دائمی نہ ہوگی یعنی حادث ہوگی۔ اور حادث ہوگی تو پھر حیات بعد الممات کا نظریہ ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن اقبال اس موقف میں آنے کے لیے بھی تیار نہیں،

ہیں لہذا پھر دوسری ہی صورت انہیں اختیار کرنی پڑے گی یعنی وہ انا کو دائمی مان لیں - لیکن دائمی انا غیر منتہی بھی ہو گی اور غیر منتہی ہونے کے معنی ہیں ہر سمت میں غیر منتہی ہونے کے ، اور ہمہ جہتی غیر منتہیت اور وحدت الوجود ایک ہی چیز ہیں - اس کے معنی یہ ہوئے کہ انہیں دائمی ماننے کی صورت میں وحدت الوجود کا نظریہ ماننا پڑے گا - مگر اقبال اس کے لیے بھی تیار نہیں ہیں - اس لیے وہ ایک ایسے تضاد کا شکار ہوگئے ہیں جو کسی صورت میں بھی حل کیا جائے تو فلسفہ' خودی سے ہاتھ دھونا پڑے گا -

میرا خیال یہ ہے کہ اقبال حرکت و انا کی اس بحث میں برگساں کے بجائے مسلم متکلمین سے زیادہ متاثر ہیں - مسلمان متکلمین کو اس کائنات میں ایک ایسے خالق کے لیے جگہ نکالنی تھی جو اس کائنات کا صرف خالق ہی نہ ہو ، خالق مسلسل بھی ہو - خالق یا محرک اول کا وجود تو ارسطو ، فارابی اور ابن سینا وغیرہ نے بھی تسلیم کرلیا تھا ، مگر ارسطو و فارابی و سینا کا خدا ایک ایسا گوشہ نشین راہب ہے جو اپنے حجلہ' اعتکاف سے ایک بار باہر آ کر کائنات کو خلق تو کر دیتا ہے مگر اس کے بعد دوام کی خانقاہ میں چلا جاتا ہے اور واپس نہیں آتا اور ادراک ذات میں غرق ہو کر رہ جاتا ہے - متکلمین ایسے خدا سے مطمئن ہونے کے لیے تیار نہیں تھے - انہیں ایک ایسے خدا کی ضرورت تھی جو اس بدلتی ہوئی کائنات کی ہر لمحہ تخلیق کرتا رہتا ہو - ارسطو کا خدا جزئیات کا علم بھی نہیں رکھتا تھا ، اور متکلمین کو عالم و دانائے کل خدا کی ضرورت تھی - یہ ضرورت بھی خلق مسلسل کرنے والے خدا کے نظریے سے پوری ہوسکتی تھی - چنانچہ متکلمین نے ایک ایسے تصور کائنات کی تبلیغ کی جو خیر سے جدید سائنس کے تصور کائنات سے بہت زیادہ ہم آہنگ ہے - متکلمین کی کائنات ہر لمحے پیدا ہوتی رہتی ہے اور ہر لمحہ تغیر کا یہ عمل خالق کائنات بذات خود انجام دیتا ہے - اس کائنات میں علت و معلول کے سلسلے کا ماننا بھی ضروری نہیں اس لیے کہ علت العلل یعنی خدا بہ نفس نفیس خود ہر تخلیق کا عمل کر رہا ہے - ارسطو ، فارابی اور ابن سینا وغیرہ نے کائنات کو ہیولے اور صورتوں پر مشتمل مانا تھا - ان کے خیال میں ہیولا دائم الوجود اور صورتیں تغیر پزیر اور فانی ہیں - اس طرح یہ کائنات قدیم فرض کی گئی تھی - متکلمین کو خدا کے علاوہ کسی اور کا قدم ایک آنکھ نہ بھاتا تھا ، اس لیے انہوں نے ہیولے کا وجود تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ساری کائنات کو اعراض کا مجموعہ بنا دیا - جدید سائنس بھی کچھ اسی قسم

کے تصور کائنات کی حامی ہے ،چناں چہ مادہ اولیٰ کی وہ تلاش جو قدیم فلسفیوں کو رہی تھی ، جدید سائنس کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتی ۔

جہاں تک زمان کا تعلق ہے متکلمین نہ ماضی کا وجود مانتے ہیں نہ مستقبل کا ۔ وہ صرف حال اور ان لمحات کے قائل ہیں جو حال میں تہ بہ تہ وجود میں آتے اور مرتے رہتے ہیں ۔ اقبال نے یہ تصور پوری طرح لے لیا ہے ۔ اس لیے وہ اشعری متکلمین کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں ۔ کائنات کے اس تصور سے اشعری متکلمین نے بڑا فائدہ اٹھایا ۔ علل اور معلولات کا سلسلہ ختم کرکے انھوں نے خرق عادت معجزات اور تمام خلاف عقل باتوں کے لیے بہت سی گنجائشیں نکال لیں ۔ اقبال نے اشاعرہ کی کھل کر حمایت تو کی ہے مگر اشعریوں نے اپنے تصور کائنات کے ذریعے توہمات کے لیے جو دروازہ کھولا ہے ، اقبال نے اپنے خطبات میں ان کا ذکر کرنے کی کوشش نہیں کی ۔

گزشتہ کوئی سوا سو سال میں مسلم برصغیر نے چار صف اول کے متکلمین پیدا کئے ہیں ۔ سرسید ، سید امیر علی ، شبلی اور اقبال ۔ ان میں سے پہلے تین کھل کر معتزلہ نقطۂ نظر کے حامی ہیں اور اشعریوں کے عقل دشمن نظریوں پر واضح اور بے رحمانہ تنقید کرتے ہیں ۔ مگر اقبال نے یہ عجیب جسارت کی کہ انھوں نے یہ رجحان یکسر الٹ کر رکھ دیا اور معتزلہ کے بجائے اشاعرہ کی تائید میں مقدمہ لڑنے لگے ۔ بلکہ شبلی نے تو سرسید اور امیر علی سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ دلچسپ انکشاف کیا اور اس پر بڑی مضبوط دلیلیں بھی قائم کیں کہ امام غزالی اور امام رازی جیسے جانے بوجھے اشعری مفکرین بھی فی الواقع تقیہ میں تھے ۔ وہ عوام سے ڈر کر اشاعرہ کی حمایت کرتے تھے مگر دل سے ان کے مخالف تھے ۔ چناں چہ دونوں بار بار یہ تلقین کرتے ہیں کہ حقائق عوام کو نہ بتائے جائیں اس لیے کہ عوام انھیں سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے ۔ ان دونوں نے عوام کے لیے جو کتابیں لکھیں وہ خواص کے لیے لکھی جانے والی کتابوں سے مختلف لکھیں جنھیں عوامی انداز رکھنے والوں تک پہنچانے کی ممانعت کردی گئی ۔ اسی لیے رازی بھی عقیدہ پرستوں کی مخالفت کا نشانہ بن کر شہر بدر ہوئے اور غزالی کو بھی قاضی عیاض وغیرہ جیسے حضرات نے کفر کے فتووں کا نشانہ بنایا ۔

اس سطح سے جائزہ لیا جائے تو شبلی ، اقبال سے کہیں زیادہ عقل دوست ، ترقی پسند اور حقیقت کیش نظر آتے ہیں ۔ جب کہ اقبال کا نقطۂ نظر توہم پسندی اور رجعت نوازی کے لیے دروازے کھول دیتا ہے ۔

زمان کے سلسلے میں اقبال آنات کے تسلسل کے قائل ہیں لیکن آنات کے مجموعے کے قائل نہیں ہیں ، اور ان دونوں صورتوں میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے ۔ اقبال کی ایک آن —Now— پیدا ہوکر عدم میں ڈوب جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری آن لے لیتی ہے ۔ یہ توہے آنات کا تسلسل ۔ جب کہ اس کے برعکس آنات کا مجموعہ ایک وجودی سلسلہ ہے ۔ کوئی آن عدم میں ڈوبتی نہیں اور یوں ماضی اور مستقبل دونوں زندہ حقیقتوں کے طور پر موجود رہتے ہیں ۔ اس تصور میں تاریخ ایک متحرک حقیقت کے طور پر موجود رہتی ہے ۔ مگر اقبال کے مسلسل آنات کے تصور میں تاریخ ایک زندہ حقیقت کے طور پر باقی نہیں رہتی ۔ عدم سے پیدا ہونے والی آن کا عدم میں ڈوب جانا ، اور یوں ہی آنات کے تسلسل کا باقی رہنا متکلمین کو بہت بھایا تھا ۔ اس لیے کہ عدم سے خلق مسلسل کے لیے ، خالق مسلسل یعنی مصروف ترین خالق کی ضرورت ہے ۔ جسے ثابت کرنے کے لیے متکلمین ہر بڑے سے بڑا فکری اصول قربان کرنے کے لیے تیار تھے ۔ لیکن متکلمین ، اقبال اور جدید سائنس کے اس نظریے میں ایک سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں عدم محض سے خلق کا امکان تسلیم کیا گیا ہے جو محض ناقابل تصور ہے ۔ جب کہ ارسطو ، فارابی اور بو علی سینا کے نظریے میں صورتوں کا خلق ایک مادے یا ہیولے کی اساس پر ہوتا ہے جسے قدیم مان لیا گیا تھا ۔ ہیولے میں تغیر ، صورتیں پیدا کرتا ہے لیکن یہ ہیولا اپنی جگہ موجود رہتا ہے اور اس لیے عدم سے خلق کے نظریے میں جو دشواری پائی جاتی ہے ، ہیولے اور صورت کے اس نظریے کے ذریعے اس سے بچنا ممکن ہے ۔

ہیولے کو مادہ اولیٰ یا اصل کائنات قرار دیا گیا تھا ۔ اس ہیولے کا وجودی تعین صورت سے ہوتا ہے ۔ جدید فلسفے نے ہیولے اور صورت کا یہ نظریہ غیر اہم خیال کرکے یکسر نظر انداز کردیا ہے ۔ حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ کائنات کی تعبیر کے سلسلے میں ارسطو کے اس نظریے سے کافی مدد مل سکتی ہے ۔ اتفاق سے جدید سائنس نے بھی اس کی تائید میں قدرے مضبوط بنیاد مہیا کردی ہے ۔ جدید طبیعیات نے مادے اور توانائی میں جو مساوات قائم کی ہے اس کے بعد ہر مادی بحث توانائی کی بحث بن گئی ہے ۔ اس لیے تمام وہ اطلاقات جو توانائی پر ہوں گے منطقی طور پر مادے پر بھی صادق آئیں گے ۔

اس واضح تر قضیے کے بعد سوچ کا ایک بالکل نیا راستہ سامنے آتا ہے ۔ صورت حال یہ ہے کہ توانائی برابر ناقابل استعمال حالت میں منتقل ہورہی ہے ،

مطلب یہ کہ توانائی استعمال کے بعد ایک ایسی حالت اختیار کر لیتی ہے جو ناقابل استعمال ہو جاتی ہے۔ سائنس کی اس دریافت سے جو قضیہ ثابت ہوا وہ یہ ہے کہ انرجی ناقابل استعمال یعنی غیر متحرک حالت میں بھی انرجی رہتی ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ قابل استعمال یعنی متحرک ہونا توانائی کی بنیادی شرطوں میں شامل نہیں ہے ۔ یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ مادہ غیر متحرک حالت میں بھی موجود ہو سکتا ہے ۔ اب اگر یہ غیر متحرک مادہ ، ہیولے سے تعبیر کیا جائے تو کوئی منطقی اشکال پیش نہیں آتا ۔ یہ صحیح ہے کہ ہیولے اور صورت کی تشریح کے لیے قدیم مشائین نے جو انداز بیان اختیار کیا تھا وہ سائنسی انداز بیان سے کافی مختلف تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ مشائی ہیولے کا وجود ، صورت بغیر تسلیم نہیں کرتے تھے۔ لیکن غیر متحرک مادے یا توانائی کو ہیولا مان کر اسے کسی بھی شکل سے مبرا سمجھنا ہوگا ۔ گویا اسے وجود کے دائرے سے باہر ماننا پڑے گا ۔ اس لیے کہ یاد رہے کہ ہر وجود متحرک ہوتا ہے ۔ اور یہ غیر متحرک مادے یا توانائی کا ذکر ہے ۔ پھر یہ بات بالکل صاف ہے کہ کوئی موجود کسی بھی شکل یا صورت بغیر وجود کا جامہ نہیں پہن سکتا ، لہذا ہمیں باور کرنا چاہیے کہ مادہ اور توانائی اپنی غیر متحرک شکل میں ہیولا ہے اور اپنی غیر متحرک شکل میں ہیولا اور صورت دونوں ۔ گویا انرجی اپنی ناقابل استعمال شکل میں ہیولا ہے اور قابل استعمال شکل میں ہیولا اور صورت دونوں ۔ بہ الفاظ دگر موجود ۔ یہاں یہ بات پیش نظر رکھنے کی ہے کہ مادے کے توانائی میں بدل جانے کے بعد پھر کوئی ایسی منزل نہیں رہتی جس میں مادے کی مزید تحلیل کی جا سکے ۔ مادہ اپنی آخری بسیط شکل میں صرف توانائی ہی بن سکتا ہے ۔ توانائی کے بعد کوئی ایسی بساطت باقی نہیں رہتی جس میں مادے کی مزید تحلیل ممکن ہو ، اس لیے کہ مادیت کے اختتام کے بعد جو سطح آتی ہے وہ اگر قوت نہ ہوگی تو پھر عدم ہی ہوگا جس میں اس کی تحلیل کرنی پڑے گی ۔ اس سلسلے میں متکلمین نے بھی بعض اہم بحثیں چھیڑی ہیں جن کا یہاں اعادہ ممکن نہیں ۔ لیکن ان بحثوں کے پیش نظر ہونے کی صورت میں اقبال سے یہ شکایت ضرور کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے ، عرض اور جوہر کے سلسلے میں حکمائے اسلام اور متکلمین کے درمیان جو فکر خیز بحثیں چھڑی تھیں ، ان کا ذکر کیوں نہیں کیا جب کہ توقع یہی ہے کہ وہ ان تمام بحثوں سے ضرور با خبر ہوں گے ۔ اس کے برعکس اگر انھوں نے ان

مباحث پر توجہ نہ کی تھی تو یہ بات یقیناً کافی حیرت انگیز قرار دی جائے گی ۔

انا اور خودی کے بارے میں اقبال نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ اور بھی زیادہ حیرت انگیز ہے ۔ توقع یہ تھی کہ اقبال انا پر بحث کرتے ہوئے مآل کار وحدت الوجود تک پہنچیں گے مگر وحدت الوجود کے نظریے کی حمایت صوفیانے کی تھی جو اقبال کے خیال میں قبر پرستی کے مبلغ ہونے کی بنا پر مسلمانوں کے زوال کے ذمہ دار تھے، اس لیے انھوں نے وحدت الوجود کی کھل کر اور جم کر مخالفت کی اور اس پہلو پر توجہ نہ کی کہ ان کا نظریہ سنگین تضاد کا شکار ہو گیا ہے ۔ انفرادی انا اگر ایک ایسی ہستی ہے جو حقیقت کلیہ یا باری تعالیٰ سے بالکل جدا گانہ تعین رکھتی ہے تو اس سے خود باری تعالیٰ کی تحدید لازم آتی ہے اس لیے کہ باری تعالیٰ کی اپنی اصطلاح کے تصور میں ہمہ جہتی لا انتہا شامل ہے اور ہمہ جہتی لا انتہا کے تصور کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی وجود اس کے دائرے سے باہر نہ رہے، ورنہ ہمہ جہتی لا انتہا بعض سمتوں میں لا انتہا نہیں رہے گا ، گویا اس کی تحدید ہو جائے گی ۔ دوسرے الفاظ میں انفرادی انا کے جداگانہ تعین سے خود باری تعالیٰ کی تحدید لازم آتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ پلوٹینس اور مسلم متصوفین وحدت الوجود کے نظریے پر زور دیتے تھے جس کے بغیر باری تعالیٰ کی ہمہ جہتی لا انتہائیت ثابت کرنی بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے ۔ تعجب ہے کہ اقبال جیسے انتہائی دقیق اور فکر خیز مفکر کی توجہ اس طرف کیوں نہ گئی اور انا کا تصور بہت اختراعی انداز میں منضبط کرتے وقت انھوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ وحدت الوجود تک ان کا پہنچنا یقینی ہے اور جس نظریے پر وہ زور دے رہے ہیں اس کا منطقی مطالبہ یہ ہے کہ وحدت الوجود کے تصور کی بھی حمایت کی جائے ۔

مابعد الطبیعیات کی بحثوں میں عملی ضرورتوں کا لحاظ رکھنے کی وجہ سے جو مشکلیں اور منطقی تضاد پیدا ہو جاتے ہیں ، مذکورہ صورت حال اس کی ایک دلچسپ مثال ہے ۔ اس بحث میں مصلح اقبال، فلسفی اقبال پر غالب آ گیا اور نتیجہ ایک ایسے سنگین تضاد کی صورت میں برآمد ہوا جس کی کوئی اور مثال اقبال کے تمام خطبات بلکہ ان کی تمام فکر میں نظر نہیں آتی ۔

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

کے

نئے ایڈیشن

کی چند

خصوصیات

- یہ لغت اہل علم کی ایک جماعت کے تعاون سے تیار ہوئی۔ اس لیے اس کی جامعیت، افادیت اور صحت مطالعہ کو درجۂ استناد حاصل ہے۔
- اس میں انگریزی زبان کے تمام مروجہ الفاظ کے معانی دیئے گئے ہیں۔
- انگریزی الفاظ کے صرف اردو مترادفات درج کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ضروری جگہوں پر الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔
- اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ انگریزی کے محاورے یا روز مرہ لیے اردو محاورہ یا روز مرہ، انگریزی مثل کے لیے اردو مثل اس طرح درج کی جائے کہ انگریزی کا صحیح مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے۔
- انگریزی الفاظ کے معانی کے نازک فرق بھی اردو مترادف الفاظ سے ظاہر کئے گئے ہیں۔ جن الفاظ کے مختلف اور متعدد معنی ہیں وہاں معانی کا نمبر شمار دیا گیا ہے تاکہ معانی کا امتیاز صاف طور پر نظر آسکے۔ ہر معنی کا فرق مثالیں دے کر واضح کیا گیا ہے۔
- باطنی حسن کے ساتھ صوری اعتبار سے بھی خاص ایڈیشن اپنی مثال آپ ہے۔ اسے اعلیٰ درجے کے بائیبل پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ یہ کاغذ خاص طور پر اس ایڈیشن کے لئے درآمد کیا گیا ہے۔

یہ ایڈیشن

محدود تعداد میں شائع کیا گیا ہے اس لیے اپنا نسخہ جلد از جلد حاصل کر لیں

ایک ساتھ دو نسخے منگوانے پر محصول ڈاک معاف

قطعۂ منتخب

مصنف :

عبد الغفور خاں نساخ

مرتب :

ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر

(دوسری اور آخری قسط)

بھی کل بیٹھے بیٹھے آئی میرے دل میں اے رقت
کہ مل آؤں نہیں مجھ سے گیا ہے آہ مل کر دل

(ص ۹۴، یہ قطعہ ۴ شعر کا ہے)

رند ، کھیم نراین کھتری

رند تخلص، لالہ کھیم نراین کھتری دہلوی(۱) نبیرۂ راجہ لچھمی نراین۔ مہاراجہ ٹکیت رائے کے رفیق تھے ، طب میں اچھا دخل رکھتے تھے ، بیشتر فارسی کہتے تھے ، کلکتہ میں بھی آئے تھے ، آخر ایام میں ہوگلی میں سکونت کی تھی :

نالہ طنبور و چنگ اے اھل غفلت تم سنو
گوش زد ہوتی رہے ہر دم نصیحت ساز سے
ہے سزا اس کی کہ روز و شب وہ پائے گوشمال
راز دل بے پردہ جو کہدے بلند آواز سے (ص ۸۸)

رند ، سید محمد خاں

رند تخلص ، سید محمد خاں(۲) ولد نواب سراج الدولہ غیاث الدین محمد خان نیشاپوری (۳)، باشندۂ فیض آباد، مقیم لکھنو، شاگرد خواجہ حیدر علی آتش۔ شعر صاف و عاشقانہ خوب کہتے تھے ، کلیات ان کا نظر سے گزرا :

گور تاریک ہے اور عالم تنہائی ہے
دست و پا کانپتے ہیں پرسش اعمال ہے آج

۱۔ رند ... ابن راجہ شیو درشت ناراین ابن مہاراجہ کشن نراین ، مصنف قصہ فسانہ جان و دل عرف چہار باغ ۔ (معاصر ۱۸ / ۳۱) ۔

۲۔ ولادت ۱۱ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ بمقام فیض آباد، سفر لکھنو ، رجب ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء، سال طبع دیوان گلدستہ عشق، ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۸ء ۔

۳۔ غیاث محمد خاں بہادر نصرت جنگ، برہان الملک کے بھانجے تھے، ۱۲۲۸ھ مطابق ۱۸۱۳ء میں وفات ہوئی، مادۂ تاریخ بقول رند :
در زمیں پنہاں شدی ای آفتاب

آمد آمد ہے نکیرین کی ہوتا ہے عذاب
روح تھراتی ہے دھشت سے عجب حال ہے آج
میں تڑپتا ہوں، لرزتی ہے زمیں، کہتی ہے خلق
زلزلہ آیا زمیں ھلتی ہے بھونچال ہے آج (ص ۳۰)

(۱۴ قطعات اور ھیں)

رنگین ، سعادت یار خاں

رنگین تخلص ، سعادت یار خاں مرحوم دھلوی(۱) ولد محکم الدولہ طہماسپ بیگ خاں تورانی(۲) شاگرد شاہ حاتم مرحوم ، فنون سپاہ گری کو اچھی طرح جانتے تھے ، بہت سے شہروں کی سیر کی تھی ، کلکتہ میں بھی آئے تھے ، ریختی کے موجد تھے ، ریختہ و ھزل بھی خوب کہتے تھے ، ماہ جمادالثانی ۱۲۵۱ ھجری (مطابق ۱۸۳۵ء) میں اسی (۸۰) برس کی عمر میں انتقال کیا۔ دیوان ریختہ و ریختی و ھزل و فرسنامہ و حکایت رنگیں ، و مجالس رنگیں اور کئی مثنویاں ان سے یادگار ھیں۔ صاحب گلستان سخن نے جو انشاء اللہ خاں کو ریختی کا موجد قیاس کیا ہے ، خطا کی ہے کیونکہ خود انشاء اللہ خاں نے نسخہ دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس زبان کو سعادت یار خاں رنگین سے اخذ کیا ہے ۔ دیوان اور فرسنامہ اور مجالس رنگیں اور مثنوی ان کی نظر سے گزری :

ریختی :

شب کو لپٹی جو میں زناخی سے
منہ پہ آنچل کی اس سے کر کر اوٹ
چیں بہ ابرو ھو یوں کہا رنگیں
ہے چمٹنا ترا مرے سر چوٹ (ص ۳۴)

ولہ قطعے :

کیا بری طرح سے ملتا ہے تو اے رنگیں جان
ھر ملاقات میں کہہ تجھ سے کہاں تک میں لڑوں

۱۔ ولادت ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۶ء بمقام سر ھند ، سفر لکھنؤ ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء ، سفر باندہ ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء میں ، دیوان ریختہ ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں ، جنگنامہ ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں مرتب ھوا۔

۲۔ محکم الدولہ ، اعتضاد جنگ بہادر خطاب ، ولادت ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۷۳۲ء (سعادت یار خاں رنگیں ، ص ۳۴)۔

رحم آتا نہیں کچھ تجھ کو بدن چھلتا ہے
سخت مت ہاتھ لگا مجھ کو ترے پاؤں پڑوں (صفحہ ۵۹)

[۵۱ قطعات اور ہیں]

زیرک ، قلندر بخش

زیرک تخلص ، مولوی حافظ قلندر بخش (۱) باشندۂ پانی پت ، شاگرد منشی کرامت علی مرحوم شہیدی : (ص ۴۳)

ہے اس کی بینی کے پہلو میں یہ جو نقطۂ خال
یہ ہے اشارہ کہ قتال عاشقاں ہیں دس
ادا و ناز و کرشمہ ، جفا و غمزہ و آن
نگاہ و چشمک و عشوہ، سخن عیاں ہیں دس

[ردیف ی کا ایک قطعہ اور ہے]

سلیس ، سید محب علی

سلیس تخلص ، سید محب علی کانپوری ، شاگرد مونس مرثیہ گو (۲): (ص ۱۴)

باہیں گلے میں ڈال کے اس شوخ نے کہا
میں کامیاب وصل جو یکبار ہو گیا
مدت سے خفتہ بختی کا شکوہ تھا آپ کو
کہیے نصیب آج تو بیدار ہو گیا

سلیمان ، مرزا سلیمان شکوہ

سلیمان تخلص، مرزا سلیمان شکوہ بہادر خلف الصدق حضرت شاہ عالم

۱- تحصیل علم شاہجہان آباد و لکھنؤ میں کی ، اشعار ریختہ و فارسی دونوں اس کے باغ طبع کے ثمر زودرس ہیں ، قصا ید عربی میں عالم تخلص کرتا ہے، اوایل میں اشعار اردو میں بیدم تخلص کرتا تھا اور غرور علم و فضل سے دماغ اس کا آسمان بریں سے ورے نہیں ٹھہرتا ہے (گلستان سخن، ص ۲۰۹)-

۲- مونس، میر محمد نواب ابن میر مستحسن خلیق، متوطن لکھنؤ، متوفی ۱۲۹۲ھ (تاریخ لطیف) -

بادشاہ آفتاب، شاگرد شاہ حاتم و انشا، مدت تک لکھنؤ(۱) میں جلوہ افروز تھے۔ کبھی دھلی اور کبھی اکبرآباد میں بھی رھتے تھے، شعر عاشقانہ خوب کہتے تھے۔ ۱۲۰۳ ھجری(۲) میں اکبر آباد میں رحلت کی اور وھیں مدفون ھوے۔ راقم نے ان کے مزار کی زیارت کی ھے۔ ان کے انتقال کی تاریخ ''رحمت خدا'' سے نکلتی ھے۔ دیوان ان کا نظر سے گزرا: (ص ۹۰)

ھاتھ جب چھاتی پہ اسکی میں نے رکھکر یوں کہا
بوجھ میرے ھاتھ میں یہ جنت ھے یا طاق ھے
تب کہا ھنس کر یہ اس نے راہ شوخی سے مجھے
ایک ھی اللہ اپنے کام میں تو طاق ھے

سودا، مرزا محمد رفیع

سودا تخلص، مرزا محمد رفیع ولد مرزا محمد شفیع، وطن ان کا کابل، مولد دھلی، تلمیذ شاہ حاتم، ایام شباب(۳) میں لکھنؤ میں جا کر نواب آصف الدولہ بہادر کے مقربوں میں منسلک(۴) ھوے تھے۔ ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں انتقال کیا، سواے مثنوی کے جمیع اصناف سخن پر نادر تھے لیکن قصیدہ گوئی میں اپنے عہد میں بے مثل تھے۔ کلیات (۵) ان کا نظر سے گزرا: (ص ۱۴)

سودا جو کبھی گوش سے ھمت کے سنے تو
مضمون یہی ھے جرس دل کی فغاں کا

۱- ۱۲۰۹ ھجری مطابق ۱۷۹۴ء سے قبل لکھنو گئے تھے۔ (تذکرہ ھندی، ص ۱۲۱)۔

۲- تاریخ وفات ۲۹ ذیقعدہ ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۳ء ھے۔

۳- ولادت قریب ۱۱۱۵ھ مطابق ۱۷۰۳ء، روانگی بھرت پور ۱۱۷۴ھ مطابق ۱۷٦۰ء، سفر فرخ آباد ۱۱۷٦ھ مطابق ۱۷٦۲ء، قیام فیض آباد ۱۱۸٦ھ مطابق ۱۷۷۲ء۔ ظاھر ھے کہ اس وقت سودا کا شباب نہ تھا۔

۴- ''نواب آصف الدولہ کے مقربوں میں منسلک ھوکر ملک الشعرا کا خطاب پایا تھا'' (سخن شعراء ص ۲۲۲) لیکن یہ بات اس طور پر دوسرے تذکروں میں مذکور نہیں۔

۵- کلیات پہلی بار دلی میں ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں چھپا۔

هستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

[۱۲ قطعات اور ہیں]

سوز، عبدالکریم

سوز تخلص، مولوی عبدالکریم(۱) خلف مولوی امام بخش صہبائی(۲) باشندۂ تھانیسر، مقیم دہلی۔ اشعار ان کے مزیدار ہوتے ہیں، صاحب دیوان گزرے: (ص ۹۲)

دیکھا عجب تماشا طرفہ کیا نظارا
گزرا جو صبح گاہاں میں صحن گلستاں سے

[یہ قطعہ ۱۰ شعر کا ہے]

سوز، میر محمد

سوز تخلص، محمد میر(۳) ولد میر ضیاءالدین، اولاد میں حضرت قطب عالم گجراتی کے، وطن ان کا بخارا، مولد دہلی۔ نواب آصف الدولہ بہادر کے عہد میں لکھنؤ میں سکونت کی تھی۔ خط شفیعا و نستعلیق خوب لکھتے تھے، تیراندازی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ شعر اس انداز سے پڑھتے تھے کہ مضمون شعر کی صورت بنا کے دکھلا دیتے تھے۔ پہلے میر تخلص کیا، اشعار عاشقانہ

۱۔ ولادت قریب ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء، غدر ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں گرفتار ہوکر مقتول ہوئے۔

۲۔ صہبائی، فاروقی النسب، متوطن دہلی، ولادت بقول کریم الدین ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء (طبقات، ص ۴۱۳) لیکن بقول اسپرنگر ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء (اور یہی زیادہ قرین قیاس بھی ہے) غدر ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں گرفتار ہوئے، مقتول ہوئے۔

۳۔ ولادت ۱۱۳۶ھ مطابق ۱۷۲۳ء اور ۱۱۳۹ھ مطابق ۱۷۲۶ء کے مابین (تذکرۂ ہندی، ص ۱۱۱)۔ ۱۱۸۵ھ مطابق ۱۷۷۱ء اور ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۴ء کے مابین فیض آباد، ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں مرشد آباد گئے۔ وفات ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء۔

ان کے نہایت پرسوز ہوتے ہیں۔ اسی (۸۰) برس کی عمر میں تلہر(۱) میں وفات پائی۔ دیوان ان کا نظر سے گزرا: (ص ۱۶)

کھڑا نعش پر ہو کے بولا کہ ہے ہے
یہ کشتہ تو کچھ جان پہچان نکلا
کھڑے رہنے والو مگر سوز ہے یہ
بھلا اس کے دل کا تو ارمان نکلا

[چار قطعے اور ہیں]

سوزاں، مرزا احمد علی خاں

سوزاں تخلص، مرزا احمد علی خاں شوکت جنگ(۲) ولد مرزا علی خاں، لکھنؤ کے معززوں میں تھے: (ص ۹۳)

مرے سر کی قسم اخفا نہ کرنا
ترا دل کیا کسی پر مبتلا ہے

[یہ نو شعر کا قطعہ ہے]

شاعر، میر کلو دہلوی

شاعر تخلص، ناصر پرست عرف میر کلو دہلوی(۳)، حضرت خواجہ میر درد سے نسبت تلمذ و قرابت رکھتے تھے، صاحب دیوان گزرے: (ص ۱۶)

۱- یہ بات کسی دوسرے تذکرے سے ثابت نہیں، مولانا عرشی کی تحقیق کے مطابق ان کی وفات لکھنؤ میں ہوئی۔ (دستور، ص ۱۵) عمر اسی برس سے کچھ کم پائی۔

۲- نواب احمد علی خاں خلف نواب افتخار الدولہ مرزا علی خاں مرحوم، نواب سالار جنگ بہادر کے بھتیجے، ایک مدت تک نواب وزیرالممالک کے یہاں رہے۔ (گلشن ہند، حیدری، ص ۶۶)

۳- "بعضے صاحب تذکرہ نے ان کا تخلص 'کلو' لکھا ہے" (سخن شعرا)۔ صحیح یہ ہے کہ میر کمال الدین حسین نام میر کلو عرف میر نصیر الدین رنج (متوفی قبل ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء) کے بیٹے، خواجہ میر درد کے داماد تھے۔

تو نہ تھا افسوس ظالم کیا کہیں
حال شاعر ہجر میں کیسا رہا

بیقراری، جاں کنی، بے طاقتی
غم، الم، وحشت، جنوں، سودا، رہا

شاکر، محمد شاکر

شاکر تخلص، محمد شاکر مرحوم، شاگرد محمد علی حشمت(۱)، اور کچھ حال ان کا معلوم نہ ہوا: (ص ۹۳)

کیا پوچھے ہے حال بلبلوں کا
جو ان پہ گزرلی ہے گزر لے
گلچیں تجھے کیا تری بلا سے
گل توڑ کے تو تو گود بھرلے

شاکر، عبدالسبحان

شاکر تخلص، منشی عبدالسبحان ولد قاضی اکبر علی مرحوم، باشندہ کلکتہ، شاگرد مولوی عصمت‌اللہ انسخ، صاحب طبع سلیم ہیں: (ص ۷۳)

کہنے لگا وہ شوخ یہ جھنجھلا کے ناز سے
دیکھا جو ہم کو اور کسی مہ لقا کے ساتھ
دو دن میں حال آپ کا کچھ اور ہوگیا
بس خوب ہم سے پیش تم آئے وفا کے ساتھ

۱- حشمت، شاگرد عبدالغنی قبول، متوطن دھلی، متوفی ۱۱۶۱ ھجری مطابق ۱۷۴۸ء بمقام مراد آباد (دیوان تاباں) - میر محمد خاں سرور نے ان کا نام ''شاہ شاکر علی'' لکھا ہے (تذکرہ سرور، ص ۳۷۴) اور علی ابراھیم خاں خلیل نے ان کے حال میں لکھا ہے:

محمد شاکر از دوستان .... حشمت بودہ (گلزار ابراھیم، ص ۱۶۴)

اور یہی نام صحیح ہے۔

شہیدی ، کرامت علی خاں

شہیدی تخلص(۱)، منشی کرامت علی خاں مرحوم خلف عبدالرسول خاں عروضی ، باشندہ لکھنؤ ، شاگرد مصحفی و نصیر دہلوی۔ بیشتر پنجاب و گجرات و رامپور و بریلی و بھوپال تال و دہلی (۲) میں رہتے تھے ۔ علم عروض و حساب میں امثال و اقران سے زیادہ دخل رکھتے تھے ۔ بڑے بے تکلف اور عاشق مزاج تھے ، آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ۱۲۵۵ھ (مطابق ۱۸۳۹ء) میں سفر حجاز کیا اور بعد ادائے حج بیت اللہ مدینہ منورہ روانہ ہوکر اثنائے راہ میں بیمار ہوئے اور چہارم ماہ صفر مظفر ۱۲۵۶ھ کو جس وقت مدینہ منورہ میں پہنچے۔ اسی وقت روضہ مبارک کو دیکھ کر جوش اشتیاق سے ان کی جان نکل گئی :

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بہ دعا آرزو کنند

دیوان ان کا نظر سے گزرا : (ص ۵۹ تا ۶۰)

طرفہ صحبت ہے ، ہماری شکل سے بیزار تم
اپنی یہ خواہش تمہیں ہم دم بدم دیکھا کریں
کاش بھردے کوئی وہ جادو کا کاجل آنکھ میں
جس سے تم ہمکو نہ دیکھو تمکو ہم دیکھا کریں

[دو قطعے اور ہیں]

شیفتہ ، مصطفیٰ خاں

شیفتہ تخلص(۳) مخدوم مکرم جناب نواب حاجی محمد مصطفی خاں بہادر رئیس دہلی(۴) خلف عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ ، شاگرد رشید حکیم مومن خاں ، اوصاف حمیدہ ان کے بیان ہو نہیں

۱۔ یہ پوری عبارت محض الفاظ کے فرق کے ساتھ گلزار سخن میں (ص ۲۴۴ پر) نقل کر لی گئی ہے ۔

۲۔ ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۸۳۴ء) سے پہلے دہلی گئے تھے۔ (گلشن بیخار)

۳۔ ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا ۔ (سخن شعرا ، ص ۲۶۷)

۴۔ مسکن جہانگیر آباد، ولادت ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء بمقام دہلی ۔

سکتے۔ اشعار ان کے نہایت شیریں و نمکین ہوتے ہیں۔ دھلی میں رہنے کے ہنگام میں راقم کو ان سے شرف نیاز حاصل ہوا تھا۔ "تذکرہ گلشن بیخار" (۱) و "رہ آورد حسرتی" و "دیوان اردو" ان کا نظر سے گزرا۔ فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں: (ص ۱٦)

کہا کل میں نے اے سرمایۂ ناز
تلون سے ہے تم کو مدعا کیا

[یہ نو شعر کا قطعہ ہے، اس کے علاوہ دو قطعات اور ہیں]

صابر، مرزا قادر بخش

صابر تخلص، مرزا قادر بخش (۲) خلف مرزا مکرم بخت ابن مرزا خرم(۳) بہادر نبیرۂ مرزا معز الدین جہاندار شاہ(۴) بادشاہ دھلی، شاگرد عبدالرحمان خاں احسان (۵) و مولوی امام بخش صہبائی، صاحب دیوان ہیں (٦)

۱۔ یہ تذکرہ ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء میں شروع اور ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں ختم ہوا، پہلی بار ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں مطبع لیتھوگریفک دھلی اخبار میں چھپا، اس کا ایک نسخہ کتبخانہ حلیم مسلم انٹر کالج کانپور میں ہے۔ دوسری بار اردو اخبار پریس دھلی سے ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں چھپا۔ اس میں ذوق کے حال میں مولوی محمد باقر (پدر آزاد) نے کافی اشعار کا اضافہ کیا ہے، اس ایڈیشن کے کئی نسخے ملتے ہیں، راقم سطور نے جس نسخے سے استفادہ کیا ہے وہ پروفیسر آل احمد سرور کی ملکیت ہے۔

۲۔ ولادت ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء بمقام دھلی، وفات ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۱ء بمقام بنارس۔ (خمخانہ، ص ٦ - ۲۲۵)

۳۔ اصل: "خورد"

۴۔ میرزا محمد معزالدین جہاندار شاہ ولادت رمضان ۱۰۷۲ھ مطابق ۱۶٦۱ء، جلوس محرم ۱۱۲۴ھ مطابق ۱۷۱۲ء، وفات محرم ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۳ء میں، مدفن مقبرہ ھمایوں دھلی، ابن میرزا محمد شاہ عالم بہادر شاہ بادشاہ۔

۵۔ احسان متوفی ۱۲٦۷ھ مطابق ۱۸۵۰ء

٦۔ دیوان مسمی بہ ریاض صابر۔

تذکرہ ''گلستان سخن'' ان کے نام سے مشہور ہے لیکن حقیقت میں تذکرہ مذکور مولوی امام بخش صہبائی کا لکھا ہوا ہے کہ عبارت اس کی اس بات پر گواہی دیتی ہے (۱) : (ص ۹۴)

ہم نشیں لطف شب وصل تو تھا ہی کہ مجھے
یہ گماں تھا کہ رہی کچھ نہ تمنا باقی

[یہ سات شعر کا قطعہ ہے]

صاحبقران ، سید امام علی

صاحبقران تخلص ، سید امام علی (۲) ولد میر غلام حسین بلگرامی (۳) سادات رضویہ سے تھے ، آصف الدولہ بہادر کے عہد میں لکھنو گئے تھے (۴) ۔ ہزل و فحش سے اشعار ان کے مملو ہیں ، دیوان ان کا نظر راقم سے گزرا :

پوچھا صاحبقران نے جا دی سے
.... (۵)
ہنس کے بولی کہ دیکھ لو صاحب
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے (ص ۹۴)

۱۔ اس کے متعلق مولانا امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں :

''اس قسم کی رائیں حسن ظن اور صاف دلی سے بعید اور پچھلے بزرگوں پر بغیر کسی دستاویزی شہادت کے سخت نکتہ چینی کا موجب ہیں ، اس لیے میں اس کے ماننے پر آمادہ نہیں ہوں''۔ (دیباچہ دستور الفصاحت ، ص ۱۰۳)

گلستان سخن ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں شروع ہو کر شوال ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں مکمل ہوا اور اسی سال مطبع مرتضوی دھلی سے چھپا۔

۲۔ ''معاصر جرأت و انشا'' (سخن شعرا ، ص ۲۷۳)

۳۔ محسن نے ان کو ''ملک زادہ بلگرام'' لکھا ہے۔ (سراپا ، ص ۱۱۷)

۴۔ ''شخصی حاجی زنان طوایف بود ، .... بہ عمر هفتاد سالگی ازیں جہاں در گزشت'' ۔ (ریاض الفصحا، ص ۱۷۴)

۵۔ یہ مصرع بوجہ فحش کلامی حذف کیا گیا۔

صبا

صبا تخلص (۱) میر ضیا کے ایک شاگرد کا ہے، اور کچھ حال معلوم نہ ہوا : (ص ۹۴)

تربت صبا کی دیکھی کل رات دور سے جو
آئے نظر مجھے واں شمع و چراغ کتنے
جا کر جو آج دن کو دیکھا کیا تفحص
اک دل جلے ہے اسمیں حسرت کے داغ کتنے

صبا ، میر وزیر علی

صبا تخلص ' میر وزیر علی لکھنوی (۲) ولد میر بندہ علی لکھنوی پسر خواندہ و خواہر زادہ میر اشرف علی نامی ، شاگرد آتش ، شعر صاف و عاشقانہ اچھا کہتے ہیں - ۱۲۷۱ ہجری میں (۳) انتقال کیا ، دیوان (۴) ان کا نظر سے گزرا : (ص ۱۷)

عجب طرح کے حوادث ہیں بحر ہستی میں
ہر اک کا حال یہاں مثل نقش آب رہا
کمند لے کے وہیں موج ہوگئی موجود
جہاں ذرا سر اٹھائے ہوے حباب رہا

[دو قطعے اور ہیں]

۱- صبا' میر ضیاءالدین ضیا (متوفی ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۲ء) کے شاگرد تھے جو دھلی کے رہنے والے تھے لیکن عظیم آباد میں سکونت پزیر ہوگئے تھے- میر کے تلامذہ میں تھے، صبا کا ذکر تذکرہ' سرور اور گلستان بے خزاں میں بھی ملتا ہے مگر کوئی تفصیل معلوم نہیں ہوتی -

۲- اضافہ از صفحہ ۴۷ -

۳- ''۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں گھوڑے سے گر کر انتقال کیا''- (سخن شعراء ص ۲۷۹)

۴- دیوان مسمی بہ ''غنچہ' آرزو'' ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں مطبع صدر مجلس لکھنؤ سے چھپا ' اس کے علاوہ ۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں ایک مثنوی ''حملیہ'' بھی لکھی -

صفیر، سید فرزند احمد

صفیر تخلص، سید فرزند احمد(۱) خلف سید احمد احمد تخلص، داروغۂ آبکاری ضلع مونگیر، باشندۂ بلگرام مقیم آرہ(۲)ضلع شاہ آباد، اردو میں محمد مہدی خبر بلگرامی(۳) و امان علی سحر(۴) سے اور فارسی میں مرزا نوشہ غالب سے اور مرثیے میں مرزا دبیر (۵) سے اصلاح لی ہے۔ صاحب دیوان و اردو قصہ بوستان خیال و مثنوی اعجاز کلیم(۶) ہیں۔ راقم کے احباب میں ہیں۔ شعر اچھا کہتے ہیں: (ص ۹۰)

غیروں سے بگڑ چلی ہے ان سے
اب ان کو بھی چاہ ہے ہماری
کچھ روزوں میں دیکھنا کہ ہر بات
حسب دلخواہ ہے ہماری
کہتے ہیں جسکو وصل کی شب
انشاء اللہ ہے ہماری

۱۔ صفیر مولد مارہرہ، وفات ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۸۹ء (آیات کمال)۔

۲۔ آرہ سے آرہ گزٹ ہفتہ وار مئی ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء سے جاری کیا۔ (قومی زبان کراچی، مئی ۱۹۶۷ء)۔

۳۔ خبر، سید محمد مہدی ابن سید محمد عسکری متوطن بلگرام، متوفی ۱۲۷۴ھ (مطابق ۱۸۵۰ء) بمقام بھاگلپور۔ (خمخانہ، ۳/۲۱)۔

۴۔ سحر، شیخ امان علی ابن شیخ محمد امین، شاگرد ناسخ و برق، متوطن لکھنؤ، متوفی ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۵ء، دیوان موسوم "ریاض سحر" ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں مرتب ہو کر مطبع کارنامہ لکھنو سے ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں چھپا۔

۵۔ دبیر، مرزا سلامت علی ابن مرزا غلام حسین شاگرد میر مظفر حسین ضمیر متوطن لکھنؤ، مولد دہلی، ولادت جمادی الاول ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء، وفات محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء۔

۶۔ یہاں یہ عبارت دو ایک الفاظ کے فرق کے ساتھ "گلزار سخن" میں نقل کر لی گئی ہے، مثلاً "اعجاز کلیم" کی جگہ "اعجاز حکیم" لکھا ہے۔ (ص ۲۷۱)

ضبط ، کنہیا لال

ضبط تخلص، منشی کنہیا لال(۱) سرشتہ دار کلکٹری ضلع فرخ آباد، خلف سوہن لال مراد آبادی : (ص ۱۷)

صدمے اٹھا چکا تھا بہت عشق زلف میں
سمجھے تھے ہم تو دل کو کہ ھشیار ہوگیا
رخ ہر کسی کے آج کھلے بال دیکھ کر
نادان پھر بلا میں گرفتار ہوگیا

طالب ، حافظ شبراتی

طالب تخلص، حافظ شبراتی مرحوم باشندہ، رامپور، شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق - علم عربی و فارسی میں دخل معقول رکھتے تھے، شعر بہت خوب کہتے تھے ، اعمائے مادر زاد تھے (۲) ، معما کے سمجھنے میں استاد تھے ، صاحب تذکرہ ''گلشن بیخار'' نے جو ان کا نام حافظ طالب(۳) لکھا ہے غلطی کی ہے، صاحب دیوان گزرے: (ص ۹۰)

تم کھلے بندوں چلے آئے مری محفل میں رات
میں بھی کھل کھیلا تھا بس کچھ ھاتھا پائی ہوگئی
میں ھی کچھ ملزم نہیں تقصیر یاں دونوں کی ہے
بیوقوفی تم سے ، مجھ سے بے حیائی ہوگئی

۱- قوم بھٹنا گر (آثار الشعرائے ہنود) -

۲- '' چشمش در ایام طفلی از چیچک ، رفتہ ، باوجود نابینای تحصیل علوم عربیہ نمودہ ، فاضلی است متبحر ... عمرش چہل سالہ خواھد بود '' -

(ریاض الفصحا ، ص ۹۰)

۳- صحیح نام مولوی الہداد عرف شبراتی ہے ، انکی وفات ۲۹ شوال ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۸ء کو بمقام رامپور ہوئی - (کاملان رامپور)

طپش، مرزا محمد اسماعیل

طپش تخلص مرزا محمد اسمعیل عرف مرزا جان (۱) ولد مرزا یوسف بیگ سید جلال الدین بخاری کی اولادوں میں تھے ، مولد و مسکن ان کا دھلی ، وھاں سے آکر لکھنؤ میں مرزا جہاندار شاہ بہادر(۲) کی رفاقت میں تھے اور ان کے حکم سے اپنے دیوان کو مرتب کر کے نام تاریخی اس کا ''گلزار مضامین'' (۱۱۹۹ھ) رکھا تھا ۔ بعد ازاں بنگالہ میں آکر مدت تک شہر ڈھاکہ میں نواب شمس الدولہ بہادر کی رفاقت میں رھتے تھے ۔ سنسکرت میں اچھا دخل رکھتے تھے ، کسب سخن حضرت خواجہ میر درد سے کیا تھا ۔ شعر اچھا کہتے تھے خصوصاً مقطعات ان کے لاجواب ھوتے ھیں ، کلیات ان کا نظر گزرا : (ص ۱۷)

ھو اجازت تو بزم میں تیری
آج رھنا ھو گوشہ گیروں کا
اب کہاں جائیں سر پہ آئی شام
بسترا دور ہے فقیروں کا

[اس کے علاوہ انچاس قطعات اور ھیں]

ظفر، بہادر شاہ

ظفر تخلص (جنت آرام گاہ) (۳) مرزا ابو ظفر سراج الدین محمد

۱- ''مرزا جان طپش کے ھاتھ کی لکھی ھوئی غزلوں میں تخلص ان کا طاء مہملہ سے لکھا ھوا تھا اس لیے میں نے بھی تاے فوقانی سے نہیں لکھا'' (سخن شعرا ، ص ۳۰۳) ان کا انتقال ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۴ء میں ھوا ۔ (گلشن ھند ، حیدری ، ص ۲۷ ، حاشیہ)

۲- مرزا جہاندار شاہ جوان بخت ، ولادت ۱۱۶۲ھ مطابق ۱۷۴۹ء بمقام دھلی ، ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۳ء میں لکھنؤ گئے ، ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء میں بنارس میں وفات پائی ، ان کا دیوان ڈاکٹر وحید قریشی نے مرتب کر کے لاھور سے شایع کردیا ہے ۔

۳- اضافہ از صفحہ ۶۱

بہادر شاہ بادشاہ دہلی(۱) خلف محمد اکبر شاہ گورگانی(۲) شاگرد نصیر دہلوی و محمد ابراہیم ذوق ، بعد غدر ۱۸۵۷ء کے رنگون میں تشریف رکھتے ہیں (۳) ، اکثر خطوط کو اچھی طرح سے لکھتے ہیں ، شعر نہایت شیرین و نمکین و بامزہ کہتے ہیں ، چار دیوان ان کے نظر سے گزرے - (ص ۳۲)

ہنسنا اور ہوانا ہے عالم حیرت میں کہاں
کھلے کس طرح بھلا عاشق دلگیر کی بات
دیکھا ہنستے(۴) گل قالیں کو نہ آنکھوں سے کبھی
اور نہ کانوں سے سنی بلبل تصویر کی بات

[پانچ قطعے اور ہیں]

عزیز ، بھکاری لال دہلوی

عزیز تخلص (۵) بھکاری لال دہلوی (۶) ، شاگرد حضرت خواجہ میر درد قدس سرہ : (ص ۹۸)

آرام وصل و ہجر میں ممکن نہیں ہمیں
یوں ہی ہمیشہ مضطرب اے رشک ماہ تھے

۱- ولادت ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء ، جلوس ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء ، گرفتاری ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء

۲- میرزا ابو النصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی ، بادشاہ دہلی - ولادت رمضان ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۵۹ء بمقام مکند پور ریواں ، جلوس رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء ، وفات جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء بمقام مہرولی دہلی ، شعاع تخلص کرتے تھے ، میر نظام الدین ممنون کے شاگرد تھے -

۳- نوے برس کی عمر میں ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں رنگون میں انتقال کیا - (سخن شعرا ، ص ۳۰۷)

۴- اصل : "ہستی"

۵- "۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۲ء میں الہ آباد میں تھے" (سخن شعرا ، ص ۳۲۵) -

۶- اسلاف کا وطن جونپور ، ان کا مولد دہلی ، اکثر سرکار شاہی میں ملازم رہے - (گلزار ابراہیم ، ص ۱۸۰)

اب ہجر ہے تو حسرت دیدار لے ہے جی
جب وصل تھا تو کشتہ تیغ نگاہ تھے

عشق ، حکیم عزت اللہ خاں

عشق تخلص، حکیم (میر) (۱) عزت اللہ خاں (۲) (مرحوم) (۳) دھلوی خلف حکیم میر قدرت اللہ خاں قاسم صاحب تذکرہ ، حکیم ثناء اللہ خاں فراق سے کسب سخن کرتے تھے اور اپنے والد ماجد سے بھی استفادہ کیا تھا ۔ فن طبابت میں اچھا دخل رکھتے تھے ، شعر اچھا کہتے تھے ، صاحب دیوان گزرے : (ص ۱۹)

اپنے مقتول کی تربت پہ جب اے رشک چمن
تو نے دونا کوئی پھولوں کا چڑھایا ہوگا
تا قیامت بخدا اپنے کفن کے اندر
پھر تو پھولا نہ خوشی سے وہ سمایا ہوگا

[ایک قطعہ ردیف دال میں اور ہے]

غالب، اسد اللہ خاں

غالب تخلص ، (۴) مخدوم ، اعظم نجم الدولہ، دبیر الملک ، اسد اللہ خاں بہادر ، نظام جنگ ، معروف بہ میرزا نوشہ خلف عبد اللہ بیگ خاں(۵) ، اولاد میں افراسیاب کی ہیں ، مولد ان کا اکبر آباد ، مسکن دھلی ، طبیعت ان کی نہایت دشوار پسند ہے، اشعار فارسی ان کے ظہوری ترشیزی اور میرزا عبدالقادر بیدل کے اشعار کے ہم پہلو ہوتے ہیں اور اشعار اردو رتبہ بلند رکھتے ہیں ،

۱- اضافہ از صفحہ ۷۰ -

۲- حافظ قرآن تھے اور ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء کے قریب شاھزادہ مرزا ابو ظفر ظفر کو اصلاح دیتے تھے - (مجموعہ نغز، ۱/۳۸۶)

۳- اضافہ از صفحہ ۷۰ -

۴- ولادت ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء بمقام آگرہ -

۵- عبد اللہ بیگ متوفی ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء

اوائل میں اردو غزل میں اسد تخلص کرتے تھے ، بڑا عرصہ گزرا کہ کلکتہ میں بھی آئے تھے ، راقم کو دھلی میں رھنے کے ھنگام میں ان کی خدمت میں نیاز حاصل ھوا تھا(۱) . کلیات ان کا نظر سے گزرا : (ص ۹۹)

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

[یہ قطعہ بارہ شعر کا ہے - اس کے علاوہ تین قطعے اور ھیں]

غربت ، غلام نبی

غربت تخلص، حکیم غلام نبی مرحوم باشندۂ رامپور، شاگرد حضرت شاہ رؤف احمد رافت رحمۃ اللہ علیہ (۲) ، صاحب دیوان گزرے : (ص ۷۰)

جب کہا سینہ بہ سینہ ھو جیے اس طور سے
جیسے رکھتے ھیں ملا کر آینہ پر آینہ
بولے اس نازک سی چھاتی پر یہ سینہ قہر ہے
چاھیے پتھر پہ پتھر آینہ پر آینہ

غفلت ، اخوند غفلت

غفلت تخلص، اخوند غفلت(۳) ، باشندۂ رامپور ، خواھر زادۂ کرم خاں، شاگرد حافظ شبراتی طالب (۴) ، ان کے بیشتر اشعار میں موت کا مضمون ھوتا ہے، شعر خوب کہتے تھے ، صاحب دیوان گزرے : (ص ۱۰۰)

۱- ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا - (سخن شعرا ، ۳۴۳)

۲- رافت ابن شعور احمد شاگرد جرات ، مسکن دھلی ، ولادت ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء (=رحمان بخش) ، وفات ذیقعدہ ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء در راہ کربلا (خمخانہ ، ۳/ ۳۰) شیخ احمد سرھندی کی اولاد میں تھے -

۳- احمد خان غفلت، قوم افغان یوسف زئی (ریاض الفصحا، ص ۲۴۲) برہان الدین خان کے بیٹے تھے ، ان کا مولد رامپور اور مسکن لکھنؤ تھا ، یکم ذی الحجہ ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء کو وفات پائی (کا ملان رامپور، ص ۸) -

۴- لیکن تذکرۂ کاملان رامپور میں انھیں قدرت اللہ شوق کا شاگرد لکھا ہے - (ص ۸)

سکندر آئے زمیں ناپتے جو تا لب گور
صدا یہ کان میں آئی دہان تربت سے
بس اب نہ کیجیے گام و رسن سے پیمائش
یہاں کی ہوگی مساحت جریب قامت سے

فدوی ، مرزا محمد علی

فدوی تخلص ، مرزا محمد علی عرف مرزا بھچو دھلوی ، شاگرد شاہ گھسیٹا عشق(۱) ، احمد شاہ بادشاہ(۲) کے وقائع نگار تھے ، آخر ایام میں عظیم آباد میں سکونت اختیار کی تھی(۳) ، دیوان ان کا نظر سے گزرا(۴) : (ص ۱۹)

وقت رخصت جو مرتے مرتے بچے
اتنے دن اور رنج پانا تھا
جیسے تھے ہجر کے لیے فدوی
یوں خدا کو بھی دن دکھانا تھا

[چار قطعے اور ہیں]

فراق ، ثناء اللہ خاں

فراق تخلص ، حکیم ثناء اللہ خاں مرحوم ، برادرزادہ ہدایت اللہ خاں ہدایت ، طب میں اچھا دخل رکھتے تھے ، کسب سخن و کسب باطن حضرت خواجہ

۱- عشق ، شاہ رکن الدین عرف میر گھسیٹا نوادہ شاہ فرہاد نقشبند ، ساکن عظیم آباد ، متوفی جمادی الاول ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۸ء ، صاحب دیوان۔

۲- احمد شاہ بادشاہ ، ولادت ربیع الثانی ۱۱۴۰ھ مطابق ۱۷۲۷ء ، جلوس ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء ، گرفتاری ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء ، قتل شوال ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۴ء۔

۳- وفات قبل ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء ، در عظیم آباد ۔ (گلشن ہند ، حیدری ، ص ۴۶ ، حاشیہ)

۴- ڈاکٹر سید محمد حسنین نے ۱۹۵۶ء میں ان کا دیوان مرتب کر کے پٹنہ سے شایع کردیا ہے۔

میر درد قدس سرہ سے کرتے تھے ، شعر صاف و عاشقانہ خوب کہتے تھے ، صاحب دیوان گزرے (۱) : (ص ۶۲)

صحبت فراق اس سے میسر ہو کس طرح
دن کو تو وہ کہے ہے کہ ملنے کا ڈھب نہیں
اور رات کو جو کہیے تو پھر وہ بہانہ جو
زلفیں اٹھائے منہ سے یہ کہتا ہے شب نہیں

فغاں ، اشرف علی خاں

فغاں تخلص ' (مرزا) (۲) اشرف علی خاں دھلوی کوکہ(۳) احمد شاہ بادشاہ مقیم عظیم آباد ' شاگرد علی قلی خاں ندیم(۴) ، بعض صاحب تذکرہ نے غلطی سے ان کو قزلباش خاں امید(۵) کا شاگرد لکھا ہے ۔ بڑے ظریف تھے ، انتقال ان کا ۱۱۹۶ هجری (۶) میں ہوا ہے ، دیوان ان کا نظر سے گزرا : (ص ۶۲)

۱۔ ''دیوان ریختہ اش شستہ و رفتہ است... اکثر بانی' صحبت مشاعرہ ها او بود'' ۔ (تذکرہ هندی ، ص ۱۰۷)

۲۔ اضافہ از صفحہ ۱۰۰

۳۔ فغاں (ولادت قریب ۱۱۴۰ھ مطابق ۱۷۲۷ء) کو سرکار شاہی سے ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء میں کوکہ خاں' ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۵۹ء میں ظریف الملک خطاب ملا ، ۱۱۶۸ھ مطابق ۱۷۵۴ء میں دھلی چھوڑی ، ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۶ء میں لکھنؤ سے عظیم آباد گئے ۔

۴۔ ندیم مرشد آباد میں قیام پذیر ہوگئے تھے ، بہ عہد میر جعفر (۱۱۷۲ھ مطابق ۱۷۵۸ء تا ۱۱۷۵ھ مطابق ۱۷۶۱ء) فوت ہوئے ۔

۵۔ امید نے ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۷۴۶ء میں وفات پائی ۔

۶۔ یہ غلط ہے ' خود نساخ نے دوسری جگہ لکھا ہے ''فغاں...ابن مرزا علی خاں برادر محمد ایرج خاں مرشد آبادی ... ۱۱۸۶ھ (مطابق ۱۷۷۲ء) میں انتقال کیا ' (سخن شعرا ، ص ۳۶۹) '' گنج تواریخ'' میں بھی یہی تاریخ درج ہے ۔ (ص ۸۲) مولانا عرشی کی تحقیق کے مطابق اس وقت فغاں عظیم آباد میں مقیم تھے ۔ (دستور الفصاحت ، ص ۶۶)

رونا جہاں تلک تھا مری جان رو چکا
مطلق نہیں ہے چشم میں نم کا اثر کہیں
ماور نہیں اگر تجھے آ تو بھی دیکھ لے
آنسو کہیں ڈھلک گئے، لخت جگر کہیں

[دو قطعے ردیف "ی" کے اور ہیں]

قاسم ، میر قدرت اللہ خاں

قاسم تخلص ، حکیم میر قدرت اللہ خاں دہلوی (۱) ، شاگرد ہدایت اللہ خاں ہدایت ، مرید حضرت مولانا فخرالدین قدس سرہ(۲) ۱۲۳۶ ہجری میں انتقال کیا (۳) ، اشعار ان کے مطبوع اور مرغوب ہوتے ہیں ، صاحب دیوان گزرے ، تذکرہ شعرا ان کا نظر سے گزرا: (ص ۶۲)

ان سے چمٹ گیا جو میں شب داو گھات سے
ہر چند قاسم ان کے رہی زیر لب "نہیں"

۱- انھوں نے خود اپنے حال میں لکھا ہے:

" سید ابوالقاسم عرف میر قدرت اللہ قادری نام ، مولانا محمد فخرالدین اور مولوی خواجہ احمد خاں سے کسب فیض کیا ، طب میں حکیم محمد شریف خاں کی شاگردی کی، فن شعر میں ہدایت اللہ خاں ہدایت کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا - (بحوالہ مجموعہ نغز ، ۲/۹۲)

۲- مولانا محمد فخرالدین ، ولادت ۱۱۲۶ھ مطابق ۱۷۱۴ء ، بمقام اورنگ آباد، پچیس سال کی عمر میں دہلی آئے ، وفات ۷ جمادی‌الثانی ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴ء - (تذکرۃ الفقرا ، ص ۱۲)

۳- یہاں تک حالات بجنسہ گلزار سخن میں منقول ہیں ، البتہ مولانا فخرالدین احمد صاحب کے نام کے بعد "نیاز قدس سرہ" بھی لکھا ہے- (ص ۳۳۲) یہ غلط ہے ، شاہ نیاز بریلوی ایک دوسرے بزرگ تھے -

جھنجھلا کے مسکرا کے یہ کہنے لگے کہ تو
پھر کہیو بے حیا ''مجھے ملنے کا ڈھب نہیں''

قایم ۔ شیخ محمد قیام الدین

قایم تخلص(۱) شیخ محمد قیام الدین مرحوم (۲)، باشندہٗ چاند پور توابع سنبھل، مقیم دھلی، شاگرد سودا (۳)؛ ۱۲۱۰ ھجری (۴) میں انتقال کیا، شعر خوب کہتے تھے، دیوان ان کا نظر سے گزرا: (ص ۱۹)

شام یا صبح یاں پہ جب قایم
یہی ٹھہری کہ مر ھی جائیے گا
بس کئی دن جو زیست ہے اس پر
کس کی منت عبث اٹھائیے گا

[ردیف ی کا ایک قطعہ اور ہے]

قبول، مرزا مہدی علی خاں

قبول تخلص، میرزا مہدی علی خاں لکھنوی، مخاطب به مقبول الدوله(۵) خلف مولوی محمد مرزا، شاگرد ناسخ، شاہ واجد علی بادشاہ اودھ کے مصاحب تھے، کلکتہ میں بادشاہ کے همراہ آئے تھے، راقم کے دوستوں میں تھے، ترجمہٗ

۱۔ محمد قایم ملقب به قیام الدین علی ابن محمد هاشم ابن محمد اکرم (خاتمه دستور الفصاحت، ص ۴۴ حاشیه)

۲۔ اضافه از صفحه ۱۰۱ ۔

۳۔ شاگرد میر درد و سودا...ایک تذکرہٗ شعرا بھی ان سے یادگار ہے۔ (سخن شعرا، ص ۳۸۱)

۴۔ سال وفات میں اختلاف ہے، متحقق یہ ہے کہ ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۳ء اور ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء کے درمیان وفات پائی ۔

۵۔ '' مصاحب و داروغه توپخانه واجد علی شاه بادشاه لکھنؤ ...... شمشیر خانی کو نظم اردو میں ترجمه کیا ہے'' (سخن شعرا، ص ۳۸۲)

شمشیرخانی(۲) اور دیوان ان کا نظر سے گزرا ، شعر صاف عاشقانہ اچھا کہتے تھے ۱۲۶۷ ہجری میں لکھنؤ میں جا کر وفات پائی : (ص ۲۰)

بدل ہے انس سرور و الم سے گو مجھ کو
نفاق ان میں ہے، ہر اک بہم نہیں رہتا
جو غم ہوا تو فراق سرور میں رویا
ہوا سرور تو غم ہے کہ غم نہیں رہتا

[ردیف نون کا ایک قطعہ اور ہے]

قدرت ، شاہ قدرت اللہ

قدرت تخلص، شاہ قدرت اللہ مرحوم(۲) برادر عم زاد میر شمس الدین فقیر(۳)، عزیزوں میں حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ(۴) کے تھے، حضرت میرزا مظہر جان جاناں قدس سرہ(۵) اور میرزا جعفر علی حسرت سے کسب سخن کیا تھا، شعر گوئی میں اچھی قدرت رکھتے تھے ، مرشد آباد میں سکونت اختیار کی تھی، وہیں ۱۲۰۵ ہجری میں انتقال کیا ، دیوان ان کا نظر سے گزرا: (ص ۶۳)

بھیج مت مرہم کافور تو قدرت کے حضور
یہ علاج اور ہی زخموں پہ اثر کرتے ہیں

۱- ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۰ء میں ذکر شہاں (ترجمہ شمشیر خانی) مکمل ہوا اور ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں نتائج الذھن (دیوان) مرتب ہو کر مطبع سلطانی سے لکھنؤ میں چھپا۔

۲- باشندہ دھلی، مقیم مرشد آباد : (سخن شعرا، ص ۳۸۳)

۳- فقیر، ساکن دھلی، متوفی ۱۱۸۳ھ مطابق ۱۷۶۹ء (دستور الفصاحت، ص ۶۸)

۴- شاہ عبدالعزیز دھلوی، متوفی ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۳ء (گنج تواریخ، ص ۲۷)

۵- مظہر ابن مرزا جان جانی متوطن دھلی ، ولادت درمیان ۱۱۱۰ھ مطابق ۱۶۹۸ء، و ۱۱۱۳ھ مطابق ۱۷۰۱ء (دستور الفصاحت ، ص ۹۴) وفات ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء (گنج تواریخ ، ص ۲۵)

تیرے جاں سوختہ خورشید قیامت کے تئیں
ہر سحر پنبۂ ناسور جگر کرتے ہیں

[ردیف 'ی' کے تین قطعے اور ہیں]

قربان ، میر محمدی

قربان (۱) تخلص ، میر محمدی دهلوی عرف میر کلو (۲) ، شاگرد ثناالله خاں فراق ۔ (ص ۷۰)

هاتھ پکڑا جو میں کہا اے واہ
کچھ دوا نے ہوے ہو لو دیکھو
چھوڑ دو تم کو میرے(۳) سر کی قسم
کھڑا سنتا کوئی نہ ہو دیکھو

قمر ، مرزا قمرالدین خاں

قمر تخلص، مرزا قمرالدین خاں بہادر (۴) عرف مرزا حاجی، نایب مرزا غازی الدین حیدر والیٔ لکھنؤ (۵) ، خلف مرزا جعفر (۶) استاد بیلی صاحب

۱۔ خلف میر کلو حقیر (سخن شعرا ، ص ۳۸۵)

۲۔ جوانیست سپاهی وضع...اکثر...در مشاعرۂ مہدی علی خاں مرحوم آمده ۔ (تذکرۂ سرور ، ص ۵۲۶)

۳۔ اصل: 'میر'

۴۔ مخاطب به افتخار الدوله (سخن شعرا ، ص ۳۸۸) پورے خطابات اس طرح تھے : ''نواب افتخارالدوله معین الملک (امین الملک؟) صولت جنگ خاں بہادر''۔ ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں وفات پائی ۔ (تذکرۂ ابن طوفان ، ص ۷۰) ۔

۵۔ شاہ زمن ابوالمظفر معزالدین غازی الدین حیدر بادشاہ ، نیابت ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۴ء، اعلان بادشاهت ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۸ء، وفات ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء ، بعمر قریب ۵۶ سال ۔

۶۔ میرزا فخرالدین احمد خاں بہادر عرف مرزا جعفر، جعفر تخلص، متوطن لکھنؤ ، متوفی ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء ۔ (ریاض الفصحا ، ص ۷۰)

ریزیڈنٹ لکھنؤ، باشندہ لکھنؤ، شاگرد مرزا قتیل(۱)، ہر دو زبان میں شعر کہتے ہے، دیوان ان کا نظر سے گزرا : (ص ۳۰)

مجھ سے کہنے وہ لگے کل کہ نہیں کچھ معلوم
کس پہ تم مرتے ہو صاحب تمہیں کیا ہے مرغوب

[یہ پانچ شعر کا قطعہ ہے، اس کے علاوہ ردیف 'میم' کا ایک قطعہ اور ہے]

قوس، مرزا محبوب علی

قوس تخلص، مرزا محبوب علی(۲) ولد مرزا [ہمایون (۳)] بخت ابن مرزا زین العابدین، شاگرد راقم الحروف، وطن ان کا دھلی، مولد کانپور، مسکن کلکتہ، شعر اچھا کہتے ھیں، پہلے شمس تخلص کرتے تھے، صاحب دیوان ھیں : (ص ۵۰)

اے قوس ھوا وصل کی شب طرفہ تماشا
منہ اس نے کیا داغ جگر کے جو مقابل
کیا گرم کبھی بات ظرافت سے یہ میں نے
سورج کو نہ دکھلاؤ چراغ اے مہ کامل

[ردیف 'ھائے ھوز' کا ایک قطعہ اور ہے]

۱- مرزا محمد حسن (اصل نام دیوالی سنگھ) قتیل، درگاھی مل کے بیٹے، مرزا محمد باقر شہید کے شاگرد، ولادت ۱۱۷۲ھ مطابق ۱۷۵۸ء، قبول اسلام قریب ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء، اعلان اسلام تقریباً ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء، لکھنؤ ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں آئے، وفات ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء۔

۲- قوس محبوب علی خاں خلف مرزا ھمایوں بخت شاھزادہ، مقیم کلکتہ (ناشر، ص ۱۲۱)

۳- صل: "جابون"

کامل ، مرزا کامل بیگ

کامل تخلص، مرزا کامل بیگ(۱) ، اور کچھ حال ان کا معلوم نہ ہوا : (ص ۱۰۲)

مژگاں سے گر بچے دل ابرو کرے ہے ٹکڑے
یہ بات اس سے کہہ کر جو میں نے داد چاہی(۲)
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہووے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

کبیر ، حکیم کبیر علی

کبیر تخلص ، حکیم کبیر علی (۳) باشندۂ سمبھل (۴) ، دیوان ان کا نظر سے گزرا : (ص ۵۰)

کس سے جا کیجے عرض حال کبیر
اس دل بے قرار کا احوال

[یہ پانچ شعر کا قطعہ ہے]

کمال ، شاہ کمال الدین حسین

کمال تخلص، شاہ کمال الدین حسین(۵) باشندہ کڑا مانک پور ، شاگرد

۱- ''یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں ، غزل اس طرح پڑھی گویا فوج کی کمان کر رہے ہیں''۔ (دھلی کی آخری شمع ، ص ٦۷)

۲- یہ بات میں نے کہہ کر جب اس سے داد چاہی۔ (تذکرۂ سرور، ص۵ ۵۳)

۳- ''فقیر (مصحفی) ایشان را در سرکار نواب محمد یار خاں ... دیدہ بود'' (تذکرۂ ھندی ، ص ۱۹۷)

۴- '' شیخ زادھائے انصاری '' میں تھے ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰٦ء کے قریب طالب علم تھے ۔ (مجموعۂ نغز ، ۲/۱۳۴)

۵- '' وطن بزرگانش کڑا مانک پور ، و از چندے والا.....ایشان در صوبۂ بہار نیز توطن گرفتند و اینہا ہمہ در زمانہ خویش منصبدار پادشاہی

(آیندہ صفحے پر)

جرات و قیام الدین قایم - بزرگ ان کے ارباب مناصب تھے، بہ درویشی اختیار کرکے سیاحت کرتے تھے - ان کا دیوان اور تذکرۂ شعرائے اردو نظر سے گزرا، شعر اچھا کہتے تھے : (ص ۲۱)

اہ جو کچھ مجھ سے ہو سکتا سو کر چکتا ولیک
ایک دن تم کو نہ شوق کار فرمائی ہوا
اور دکھلایا تماشا مجھ کو وحشت نے (کمال)
میں تماشائی تھا جس کا وہ تماشائی ہوا

کوکب ، مرزا غلام حسین خاں

کوکب تخلص، مرزا غلام حسین خاں شاگرد محمد صادق خاں اختر، بیشتر لکھنؤ میں رہتے تھے اور فارسی کہتے تھے - (ص ۲۱)

صبا اتنا پیام جان محزوں اس سے کہ دینا
کہ اے بے رحم کر موقوف اب تو امتحان اپنا
جدائی سے تری دم آ رہا ہے اس دم آنکھوں میں
جو آنا ہو تو آ ، ہوتا ہے رخصت میہماں اپنا

(گزشتہ صفحے سے)

بودہ اند ، شاہ مذکور در آغاز شباب ...... بہ لباس درویشی ...... سیر بنگالہ کردہ بہ لکھنؤ وارد شد ...... از چندے بحلقہ تلامذہ قلندر بخش جرات داخل شدہ " (تذکرہ ہندی ، ص ۱۹۱)

کمال ... ولد قادر نواز خاں ، وطن بزرگانش شاھجہاں آباد ... از چندے والد ایشاں در موضع محی الدین پور کہ متصل صوبہ بہار است ...... توطن گزیدہ .... تولد شاہ مذکور در ہماں موضع واقع شدہ لیکن نشو و نما در عظیم آباد یافتہ ، بعد انتقال والد خود در سن شانزدہ سالگی ترک لباس اختیار کردہ ... عمرش از سی متجاوز خواھد بود "

(تذکرۂ ہندی، نسخہ رامپور ، بحوالہ نسخہ مطبوعہ ، ص ۱۹۰ ، بر حاشیہ) -

گویا ، فقیر محمد خاں

گویا تخلص ، حسام الدولہ نواب فقیر محمد خاں بہادر (۱) ولد بلند خاں (۲) قوم آفریدی، شاگرد خواجہ وزیر، ساکن کولھار ، لکھنؤ کے امرائے نامی میں تھے ، شعر صاف و عاشقانہ اچھا کہتے تھے ، دیوان ان کا نظر سے گزرا(۳) : (ص ۶۳)

نعش پر گویا کی کہتا تھا وہ شوخ
اس طرح کا آدمی ہوتا نہیں
کس خوشی سے جان دی اس شخص نے
ایسا عاشق دوسرا دیکھا نہیں

مجروح ، حمیدالنبی

مجروح تخلص، مولوی حافظ حمید النبی ، باشندہ رامپور، خلف مولوی حافظ حبیب النبی مرحوم رقت (۴) ، برادر خورد و شاگرد مولوی حافظ رشید النبی وحشت(۵) ۔ اولاد میں حضرت مجدد الف ثانی (۶) کی۔ علوم فارسی و عربی میں اچھا

۱۔ گویا متوفی ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۷ء

۲۔ بلند خاں ابن یار بیگ خاں ۔

۳۔ ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۸۲۵ء میں دیوان مکمل ہوا ، ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء میں چھپا۔ ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں ''انوار سہیلی'' کا ترجمہ ''بستان حکمت'' کیا۔

۴۔ رقت ابن مولوی ضیاء النبی ، شاگرد غلام جیلانی رفعت ، متوطن رامپور، ولادت ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۳ء بمقام رامپور، وفات ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء بمقام کلکتہ۔ (کاملان رامپور ، ص ۱۰۱)

۵۔ وحشت ، مولوی حافظ رشید النبی ، متوطن رامپور ، مفتی عدالت دیوانی ہوگلی، متوفی ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء (گنج تواریخ ، ص ۳۵)

۶۔ شیخ احمد فاروقی سرھندی مجدد الف ثانی ، متوفی ۱۰۳۵ھ مطابق ۱۶۲۵ء ۔ (گنج تواریخ، ص ۲۳)

رکھتے ہیں، ہر دو زبان فارسی و اردو میں شعر پر مضمون و آبدار کہتے ہیں ۔ کلکتہ میں بھی آئے تھے، کئی برس ہوئے کہ وطن کو چلے گئے(۱) ۔ راقم کے دوستوں میں ہیں ۔ (ص ۱۰۲)

اس سرمہ و گیسو و مسی سے
کوچہ ترا دشت کربلا ہے

[یہ سات شعر کا قطعہ ہے]

محرور، خواجہ نبی بخش کشمیری

محرور تخلص، خواجہ نبی بخش کشمیری، کلکتہ میں بہ شغل تجارت رہتے ہیں، شعر اچھا کہتے ہیں، کلام اپنا راقم الحروف کو دکھلاتے ہیں ۔ (۲) (ص ۳۴)

بے فایدہ ہے گریہ و زاری فراق میں
محرور ہیں یہ نالہ و شور و فغاں عبث
اس سنگ دل پہ خاک بھی کرتے نہیں اثر
رو رو کے دے رہا ہے تو کیوں اپنی جاں عبث

محترم، محترم علی خاں

محترم تخلص، خواجہ محترم علی خاں دہلوی(۳)، مقیم عظیم آباد،

۱۔ "دو تین برس ہوئے وطن جا کر انتقال کیا" (سخن شعرا، ص ۴۱۲) ۔ وفات ۱۰ شوال ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء بمقام رامپور (کاملان رامپور)

۲۔ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں عین جوانی میں انتقال کیا، راقم نے ان کی وفات کی تاریخ کہی ۔

"مرگ جواں ماتم سخت" (سخن شعرا، ص ۴۱۷)
۱۸۶۱

۳۔ "نواب قاسم خاں کی سرکار سے تعلق رکھتے تھے" (سخن شعرا، ص ۴۱۷)

برادر زادهٔ خواجه محمدی خان(۱)، شاگرد شاہ ٹھیٹا عشق ۔ (ص ۶۳)

دوستوں نے مرے، کہا ان سے — محترم کو کہو تو یاں لائیں
لگے کہنے کہ شرط کر لو تم — ہم جو مجلس میں اس کو بلوائیں
رو لہ دیوے کہ جس کے رونے سے — ساری محفل کے چھچھے جائیں

محسن، میر محسن علی

محسن تخلص، میر محسن علی(۲)، صاحب دیوان و تذکرہ ''سراپا سخن''، ولد شاہ حسین حقیقت(۳)، شاگرد خواجہ وزیر و رشک(۴) متوطن خوست، باشندۂ لکھنؤ، تذکرہ ان کا نظر سے گزرا (۵) : (ص ۷۴)

۱۔ لیکن علی ابراهیم خان خلیل نے لکھا ہے : ''خواجہ محمد محترم، برادر خواجہ محمدی خان مرحوم ...... در مرشد آباد از منسلکان عالی جاہ نواب میر محمد قاسم خان مرحوم بود'' (گلزار ابراهیم، ص ۲۲۷) - قریب ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء وفات پائی - (گلشن هند حیدری ، ص ۸۷ ، حاشیہ پر)

۲۔ محسن ابن حقیقت ابن سید عرب شاہ ابن سید میرک شاہ (جو بہ عہد شاہ عالم دهلی آئے) ابن سید امیر برهان (جو بہ عہد فرخ سیر لاهور آئے) -

۳۔ حقیقت، شاگرد جرات ، وطن اجداد خوست ، مولد بریلی، مسکن لکھنؤ، مولف ''صنمکدہ چین'' (ایک نسخہ دبیر منزل کانپور میں موجود ہے) اور '' تذکرۂ احبا '' وغیرہ ۔

۴۔ رشک، میر علی اوسط ابن سید سلمان واسطی (متوفی ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۴ء) ناسخ کے شاگرد تھے ، ولادت قریب ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۲ء بمقام فیض آباد ، ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں پہلا دیوان ''نظم مبارک'' ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں دوسرا دیوان ''نظم گرامی'' مرتب ہوا۔ دونوں یکجا ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں چھپے ، تیسرا دیوان ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں مکمل ہوا، اسی سال عراق کے لیے روانہ ہوئے - ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء میں بمقام کربلا وفات پائی۔

۵۔ یہ تذکرہ ''سراپا سخن'' ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں تالیف ہوا ۔

صاف ہے ہر شجر گل پہ عروسانہ بہار
ہر چمن باغ میں عشرت کا بنا کا شانہ
دولھا گلچیں ہے نبات آج چنی جاتی ہے
پھول مصری ہے سر شاخ دلھن کا شانہ

مور ، واحد علی

مخمور تخلص، مولوی واحد علی مرحوم(۱) خلف مولوی عبدالعلی نامی، ‌س شہر ڈھاکہ ، اشعار اردو فارسی خوب کہتے ہیں ، کلام اپنا راقم الحروف و دکھلاتے ہیں : (ص ۴۴)

ہے مونث وہ جسے ہوتی ہے دنیا کی طلب
اور مخنث وہ ہے جو رکھتا ہے عقبیٰ سے غرض
ترک کر مخمور دنیا کو، اٹھا عقبیٰ سے ہاتھ
تو اگر ہے مرد تو رکھ اپنے مولا سے غرض

رزا ، محمد حسن خاں دہلوی

مرزا تخلص ، نواب محمد حسن خاں دہلوی(۲) ، مقیم بنارس خلف نواب

۱- ''آغاز شباب میں ۱۲۷۹ھ (مطابق ۱۸۶۲ء) میں انتقال کیا ، راقم ‌ نے یہ تاریخ ان کی وفات کی کہی ہے :

''داخل جنت نعیم ہوئے'' (سخن شعرا ، ص ۴۲۵)

۱۲۷۹

۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں ان کی شادی ہوئی تھی - (گنج تواریخ ، ‌ ۳۱)

۲- مصحفی نے ان کا نام اس طرح لکھا ہے : ''احترام الدولہ محمد حسین ‌ے معروف نواب مرزا، مرزا تخلص'' (ریاض الفصحا ، ص ۲۷۶) لیکن ''گلزار ‌اہیم'' میں ''محمد حسن خاں'' تحریر ہے اس کے علاوہ یہ تفصیل بھی مندرج ہے ‌رزا دہلوی ...... ابن نواب اشرف خاں نوادہ نواب صمصام الدولہ خاں دوراں و ‌اہرزادہ، سید فضائل علی بیقید و برادر کہتر رستم علی خاں رستم تخلص...الحال کہ ‌۱۱۹ھ (مطابق ۱۷۸۲ء)...در بلدہ بنارس اقامت دارد''۔ (گلزار ابراھیم،ص۲۳۰

اشرف خان معاصر سودا : (ص ۱۷)

آ گرا ہے جو تمہارے ہی در اوپر مرزا
دمبدم اس کو اٹھاتے ہو بھلا کا ہے کو
جب وہ غربت زدہ جاتا ہے تو سوکر کے فریب
پھر اسے آپ بلاتے ہو بھلا کا ہے کو

مسرور، سید محمد علی

مسرور تخلص، سید محمد علی، ولد سید علی طباطبائی، نواسہ میر شیرعلی افسوس(۱) ، باشندہ کلکتہ ۔ شعر عاشقانہ اچھا کہتے ہیں، کلام اپنا راقم الحروف کو دکھلاتے ہیں ، اطراف ایران و پنجاب و ہندوستان و رنگون وغیرہ بہت سے ملکوں اور شہروں کی سیر کی ہے (۲) : (ص ۳۱)

راہ میں پاکے جو اس بت سے کہوں
میرے گھر بھی تو کبھی آئیے آپ
کہے منہ پھیر کے اک شوخی سے
پہلے منہ اپنا تو بنوائیے آپ

مصحفی، غلام ہمدانی

مصحفی تخلص، غلام ہمدانی(۳) باشندہ قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد ، ولد

۱- افسوس، ابن سید مظفر علی خاں ، شاگرد میر سوز ، میر حیران، وطن نارنول، ولادت ۱۱۳۸ھ مطابق ۱۷۲۵ء بمقام دھلی، ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے ، وفات ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء بمقام کلکتہ ، کلیات ۱۹۶۱ء میں مرتب ہوکر پٹنہ سے شایع ہوا ۔

۲- ” تیسویں شہر ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ (مطابق ۱۸۶۳ء) کو انتقال کیا “ ۔ (سخن شعرا ، ص ۴۳۲)

۳- مولد بلم گڑھ نزد اکبر پور، ولادت قریب ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء، پہلی بار ۱۱۸۵ھ مطابق ۱۷۷۱ء میں دوسری مرتبہ ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۳ء میں لکھنؤ گئے ، وفات ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء ۔

[...]محمد ، شاگرد مانی - شروع جوانی میں دهلی گئے تهے، آخرالامر لکهنؤ میں [...]کر اپنی زندگی بسر کی ، کچه روزوں مرزا سلیمان شکوه بہادر کی رفاقت میں تهے- جمیع اصناف سخن پر قادر تهے اور پرگو ایسے کہ آج تک شعرائے اردو میں دوسرا نظر نہ آیا، چنانچہ آٹھ دیوان اور دو تذکرے اردو(۱) میں اور ایک دیوان فارسی بہ جواب نظیری نیشاپوری اور ایک تذکرہ فارسی میں لکھے ہیں - اشعار ان کے نہایت آبدار و عاشقانہ مطبوع طبائع طباعان زمانہ ہیں ، کئی دیوان اور تذکرے ان کے نظر سے گزرے: (ص ۲۱)

پکڑ کر هاته اس کا میں لیا چوم
طپانچہ (کذا) اس نے جب مجھ پر اٹھایا
وہ غافل تھا مزے داری سے یعنی
مزا یوں چاہ کا اس کو جتایا

[۸ ۱ قطعات اور بھی ہیں]

مفتون، قادر بخش

مفتون تخلص، منشی قادر بخش، باشندہ ہوگلی ، آخر ایام میں بصارت ان کی جاتی رہی تھی، چار سال کا عرصہ گزرا کہ انتقال کیا(۲)- بیشتر فارسی کہتے تھے ، راقم کے ملاقاتیوں میں تھے - (ص ۲۲)

یاد میں اس گل کی رویا صبح جو گلشن میں میں
بلبلان باغ میں اک سخت ماتم ہو گیا
غنچے نے پھاڑا گریباں، گل کا دامن چاک تھا
چشم نرگس سے بھی جاری اشک شبنم ہوگیا

ممنون، میر نظام الدین

ممنون تخلص، میر نظام الدین، مخاطب بہ فخر الشعرا استاد محمد اکبر

۱- تینوں تذکرے فارسی زبان میں ہیں البتہ پہلا ''عقد ثریا'' ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴ء میں شعرائے فارسی کے حال میں لکھا ہے، دوسرا تذکرہ ''هندی گویان'' ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں مکمل ہوا، تیسرا ''ریاض الفصحا'' اس کا تکملہ ہے جو ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۰ء میں اختتام کو پہنچا -

۲- '' آٹھ دس برس ہوئے انتقال کیا '' - (سخن شعرا ، ص ۴۰۳)

شاہ ثانی بادشاہ دھلی(۱) خلف میر قمر الدین منت مخاطب، بہ ملک الشعرا، اپنے والد سے کسب سخن کرتے تھے، وطن ان کا سونی پت، مولد و جائے تربیت دھلی، مدتوں لکھنؤ میں رہے، آخر عمر میں اجمیر کے کوھستان میں سکونت کی تھی(۲)۔ شعر نہایت شیریں و نمکین کہتے تھے۔ ۱۲۶۰ ھجری میں انتقال کیا" "شاعر شیریں زبان ھند" ان کی وفات کی تاریخ ہے، دیوان ان کا نظر سے گزرا: (ص ۳۲)

ضعف ہے مانع تحریر ولیکن قاصد
اسے پیغام زبانی یہ سنانا اپنا
مثل شمع سحری رھگزر شوق میں یاں
دم ہے یاں ھونٹوں پہ اے ماہ یگانا اپنا
اگر آنا ہے تو آ، ورنہ کوئی دم میں اب
عدم آباد کو نزدیک ہے جانا اپنا

منت، میر قمرالدین

منت تخلص، میر قمر الدین مخاطب بہ ملک الشعرا (۳)، مرید مولانا فخر الدین قدس سرہ، شاگرد میر نور الدین [نوید (۴)] و میر شمس الدین فقیر(۵)۔ وطن ان کا مشہد مقدس، مولد سونی پت، دھلی میں تربیت پائی تھی، لکھنؤ

۱۔ ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء سے کچھ قبل شاہ عالم ثانی بادشاہ دھلی کی سرکار میں "استعفا" دے چکے تھے۔ (مجموعہ نغز، ۲/۲۱۲)

۲۔ "اجمیر میں عہدۂ صدرالصدوری پر مامور تھے... ۱۲۶۰ھ (مطابق ۱۸۴۴ء) میں دھلی میں انتقال کیا"۔ (سخن شعرا، ص ۴۵۵)

۳۔ ولادت، قریب ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۷۴۶، لکھنؤ ۱۱۹۱ھ مطابق ۱۷۷۷ء میں، کلکتہ ۱۲۰۶ھ مطابق ۱۷۹۱ء میں گئے۔

۴۔ اصل "نوھد"۔ نورالدین نوید دھلی میں امیر خاں انجام، لکھنؤ میں شجاع الدولہ کی سرکار سے وابستہ تھے۔ (سفینہ ھندی، ص ۲۲۶)

۵۔ فقیر، متوطن دھلی، متوفی ۱۱۸۳ھ (مطابق ۱۷۶۹ء)۔

میں جا کر مذہب امامیہ اختیار کیا تھا ، کلکتہ میں آ کر ۱۲۰۸ھ میں فوت ہوئے ، ریختہ بہت کم کہتے تھے ، اشعار فارسی ان کے قریب ڈیڑھ [لکھ] (۱) کے ہوں گے ۔ (ص ۱۰۳)

کھڑے رہیے جو ان کی بزم میں تو یوں لگے کہنے
دکھاتا ہے یہ اپنے پاؤں کیوں ناحق کھڑا بیٹھے
جو اتنی بات سن کر بیٹھ جائیں تو لگے کہنے
ہنسی سے کہتے ہیں اک بات کے بس [آپ] (۲) آ بیٹھے

منصف ، منصف علی خاں

منصف تخلص، منصف علی خاں، باشندۂ عظیم آباد، (۳) مقیم دہلی، شاگرد نظام الدین خاں معجز(۴)، قوم افغان سے تھے، فارسی میں مہارت تام رکھتے تھے۔ (ص ۲۳)

جی دھڑکتا ہے ہائے قاصد نے   جب کہ نامہ اسے دیا ہوگا
پڑھ کے احوال زار ، منصف کے   در جواب اس نے کیا کہا ہوگا

منظور ، آفرین الدین خاں

منظور تخلص ، آفرین الدین خاں ، خلف منشی تحسین الدین خاں مرحوم تحسین ، داروغہ ضلع راجشاہی، باشندۂ موضع جوت پرتاب، متعلق مالدہ ، شاگرد راقم الحروف ، طبیعت ان کی فن شعر سے نہایت مناسبت رکھتی ہے :

۱- اصل: " لک "

۲- اضافہ از مرتب ۔

۳- بہ معلمی ایام بسر می برد " (مجموعہ نغز ، ۲/۲۱۷)

۴- صحیح نام محمد نظام خاں (سفینہ خوشگو، ص ۳۴۸) تخلص معجز (سفینہ ھندی میں " معجزہ ") پیشاور کے رہنے والے تھے، عبد اللطیف خاں تنہا کے شاگرد تھے، دہلی میں ۱۱۶۲ھ مطابق ۱۷۴۹ء میں وفات پائی ، فارسی گو شاعر تھے ۔ (سفینہ ھندی ، ص ۱۹۹)

کیا خوشی کے مثل بلبل روز و شب تھے چہچہے
جن دنوں آغوش میں وہ غیرت گلزار تھا

[یہ کل پانچ شعر کا قطعہ ہے]

مومن، محمد مومن خاں

مومن تخلص، حکیم محمد مومن خاں مرحوم (۱) خلف حکیم غلام نبی خاں مغفور دهلوی (۲) شاگرد شاہ نصیر دهلوی (۳) ۱۲۶۸ھ میں قضا کی، "ماتم مومن خاں" ان کی وفات کی تاریخ ہے۔ علم تنجیم و طب میں خوب دخل رکھتے تھے، جمیع اصناف سخن پر قادر تھے، اشعار ان کے پر مضمون و شیرین و عاشقانہ و نمکین ہوتے ہیں، کلیات ان کا نظر سے گزرا - (ص ۲۴)

زانوے بت پہ جان دی، دیکھا
مومن انجام و اختتام مرا
بندگی کام آرہی آخر
میں نہ کہتا تھا کیوں سلام مرا

[نو قطعات اور ہیں]

مہر، نواب امین الدولہ

مہر تخلص، نواب امین الدولہ سید آغا علی خاں (۴) ولد نواب

۱- ولادت ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء

۲- حکیم غلام نبی، متوفی ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء ابن حکیم نامدار خاں -

۳- "ایک یا دو غزل میں نصیر دهلوی سے اصلاح لی تھی، اصلاح پسند نہ آئی ... راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں نہیں گزرا" - (سخن شعرا، ص ۴۶۷)

۴- نواب امین الدولہ سیف الملک سید آغا علی خاں بہادر فیروز جنگ، ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۱ء میں اپنے والد کی جگہ مسند نشینی، ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء میں بیٹا (نادر آغا) پیدا ہوا، ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۰ میں عراق کے لیے روانگی، ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۸۵۲ء میں بمقام کاظمین وفات -

معتمد الدولہ (۱)، شا گرد ناسخ و رشک ، ان کا مولد لکھنؤ ، مسکن کانپور ، مدفن نجف اشرف ، بہ کربلا کو بھی گئے ، دیوان (۲) ان کا نظر سے گزرا (۳) ۔ (ص ۵۰)

اٹھائیں گے تعمیر مرقد کی اک دن
عمارات عالی اٹھانے سے حاصل

[یہ دس شعر کا قطعہ ہے ، اس کے علاوہ دو قطعات ردیف نون کے اور بھی ہیں]

منحور، اسد اللہ

منحور تخلص، منشی اسد اللہ معروف بہ علی جان ولد منشی حیدر علی حیدر مرحوم (۴) باشندہ چیچڑہ ضلع ھوگلی ، بزرگوار ان کے ولندیزوں کے عہد میں دھلی سے آکر وھیں بسے تھے، ان کا مولد چیچڑہ، جائے تربیت دارالامارت کلکتہ، فکر بلند و طبع ارجمند رکھتے ھیں (۵) ، کلام اپنا راقم الحروف کو دکھلاتے ھیں، صاحب دیوان ھیں (ص ۲۳) ۔ ریختی میں دو گانا تخلص کرتے ھیں ۔ (ص ۱۰۳)

۱۔ نواب معتمد الدولہ سید آغا میر خان بہادر ضیغم جنگ ، متوفی ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۱ء ، نواب غازی الدین حیدر کے نائب ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۴ء میں ، پھر وزیر اعظم ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۸ء میں ھوئے ۔

۲۔ ایک دیوان چھپ گیا تھا دوسرا چھپ نہ سکا ۔

۳۔ محض چند لفظوں کی تبدیلی کے ساتھ یہ پوری عبارت گلزار سخن میں نقل کر لی گئی ہے ۔ (ص ۲۸۰)

۴۔ منشی حیدر علی حیدر ابن منشی غلام نبی ابن مسند خاں دھلوی ۔ (سخن شعرا ، ص ۱۴۰)

۵۔ صاحب تصانیف، چنانچہ گنج تواریخ میں ہے ۔ ''تاریخ اختتام رسالہ دافع الہذیان رقمزدہ منشی اسد اللہ متخلص بہ منحور بجواب اعتراضات مولوی مشیت اللہ متخلص بہ عالی منصف ضلع راجشاھی ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸٦۴ء ۔ (ص ٦۴) اس کے علاوہ اس نوع کی بعض اور تصانیف بھی ھیں ۔

کہ روتا ہوں کبھی ہنستا ہوں اپنے دھیان میں
شکل دیوانہ کبھی پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
دیکھ کر کہتا ہے کوئی ہے اسے آسیب جن
کوئی کہتا ہے پری کا ہے اسے سایا ہوا
پر نہیں واقف ہے کوئی ایک سے لے تا ہزار
یک گل رشک چمن پر دل جو ہے آیا ہوا
[سات قطعے اور بھی ہیں]

میر ، میر محمد تقی

میر تخلص، میر محمد تقی اکبرآبادی(۱) ولد میر عبداللہ (۲) شاگرد و ہمشیرزادہ سراج الدین علی خان آرزو(۳) ، عنفوان شباب میں دہلی گئے تھے، وہاں سے لکھنؤ میں جا کر سکونت اختیار کی تھی، نواب وزیر کی سرکار سے ان کا وظیفہ مقرر ہوا تھا ، ۱۲۲۵ھ میں فوت کی ، سوائے قصیدہ کے جمیع اصناف سخن پر قادر تھے، خصوصاً مثنوی و غزل گوئی میں لاثانی تھے، اشعار ان کے بغایت مرتبہ رتبہ، بلند رکھتے ہیں ، فرط اشتہار سے حاجت بیان نہیں - ان کے چھ دیوان ریختہ مع قصاید و مثنوی نظر سے گزرے، ایک دیوان فارسی، ایک تذکرہ شعرا، اور ایک رسالہ میر فیض (کذا) بھی ان سے یادگار ہے، ان کی استادی سے

۱- ولادت ۱۱۳۵ھ مطابق ۱۷۲۲ء بمقام آگرہ، ۱۱۵۲ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں دوسری بار دہلی گئے، ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۱ء میں دہلی میں خان آرزو کی ہمسائیگی چھوڑی، ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۶ء کے قریب ''فیض میر'' لکھا، ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء میں ذکر میر کی پہلی روایت لکھی، ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ گئے، ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں بمقام لکھنؤ وفات، مدفن اکھاڑ بھیم -

۲- صحیح نام محمد علی، جن کو بقول میر، بہ سبب ریاضت، علی متقی خطاب ملا، ولادت ۱۰۸۲ھ مطابق ۱۶۷۱ء، وفات ۱۱۳۶ھ مطابق ۱۷۲۳ء -

۳- آرزو ابن شیخ حسام الدین حسام (متوفی ۱۱۱۵ھ مطابق ۱۷۰۳ء) شاگرد میر عبد الصمد سخن و میر احسن، متوطن اکبر آباد ، ولادت ۱۰۹۹ھ مطابق ۱۶۸۷ء (= نزل غوب) - ۱۴ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا ، محرم ۱۱۶۸ھ مطابق ۱۷۵۴ء میں لکھنؤ گئے ، وفات ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ مطابق ۱۷۵۶ء میں ہوئی -

کسی کو انکار نہیں - (۱) (ص ۲۵)

آئی نظر جو گور سلیماں کی ایک دن
بالیں پہ اس مزار کے تھا یہ رقم ہوا
اے سرکشو جہان میں کھینچا تھا ہم نے سر
پایان کار مور کے خاک قدم ہوا

[دس قطعات اور ہیں]

نازش ، الٰہی بخش

نازش تخلص، مولوی الٰہی بخش ولد مولوی محمد صالح شاگرد مظفر علی اسیر، باشندۂ خیر آباد ، عزیزوں میں مولوی فضل حق مرحوم مغفور(۲) کے ہیں : (ص ۶۴)

حصار باغ میں قمری کو سرو رعنائی
کیا ہے وصل سے کیا کیا نہال پردے میں
بہ زیر برقع فانوس شمع و پروانہ
بہت سے رہتے ہیں فرخندہ حال پردے میں
ہمارے طالع برگشتہ کیسے ہیں یارب
نہ ہر سلا ہے نہ ہم کو وصال پردے میں

نازنیں ، مرزا علی بیگ

نازنیں تخلص، مرزا علی بیگ، ریختی گوے دہلی ، برخلاف جان صاحب کے ، ان کی ریختی میں کچھ کچھ شاعری کا بھی لطف ہوتا ہے : (ص ۶۴)

۱- ” جو درد کہ ان کے کلام میں ہے کسی شاعر ریختہ گو کے کلام میں نہیں“ - (سخن شعرا ، ص ۴۷۹)

۲- مولوی فضل حق خیر آبادی ، متوفی ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء ، ابن مولوی فضل امام خیر آبادی ، صدالصدور دہلی، متوفی ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء - گنج تواریخ ، ص ۲۸)

نازنیں اتنا بھی ہرجائی پنا
یہ تمھارے آگیا کیا دھیان میں
روز اک دھکڑے کی ہیں مہمانیاں
روز رہتی ہو اسی سامان میں

ناسخ، شیخ امام بخش

ناسخ تخلص، شیخ امام بخش لکھنوی(۱)، صاحب تذکرہ ''سراپا سخن'' سید محسن علی محسن نے ان کو ولد شیخ خدا بخش(۲) تاجر لاہوری کر کے لکھا ہے، لیکن یہ تاجر مذکور کے غلام مشہور تھے، چنانچہ خود شیخ امام بخش ناسخ نے اس امر کو مندفع کرنے کے لیے رباعیات مرقومۂ ذیل کہی ہیں ، و اللہ اعلم بالصدق و الصواب ۔ رباعی ناسخ :

کہتے رہے اعمام عداوت سے غلام
میراث پدر میں نے مگر پائی تمام
اس دعوئ باطل سے ستمگاروں کو
حاصل یہ ہوا کر گئے مجھ کو بدنام

ولہ :

مشہور ہے گرچہ افترائے اعمام
پر کرتے نہیں غور خواص اور عوام(۳)

۱۔ ضیغم اور ابن طوفان نے ان کا نام شیخ امام بخش عبداللہ لکھا ہے۔

۲۔ مصحفی نے بھی ناسخ کو ''ابن خدابخش'' لکھا ہے (تذکرۂ ہندی) اور خود ناسخ کے بیان کے مطابق ان کا انتقال ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں ہوا ۔

۳۔ یہاں تک پوری عبارت (بہ تصرف معمولی) گلزار سخن، میں (ص ۳۳۷ پر) نقل کر لی گئی ہے۔

وارث ہونا دلیل فرزندی ہے
میراث نہ پا سکا کبھی کوئی غلام

غرض اشعار ان کے بیشتر مثالیہ اور پر مضمون ہوتے ہیں' اکثر اشعار شعرائے متقدمین و متاخرین فارسی کو کو نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ مشہور ہے کہ کچھ روزوں محمد عیسیٰ تنہا شاگرد مصحفی سے اصلاح لے کر منحرف ہوگئے تھے ، سوائے غزل اور رباعی کے اور کسی صنف سخن میں دخل نہ رکھتے تھے - ۱۲۵۴ ہجری میں فوت کی (۱)۔ کلیات ان کا نظر گزرا : (ص ۲۶ تا ۲۷)

[ردیف 'ی' کے دو قطعے ہیں]

ناظم ، نواب یوسف علی خان

ناظم تخلص(۲) نواب یوسف علی خان بہادر' والیٔ رامپور' خلف الصدق نواب محمد سعید خان بہادر(۳) ، شاگرد اسد اللہ خان غالب ، علم عربی و فارسی

۱- ولادت ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۷۱ء ، دیوان اول ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۶ء میں ، دیوان دوم ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۱ء میں مکمل ہوا' ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں دیوان سوم رشک نے مرتب کیا ، تینوں دیوان یکجا ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں مع صحت نامہ شایع ہوئے۔

۲- "لیجس لیٹو کونسل ہند کے ممبر ہوکر ۱۸۶۴ء یعنی ۱۲۸۰ھ میں اشرف البلاد کلکتہ میں رونق فرما ہوئے تھے" - (سخن شعرا ، ص ۴۹۸) جلوس ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء، وفات ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء۔

۳- نواب محمد سعید خان (جلوس ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء ، وفات ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء) ابن نواب احمد علی خان رند (جلوس ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء ، وفات ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء) ابن نواب سید غلام محمد خان (جلوس محرم ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء ، وفات جمادی الاول ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء) ابن نواب فیض اللہ خان (۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۴ء تا ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء) ابن نواب سید علی محمد خان (متوفی شوال ۱۱۶۲ھ مطابق ۱۷۴۹ء)۔ رند ' امیر مینائی کے شاگرد تھے۔

میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں - شعر صاف ، عاشقانہ خوب کہتے ہیں ، دیوان ان کا نظر سے گزرا : (ص ۲۷)

اغیار سے دیکھ کر ترا ربط
دل میرا جو بے قرار ہوگا
جا بیٹھوں گا در پہ غیر کے میں
کہ یہ بھی نہ ناگوار ہوگا

[تین قطعے اور ہیں]

نالاں ، میر وارث علی

نالاں تخلص ، میر وارث علی(۱) خلف میر ارزانی ، باشندۂ بہار ، شاگرد اشرف خاں فغاں ، صاحب دیوان گزرے : (ص ۲۷)

نالاں جو ایک دن میں کہا اپنے یار سے
ملنا بھی اب ترا مجھے دشوار ہوگیا
میری زباں سے ہونے نہ پایا سخن تمام
بولا ہے وہ جھڑک کے بہت بار ہوگیا

نامی ، مرزا حسام الدین حیدر خان

نامی تخلص ، مرزا حسام الدین حیدر خاں لکھنوی (۲) ولد مرزا محمد غیاث ، شاگرد میر مستحسن خلیق مرثیہ گو(۳) ، شعر ان کے خوب ہوتے ہیں : (ص ۱۰۳)

۱- وطن عظیم آباد ، وفات ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴ء (=میر وارث علی نالاں—بحوالہ گلشن ہند ، حیدری ، ص ۹۵ حاشیہ) - ''شیشہ گری'' پر بسر اوقات تھی ، فغاں بھی کسی قدر '' پرداخت '' کرتے تھے - (گلشن سخن ، ص ۲۳۷)

۲- ''مبارز الدولہ نواب مرزا حسام الدین حیدر خاں دھلوی ، قرابت دار والیٔ لکھنؤ - (سخن شعرا ، ص ۵۰۱)

۳- میر خلیق ، میر حسن کے بیٹے ، ولادت ۱۱۸۲ھ مطابق ۱۷۶۸ء کے قریب ، وفات ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء ، فیض آباد سے فرخ آباد قبل ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء گئے - (دیوان رند ، ص ۱۶۸) سولہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا - (تذکرۂ ہندی ، ص ۹۰)

کیا قطعه بموقع یه پڑھا میں نے کل اپنا
مضطر ایسے دیکھ آتے سر کو سے کسو کے
ہو جاؤگے صورت سے خفا یہ کہوں کیونکر
سوتے ہوئے اٹھ آئے (جو) پہلو سے کسو کے
دل دھڑکے ہے منہ فق ہے، لٹیں بکھری ہیں منہ پر
اے جان نکل بھاگے ہو قابو سے کسو کے

نساخ، عبدالغفور

نساخ تخلص (۱) جامع ارواق، ہیچ میرز، عبدالغفور (۲) غفرلہ ذنوبہ۔ (ص ۲۸)

۱۔ ولادت ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء (= شمس الضحیٰ — بحوالہ گنج تواریخ، ص ۸۰)

۲۔ میرزا ابو محمد عبدالغفور خالدی متخلص بہ نساخ، ڈپوٹی مجسٹریٹ و ڈپوٹی کلکٹر ضلع راجشاہی معروف بہ رامپور بوالیہ ابن منشی قاضی فقیر محمد مرحوم صاحب جامع التواریخ وکیل عدالت عالیہ صدر دیوانی کلکتہ ابن قاضی محمد رضا مغفور متوطن فرید پور باش گزیں دار الامارۃ کلکتہ ابن قاضی محمد شفیع ابن قاضی عبدالشکور ابن قاضی محمد اشرف ابن قاضی عبدالوہاب (بہ عہد اورنگ زیب زمن الاخراج حاصل کر کے '' بارہ کھادہ '' آباد کیا) ابن قاضی عبدالرسول (بہ عہد شاہجہاں، فتح آباد ضلع فرید پور کے قاضی مقرر ہوئے) ابن شاہ عین الدین (متوفی ۱۰۴۰ھ، بہ عہد جہانگیر ۱۰۳۲ھ میں بغداد سے دہلی آئے) ابن شاہ بدیع الدین احمد ابن شاہ احمد ابن محمد قاسم ابن ابو عبداللہ حسین ابن شمس الدین محمد ابن ابو اسماعیل نجم الدین ابن علی ابن عبدالعزیز ابن محمود ابن محمد ابن عبداللہ ابن ابو عبداللہ محمد الملقب بہ ثرالمال عمدۃ الدین معروف بہ ابن القیرانی ابن نصر ابن صغیر ابن داغر ابن محمد ابن خالد ابن نصر ابن داغر ابن عبدالرحمان ابن حضرت مہاجر ابن حضرت سیف اللہ خالد بن ولید رض۔ (نساخ سے وحشت تک، ص ۱۸) - ان کی تصانیف یہ ہیں: سخن شعرا ۱۲۹۱ھ میں، زبان ریختہ ۱۲۷۰ھ میں، دفتر بے مثال (دیوان اول، ناسخ کے دوسرے دیوان کے جواب میں) ۱۲۷۶ھ میں، اشعار نساخ (دیوان دوم) اور ارمغان (تیسرا دیوان) ۱۲۹۲ھ میں، ارمغانی (چوتھا دیوان) ۱۳۰۲ھ میں، مرغوب دل (فارسی رباعیات کا مجموعہ)

(باقی اگلے صفحے پر)

بے وفائی سے رقیبوں کی ہے پچھتانا کیا
معتبر آگے کبھی قول کسی کا نہ ہوا
تم مری باتوں کو مجذوب کی بڑ جانتے تھے
کہیے جو میں نے کہا تھا وہ ہوا یا نہ ہوا

[انیس قطعے اور ہیں]

نصیر ، شاہ نصیر دہلوی

نصیر تخلص ، شاہ نصیرالدین دہلوی عرف میاں کلو ، ولد شاہ غریب‌اللہ سجادہ نشین شاہ صدر جہاں علیہ الرحمہ، شاگرد میر محمدی مایل - آخر عمر میں حسب طلب دیوان چندو لال(۱) حیدر آباد دکھن کو گئے ، وہاں ۱۸۰۲ء میں وفات پائی (۲) - مضامین عالی و تازہ خوب باندھتے تھے ، سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں ان سے بہتر لکھنے والا پیدا ہوا نہیں ، دیوان ان کا نظر سے گزرا : (ص ۳۵)

پوچھا جو میں نے اپنے مسیحائے وقت سے
کچھ بھی ہے یعنی درد دل زار کا علاج

(گزشتہ صفحے سے)
۱۲۸۲ھ میں ، شاہد عشرت (سراپائے معشوق) ۱۲۹۱ھ میں ، گنج تواریخ ۱۲۹۰ھ میں کنز التواریخ ۱۲۹۳ھ میں ، قند فارسی جولائی ۱۸۷۲ء میں، قطعہ منتخب ۱۲۷٦ھ میں، چشمہ فیض (ترجمہ پند نامہ عطار) ۱۸۷۳ء میں ، منتخبات دواوین شعرائے ہند ۱۸٦۴ء میں ، نصرت المسلمین (مذہبی رباعیات بجواب رباعیات مومن) ۱۳۰۳ھ میں ، انتخاب نقص (انیس و دبیر کے کلام کا محاکمہ) ۱۲۹۴ھ میں ، نصاب زبان اردو (برائے کلکتہ یونیورسٹی) ۱۸٦۲ء میں چھپیں - ان کے علاوہ سوانح عمر نساخ ، تذکرۃ المعاصرین (نامکمل) ، مظہر معما ، ترانہ خامہ ، باغ فکر (مقطعات نساخ) بھی لکھیں - (نساخ سے وحشت تک، ص ۳۳ تا ۴۳)

۱- چندو لال شاداں ، ابن لچھمی نراین ، شاہ نصیر کے شاگرد تھے ، (ولادت ۱۱۷۵ھ مطابق ۱۷٦۲ء ، وفات ۱۲٦۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء) - دو دیوان اردو ، ایک دیوان فارسی اور خود نوشت سوانح " عشرت کدہ آفاق " تصنیف کیں -

۲- "چراغ گل" = ۱۲۵۴ھ

بولا نہ درد دل ، نہ تپ عشق ہے تجھے
بیمار ہو تو کیجیے بیمار کا علاج
ہاں ایک وہم ہے سو نہیں آج تک ہوا
لقمان سے بھی وہم کے آزار کا علاج

[نو قطعے اور ہیں]

نظام ، نظام شاہ

نظام تخلص ، نظام شاہ (۱) ، باشندۂ رامپور بریلی : (ص ۳۰)

سبھی دیکھا کیے قطرہ نہ دیا ایک کو بھی
رات پیتے رہے ہم اور بت بے پیر شراب
شمع کی رال ٹپکتی تھی کبھی جام کو دیکھ
مانگتا تھا کبھی منہ کھول کے گلگیر شراب

نظیر اکبر آبادی

نظیر تخلص، ولی محمد اکبر آبادی(۲) ، روضۂ ممتاز محل عرف تاج گنج کے متصل رہتے تھے، بیشتر مخمس و مسدس و ترجیع بند کہتے تھے، کلیات ان کا نظر سے گزرا: (ص ۲۸)

عجب سیر دیکھی نظیر اس چمن کی
ابھی وصل تھا نرگس و نسترن کا
ابھی یک دگر جمع تھے سنبل و گل
ابھی تھا بہم جوش سرو سمن کا

[ردیف لام کا ایک قطعہ اور]

۱- سید نظام شاہ ابن سید احمد شاہ، ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۲ء میں رامپور محلہ گھیر سخی میں پیدا ہوئے، ۲۶ شعبان ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں وفات پائی۔ ('رامپور کے دو شاعر' از محمد علی خاں اثر ، مطبوعہ اردو ادب ، جولائی ۱۹۰۴ء) علی بخش بیمار کے شاگرد تھے ۔

۲- نظیر ابن محمد فاروق ، ولادت ۱۱۵۰ھ مطابق ۱۷۳۰ء میں بمقام دہلی ، وفات ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء میں بہ سبب فالج ہوئی ۔

نکہت ، مرزا نیاز علی بیگ

نکہت تخلص ، مرزا نیاز علی بیگ دہلوی ، شاگرد نصیر دہلوی ، ایک دیوان و ترجمۂ سکندر نامہ (۱) و فرہنگ مصطلحات زبان اردو ان سے یادگار ہیں :
(ص ۱۰۶)

کہکشاں مانگ ہے ، ہلال بھویں
مہر طلعت ہے ، ماہ سیما ہے
لب مسیحا ہے ، لب پہ رنگ مسی
سایۂ قامت مسیحا ہے

نور ، صمصام حیدر

نور تخلص ، منشی صمصام حیدر ، ولد منشی حسن علی ، برادر عم زاد منشی اسد اللہ منحور، باشندہ ہوگلی، مقیم ٹالی گنج کلکتہ، آغاز جوانی میں انتقال کیا ۔ ان کی طبیعت کو شعرگوئی سے نہایت مناسبت تھی، کلام اپنا راقم الحروف کو دکھلاتے تھے :
(ص ۳۷)

قاتل عاشق جو ہے تیغ نگاہ
آپ کو ہے چشم فتاں پر گھمنڈ
کیوں نہ ہو زیبا ہے اے شمشیر زن
تیغ زن کو تیغ براں پر گھمنڈ

واقف ، واقف شاہ

واقف تخلص ، واقف شاہ غازی پوری(۲) ، معاصر سودا و میر ، مقیم دہلی ، کچھ روزوں فیض آباد و بنارس میں رہے تھے، آخر عمر میں لکھنؤ میں وفات پائی ۔
(ص ۱۰۶)

۱۔ سکندر نامے کے ترجمۂ منظوم کو راجہ شیر سنگھ پسر راجہ رنجیت سنگھ والیٔ لاہور کی خدمت میں ایک قصیدے کے ساتھ گزرانا ، واپس آکر پچاس ساٹھ جزو کے قریب ایک فرہنگ مصطلحات زبان اردو تیار کی ۔
(گلستان سخن ، ص ۴۶۵)

۲۔ ''واقف شاہ دہلوی ، نامش میاں عاشوری ، از صغرسن با مادرخود از منسلکان خسر پور ابن مولف بدیع الزماں خاں و هم مکتب ایشاں بود ... بحسن تربیت میر حسین دوست مرادآبادی که معلم خان مذکور بود بهره از علوم رسمیه برداشت و در فیض آباد وحشتی پیدا کرده ترک لباس نموده ... اکنون در لکھنؤ اقامت دارد '' ۔ (گلشن سخن ، ص ۲۰۴)

یاران ہمنشین و رفیقان دوستدار
سب آشنا ہیں زندگی مستعار کے
جب آنکھ مند گئی تو پھر اے دوست بعد مرگ
پھٹکے ہے پاس کون کسی کے مزار کے

وزیر ، خواجہ محمد وزیر

وزیر تخلص، خواجہ محمد وزیر لکھنوی(۱) خلف محمد فقیر نامی، شاگرد امام بخش ناسخ ۔ سلسلہ ان کے نسب کا خواجہ بہاء الدین نقشبندی رحمتہ اللہ علیہ سے ملتا ہے، شعر اچھا کہتے تھے۔ ۲۲ ماہ ذیقعدہ ۱۲۷۰ ہجری میں فوت کی ، دیوان ان کا نظر سے گزرا : (ص ۲۸)

جانے لگا جو بزم سے وہ شہسوار حسن
دریا رواں ہوا مری چشم پر آب کا
مانند موج اسپ نے جب کی شناوری
حلقہ بھنور کا بن گیا حلقہ رکاب کا

[چار قطعے اور ہیں]

ہدایت ، ہدایت اللہ خان

ہدایت تخلص، ہدایت اللہ خاں دہلوی (۲) مرید و شاگرد حضرت خواجہ میر درد قدس سرہ ، شعر صاف و شیریں کہتے تھے ، ۱۲۱۵ ہجری میں انتقال کیا، صاحب دیوان گزرے : (ص ۲۸)

کیا دن تھے وہ بھی آہ ہدایت کہ جن دنوں
راتوں کو اپنے پاس وہ گلفام رہ گیا
مدت ہوئی ہے اب تو ملاقات بھی نہیں
آنے سے بلکہ نامہ و پیغام رہ گیا

۱۔ ولادت قریب ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء ، شادی ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں ، دیوان ''دفتر فصاحت'' ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں مرتب ہوا، ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں چھپنا شروع ہوا ، ذیحجہ ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں مبطع مصطفائی لکھنؤ سے شایع ہوا۔

۲۔ ولادت قریب ۱۱۴۹ھ مطابق ۱۷۳۶ء ، وفات ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۴ء ۔ ان کی تصنیف میں ''رسالہ چراغ ہدایت'' بھی ہے۔

ہمدم ، میر محفوظ علی

ہمدم تخلص ، میر محفوظ علی عظیم آبادی ، مقیم مرشد آباد ، خلف میر محمد حیات حسرت تخلص(۱) ، شاگرد شاہ قدرت اللہ قدرت : (ص ۲۹)

ایک دن مانگا تھا بوسہ میں نے اس سے پیار میں
سنتے ہی اس بات کے غصے ہو فرمانے لگا
کیوں جی تم کرنے لگے ہو اس قدر گستاخیاں
یہ خیال اب آپ کی خاطر میں بھی آنے لگا

ہوس ، نواب محمد تقی خاں

ہوس تخلص ، نواب محمد تقی خاں(۲) خلف نواب مرزا علی خاں(۳) بن نواب سالار جنگ ، باشندہ فیض آباد ، مقیم لکھنؤ ، شاگرد مصحفی(۴) ۔ صاحب تذکرہ ''سراپا سخن'' نے جو لکھا ہے کہ لیلیٰ و مجنوں کے مضمون سے کوئی غزل ان کی خالی نہیں ، محض غلط ہے۔ اشعار ان کے بحر متقارب و متدارک(۵) میں بہت خوب ہوتے ہیں ، ان کی مثنوی ''لیلیٰ و مجنوں'' و دیوان نظر سے گزرے۔(ص ۲۹)

ہر چند وہ سوئے مری چھاتی سے لپٹ کر
لیکن مجھے اس رات بھی آرام نہ آیا
دھڑکے سے شب ہجر کے مضطر ہی رہا میں
کچھ وصل کی لذت کا مزا میں نے نہ پایا

۱۔ حسرت مخاطب بہ ہیبت قلی خاں ، متوفی ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۵ء میر باقر حزیں کے بہنوئی تھے ۔

۲۔ ولادت قریب ۱۱۸۱ھ مطابق ۱۷۶۷ء ' (ریاض الفصحا ، ص ۳۶۷) وفات ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء ۔

۳۔ مرزا علی خاں برادر بہو بیگم مادر آصف الدولہ ۔

۴۔ پہلے میر حسن کے شاگرد تھے پھر مصحفی سے اصلاح لی ۔

۵۔ بحر متقارب و متدارک شانزدہ رکنی ۔ (سخن شعرا ، ص ۵۶۴)

خاتمه الطبع

داور داد گر ستائش که این زیبا گلدستهٔ جان نواز ، مجموعهٔ قطعات اساتذهٔ اردو زبان موسوم به قطعهٔ منتخب در مطبع نامی گرامی جناب معلیٰ القاب منشی نول کشور لکھنؤ بماه جولائی ۱۸۷۴ء مطابق شهر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۱ هجری از قالب طبع برآمده مشام آرائے جهان گردید -

✤✤✤✤

لغت کبیر اردو

مؤلفہ
بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم

(قسط ۱۱)

آزردہ ــ تا ــ آستین میں سانپ پالنا

آزردہ (ص) ۱- ناخوش ، خفا ، ناراض ، رنجیدہ - م : فقیر اور یتیم کو آزردہ کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے ۔-۲-افسردہ، اداس ، ملول ، حزیں ، شکستہ دل -

آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا
تم حرف سر کرو گے ہم گریہ سرکریں گے
(میر)

[ف: آزردہ - آزُردن ، آزَردن ، آزار سے - اوستا : آزری تا - سریانی جدید : آزوردا - آذر بائجانی ، ترکی : آزوردِہ]

— خاطر (ص) ۱- دل شکستہ ، مایوس - ۲- غمگین ، ملول - م : آپ کسی طرح کا خوف نہ کریں اور نہ آزردہ خاطر ہوں - (تق نذ صفحہ ۳۰ے)

[عف: آزردہ (ف) + خاطر (ع)]

— خاطری (مث) ۱ - دل شکستگی ، مایوسی - م : کسی کی آزردہ خاطری کو دیکھ نہیں سکتے تھے - ۲- ناراضی ، ناخوشی - م : آزردہ خاطری سے اجازت دی تو کیا دی- [عف : آزردہ خاطر + ی (لا حقہ اسم)]

— دل (ص) دیکھو " آزردہ خاطر " :

آزردہ دل کو حرف پہ لانے کا لطف کیا
(میر)

[ف : آزردہ + دل]

— دلی (مث) دیکھو " آزردہ خاطری " -

آزری (ص) ۱ - منسوب بہ آزر (بت تراش) - (دیکھو : آذر) ۲ - باکمال بت تراش کا بنایا ہوا - ۳ - نہایت خوبصورت جیسے بتان آذری میں - [ف : آزر (آذر) + ی]

آزقہ (مذ) دیکھو ''آذوقہ'' اور ''آزوقہ'' - م: چنانچہ تلاش آزقہ میں صاحبقران سمت کوہ روانہ ہوا - (۸ - بوستان خیال ، صفحہ ۲۵۸)

آزما (لاحقہ) ۱ - آزمانے ، تجربہ کرنے ، امتحان لینے والا

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
(غالب)

[ف: مصدر ''آزمودن'' کا امر اور لاحقہ فاعلی]

بطور لاحقہ صرف فارسی ترکیبوں میں استعمال ہوتا ہے -

— **دیکھنا** (ف م) امتحان کر کے تجربہ کر لینا ، کسوٹی پر کس کر دیکھ لینا ، امتحان کر لینا ، جانچ ڈالنا -

ہم نے یاروں کو آزما دیکھا
سب کو مطلب کا آشنا دیکھا
(نادان)

— **لینا** (ف م) دیکھو '' آزمانا '' جس کی یہ تکمیل فعل ہے -

آزمانا (ف م) امتحان کرنا ، جانچنا ، پرکھنا -

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
(غالب)

م : اگر تم کو کچھ شبہ ہے تو مجھ کو ہر طرح آزما سکتے ہو (۱- الف لیلہ حیرت ، صفحہ ۲۳) - ۲- کر کے دیکھنا ، عمل میں لانا ، کرنا - م : ڈاکٹری علاج کو بھی آزمایا کچھ مفید نہ پایا - ۳- دو دو ہاتھ کرنا ، بل دیکھنا ، زور کرنا ، طاقت کرنا - م : کچھ بل کی

رکھتے ہو تو آؤ آزما لو ۔ م ۔ ایمان ، صبر و استقلال وغیرہ کا امتحان لینا ' ابتلا میں ڈالنا ۔ م: خدا کسی کو نہ آزمائے اور ان کو بھی اس آزمائش سے نجات دے ۔ [فارسی مصدر ''آزمودن'' کے امر آزما سے آردو مصدر بنایا گیا ہے ۔ دیکھو ' آزمائش ']

آزمائش — (مث) ۱۔ تجربہ ، جانچ پڑتال ' امتحان۔

حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایان چمن کی آزمائش ہے
(غالب)

۲۔ پرکھنے کا قاعدہ ، ثبوت صحت ' کسوٹی ، پرکھ ، نشانی ، م : ہیرے کی آزمائش یہ ہے کہ نیلے کپڑے پر کھینچو تو سفید لکیر پڑجائے گی ۔ ۳ ۔ سختی ، مصیبت ، ابتلا ۔ م: خدا کسی کو آزمائش میں نہ ڈالے ۔ ۴۔ نمونہ ، بانگی ۔ م : یہ امتحان تو فقط آزمائش تھی پورے جوہر پاس رکھنے پرکھلیں گے ۔ (کرنا' ہونا) [ف : آزمائش، آزمودن ۔ پہلوی: اوزمای شن' آزمای شن' اوزموتن ۔ اوستا: آما (آزمودہ : آماتہ) ۔ مادہ : م ا ' بمعنی ناپنا ' بانٹنا ' پیدا ہونا]

— دینا — (ف م) نمونہ دکھانا ۔

پڑے پھرتے ہیں کیا کیا کبک و قمری صحن گلشن میں
خرام ناز کو تم بھی تو اپنے آزمائش دو
(نادان)

— کرنا — (ف ل) دیکھو: آزمانا ۔ م : فرمایا گیا ہے کہ تو اپنے خداوند کی آزمائش نہ کر ۔ (لوقا کی انجیل)

— میں پڑنا — (ف ل) مصیبت میں مبتلا ہونا ، ابتلا میں پڑنا ۔ م: تم سوتے کیوں ہو اٹھ کر دعا مانگو تا کہ آزمائش میں نہ پڑو ۔ (باب ۲۲ ۔ لوقا آیت صفحہ ۴۶)

— میں ٹھہرنا (ٹھہرنا) (ف ل) تجربے میں، امتحان میں پورا اترنا، امتحان کی تاب لانا ۔ م : آزمائش میں ٹھہر جائے تب بات ہے ۔

— میں ڈالنا (ف م) ۱۔ صبر و استقلال کا امتحان کرنا ۔ ۲۔ مصیبت میں مبتلا کرنا، برا وقت ڈالنا ۔ م : عاشق اپنا وقت تجربوں میں ضائع نہیں کرتے اپنی معشوقہ کو آزمائش میں نہیں ڈالتے ۔ (بغداد کا جوہری، صفحہ ۱۰۰)

— میں ہونا (ف ل) ۱۔ زیر امتحان و تجربہ ہونا ۔ م : نسخہ تیار تو ہوگیا ہے مگر ہنوز آزمائش میں ہے ۔ ۲۔ مصیبت و ابتلا میں ہونا ۔ م : بے چارے بڑی آزمائش میں ہیں ۔

آزمائشاً (مف) (عوام) تجربے کے لیے، امتحاناً ۔ م : حسن افروز کا کہنا نہ مان کر آزمائشاً آن دوستوں کے پاس گیا ۔ (الف لیلہ، حیرت، صفحہ ۶۹)، [عربی قاعدے کے مطابق خلاف قاعدہ فارسی اسم کے آخر میں تنوین لگائی گئی ہے]

آزمائشی (ص) جس کا مقصد پیشگی تجربہ یا امتحان ہو، بانگی دیکھنے کا، اندازہ قابلیت کا، جیسے آزمائشی امتحان ۔ [ف : آزمائش + ی (وصفی)]

— امتحان (مذ) وہ جانچ یا امتحان قابلیت کا جو آخری یا سالانہ امتحان سے پہلے طلبہ کی لیاقت کا اندازہ کرنے کے لیے لیا جاتا ہے ۔ امتحان کی قابلیت کی جانچ، پیشگی امتحان ۔ م : آزمائشی امتحان میں فیل ہوجائے تو سالانہ امتحان میں شریک نہیں کیا جاتا ۔ [فع : آزمائشی + امتحان (ع)]

آزمایا (ص) آزمایا ہوا، آزمودہ، مجرب ۔ م : آزمائے کو آزمانا جہل ہے ۔

آزمایش (مت) دیکھو : آزمائش

زمودہ (ص) جس کا امتحان کر لیا گیا ہو ، آزمایا ہوا ، پرکھا پرکھایا ، مجرب ۔ م : یہ نسخہ بہت لوگوں کا آزمودہ ہے ۔ ۲۔ تجربہ کار ، مجرب ، پختہ ۔ م : پرانے آزمودہ آدمی ہیں ان کی صلاح ضرور لے لو ۔ ۳۔ منشاء عندیہ (لینا کے ساتھ) ۔ م : ان کا آزمودہ بھی لے چکے ہو (عوام) ۔ [ف : آزمودہ ۔ پہلوی : آ ز م و د ہ ۔ دیکھو : آزمائش ۔ اوستا : آما (آزمودن) اماتہ (آزمودہ) اصل کلمہ ''ما'' ہے اور آمزیدن بمعنی ناپنا] ۔

— کار (ص) وہ جو گرم و سرد زمانہ کو دیکھ چکا ہو ، تجربہ کار ، دانائے کار ، کارداں ، پختہ ، دانا ، واقف :

ساتھ کچھ آزمودہ کار کریں
تا وہ آگاہ کار زار کریں (قلق لکھنوی)

[ف : آزمودہ + کار]

— کاری (مث) تجربہ کار ہونا ، تجربہ کاری ۔ م : سپہ سالار کی آزمودہ کاری کچھ کام نہ آئی ۔

[ف : آزمودہ + کار + ی (لاحقہ اسم)]

— لینا (فم) (عوام) منشا یا عندیہ معلوم کرنا ، ٹوہ لینا ۔ م : آزمودہ لیا تو سو روپے تک بیچنے پر اس کو رضامند پایا ۔

زموں (مذ) عمل یا تجربہ (طبیعیات) ۔ [ف : آزمودن کا کا حاصل مصدر ۔ دیکھو : آزمائش]

— گاہ (مث) تجربوں کی جگہ ، تجربہ گاہ ، معمل ، تجربہ خانہ ۔

آزو بازو (مذ) (عوام) ۱۔ دونوں بازو جیسے چوکھٹ کے آزو بازو ۔ ۲۔ (مف) دائیں بائیں ، ادھر ادھر ، دونوں طرف ۔ م : آزو بازو وزیر بیچ میں بادشاہ ۔

[آزو (تابع مہمل) + بازو (ف)]

ازوقہ (مذ) ۱۔ دیکھو : آذوقہ ۔ ۲ ۔ جنس غلہ وغیرہ ' سامان خورد و نوش ۔ م : اور آٹھ دن کا آزوقہ اکھٹا دے جاتی ہوں ۔ (باغ و بہار ' صفحہ ۱۵۶) [ف : دیکھو: آذوقہ]

آس (مث) دھان سے مشابہ اگنے والی ایک گھاس جس کے ڈنٹھل سیاہ و سخت ہوتے ہیں ' خون بند کرنے میں مفید ۔ [ہ]

آسی (مث) (عو) بگاڑ لفظ عائشہ کا ' جیسے آس بی بی کی تکیاں ' آس بی بی کی نیاز ۔

آس (مث) ۱۔ گھومنے والی چکی ، ہاتھ سے چلتی ہو خواہ بجلی ' ہوا ' پانی وغیرہ کے ذریعے ۔ آسیا ' گھرنی ' (ف ۔ دیکھو: آسیا) ۲۔ نام ایک پودے کا جس کے بیج کو حب الاس کہتے ہیں ' مرادف = مورد ۔

— کرنا (ف م) ۱۔ پیسنا ' آٹا کرنا ۔ (شاذ)

لے کے انگشتری کا وہ الماس
پھانک بیٹھی کھرل میں کر کے آس

— ہونا (ف ل) ۱ ۔ (شاذ) پس جانا ' پسنا ' آٹا یا میدا سا ہو جانا ۔

آس (مث) ۱۔ دلی تمنا ' حسرت ' ارمان ' خواہش ' آرزو ' مراد :

کنیا تھی غرض کہ راس اس کی
پوری نہ ہوئی یہ آس اس کی (گلزار نسیم)

۲۔ بھروسا ' اعتماد ۔ م: دور گئے کی آس کیا ۔ ۳۔ امید و توقع :

جیوں میں کیوں کہ جو ملنے کی اس کے آس نہ ہو
(مصحفی)

۴۔ اڑواڑا ' ٹیکن ' پشتہ ' سہارا ۔ م: آس دے کر ستون

کھڑا کیا ۔ ۴۔ ڈھارس ، تقویت ، برتا ، تکیہ :

ہر دم ہم کو وا کی آس
آٹھ پہر وہ رہوت پاس

(مکری)

۵۔ (موسیقی) ہم آہنگی ، ہم سری ، ساتھ ۔ م : سر کی آس کے لیے سارنگی ہو ۔ (۳۔ فسانۂ آزاد ، صفحہ ۱۰۱) ۶۔ آل اولاد ، بال بچے ۔ م : اپنی آس کے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھا کہ تو نے نہیں کہا ۔ م : نہیں آگے ہمارے کچھ آس ، ان کا بیاہ کرلو ۔ (روپ بسنت)۔ ۷۔ بال بچہ ہونے کی امید ، حمل ، پیٹ ، جیسے "آس والی" میں ۔ م : بہو کو آس ہے ۔ ۸۔ امید جینے کی ، توقع (بچنے کی) :

یوں خدا کی خدائی پر حق ہے
پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

(میر اثر)

صبح آنے کا اس کے وعدہ ہے
پر مجھے رات بھر کی آس کہاں

(بیان)

[ہ : آس ، آسا — س : آشا ۔ پ : آسا]

— اولاد (مذ) بال بچے ۔ م : آس اولاد کی قسم ۔

— اولاد پر پڑنا (ف ل) عزیز بال بچوں پر سخت بھاری ہونا ، کچوں بچوں کو لگنا ۔ م : تمھارا کوسنا تمھاری ہی آس اولاد پر پڑے گا ۔ (عو)

— اولاد کے آگے آنا (ف ل) (عو ۔ کوسنا) بال بچوں پر اس کا نتیجہ عائد ہونا یا ان پر سراپ پڑنا ، بددعا لگنا ۔ م: جیسا تو نے ہمارے ساتھ کیا الہی تیری آس اولاد کے آگے آوے ۔

— اولاد والی (ص مث) ۱۔ بال بچوں والی ، صاحب اولاد ، بال و فرزند والی ۔ ۲۔ صاحب نصیب بیوی ۔ م: آس اولاد والی ایسے کیا لالچ تھا وہ جھوٹی قسم کیوں کھائی ۔

— باندھنا (ف م) ۱۔ امید لگانا ، امیدواری کرنا ۔ ۲۔ بھروسا کرنا ۔

م: خدا کی آس باندھے بندے کی آس نہ باندھے -

آس والوں کی تو اللہ مرے آس نہ توڑ
آس باندھے ہوئے بیٹھے ہیں یہ تیرے در پر
(سرور)

۳- منتظر رہنا ، راہ تکنا- م: دن بھر آس باندھے بیٹھی رہی وہ رات تک بھی نہ آیا - ۴ - ہمت باندھنا ، دلاسا دینا ، جی دینا - م : آپ نے اس کی آس باندھی ورنہ وہ تو جی چھوڑ چکا تھا -

— بندھانا (ف م) دیکھو : آس باندھنا معنی نمبر (۴) - م: آپ نے اس کی آس بندھائی ورنہ وہ تو جی چھوڑ چکا تھا -

مری آس حرماں بندیاھا کرے
تمنا کی حسرت نہ آیا کرے
(مومن)

— بندھنا (ف ل) دیکھو : ' آس باندھنا ' جس کا یہ لازم ہے-

مرض عشق سے بچے ہی نہ دیکھا کوئی
کیا تری آس ہمیں اے دل بیمار بندھے
(کیف)

— پوری کرنا (ف ل) ۱- مراد دینا ، امید دلانا - ۲- اولاد دینا -

آس پوری کرے خدا تیری
گود جلدی بھرے خدا تیری
(مصحفی)

— پوری ہونا (ف ل) امید بر آنا، آرزو پوری ہونا -

کنیا تھی غرض کہ راس اس کی
پوری نہ ہوئی وہ آس اس کی
(گلزار نسیم)

— توڑنا (ف م) امید چھوڑنا ، مایوس ہونا -

— تکنا (ف ل) ۱- امیدوار ہونا ، متوقع رہنا - ۲- بھروسا کرنا - م: آس پرائی جو تکے وہ جیتا ہی مرجائے- ۳ - انتظار کھینچنا ، راہ دیکھنا -

آس تمہاری تک رہی آئے تم گوند این
رہو ہمارے محل تو آج آڑاؤ چین
(روپ بسنت ناٹک)

— ٹوٹنا (ف ل) ۱۔ یاس قطعی، بالکل نا امیدی ہونا۔م: وہ ملاقاتیں کہ جن کی مدت سے آس ٹوٹ چکی تھی۔ (۳۔ الف لیلہ، حیرت ، صفحہ ۱۰۳)

کیسی قسمت ہماری پھوٹ گئی
آس ملنے کی تیرے ٹوٹ گئی
(مومن)

۲۔ جی ہار نا ، ہمت چھوڑنا۔

ٹوٹے نہ آس ہر گز ہوں آشنا فغاں کا
لٹو ترا بنے گا اس میرے استخواں کا
(امیر)

— توڑ بیٹھنا (ف ل) ۱۔ مایوس ہوکر رہ جانا ۔ ۲۔ ہمت ہار دینا ۔ م : جب وہ بالکل آس توڑ بیٹھیں گے تو میں ہی انھیں خوش خبری دونگا ۔ (ح—ف، صفحہ ۳۰)

— توڑنا (ف م) ۱۔ مایوس کرنا ، نا امید کرنا۔ ۲۔ جی چھڑانا، کمر توڑنا۔

جو کچھ چاہو ہے اپنے داتا کے پاس
بھلا آس سے کیوں توڑیے اپنی آس (انشا)

۳۔ جی ہارنا، ہمت چھوڑنا۔ م : مرد ہوکر آس نہ توڑنی چاہیے ۔ م : آن پر کسی قسم کا وبال آ جائے تو وہ آس توڑ بیٹھتے ہیں۔ (تق ، نذیر احمد، صفحہ ۹۴۷)

— چھوٹ جانا، چھوٹنا (ف ل) ۱۔ نا امید ہوجانا، آس ٹوٹنا۔ ۲۔ زندگی کی توقع نہ رہنا ۔ م : کئی بار بیچ میں آس ٹوٹ ٹوٹ گئی لیکن ہم نے علاج نہیں چھوڑا ۔

— چھوڑنا (ف م) دیکھو: آس چھوٹنا، جس کا یہ فعل متعدی ہے۔ م : آس نہ چھوڑنی چاہیے علاج و تدبیر کرتے رہنا چاہیے۔

— دکھانا (ف م) انتظار کرانا ، بھروسے میں رکھنا ، امیدواری کرانا۔ م : مدتوں آس دکھا کر ٹکا سا جواب دے دیا۔

— دلانا (ف م) دیکھو: آس بندھانا۔

— دینا (ف م) ۱۔ امید بندھانا، ہمت دلانا ، ڈھارس باندھنا۔ م : اس مایوسی میں جس نے آس دی وہ آسی کا تصور تھا۔ ۲۔ اڑواڑا لگانا ، ستکا لگانا ، ٹیکن دینا، اڑیکن لگانا۔ م : آس دے دے کر ستون کو سیدھا کھڑا کیا۔ ۳۔ مراد عطا کرنا ، گود بھرنا۔ م : آخر خدا نے آس کی آس دی۔ ۴۔ (موسیقی) اصل گانے کے ساتھ کھرج یا دوسرے سروں کو گلے یا ساز کی آواز سے مدد دینا، راگ میں سر ملانا ، ہم آہنگی کرنا۔ م: جسے باجے پر گانے کی عادت ہو وہ بغیر آس دیے نہیں گا سکتا۔ م : ستار ہے تو بہت خوب صورت مگر آس اچھی نہیں دیتا۔

— رکھنا (ف م) ۱۔ خواہش کرنا۔ ۲۔ امیدوار رہنا، امید کرنا۔ ۳۔ بھروسا رکھنا۔ م : پھر مغفرت کی آس بھی رکھتے ہیں۔

کیا تری شان ہے قربان ہوں ترے عفو کریم
آس رکھتا ہے ہر اک فاسق و زانی تیری
(آتش)

— سے ہونا (ف ل) عو۔ پیٹ سے ہونا ، حاملہ ہونا۔ م : ساس بہو دونوں آس سے ہیں۔

— کا نام دنیا ہے (کہاوت) دنیا امید کا نام ہے یعنی امید سے دنیا

کے کاروبار چل رہے ہیں ، مرادف : دنیا بہ امید قائم -

— کرنا (ف م) ۱- خواہش کرنا، مانگنا - م : خدا کی آس کرے جو دین دنیا دونوں پائے - ۲- امیدواری کرنا، امید پالنا، امید کرنا - م : خدا کے خوف سے ڈرتے اور اس کی مغفرت کی آس کرتے ہیں - ۳- بھروسے میں رہنا ، اعتماد کرنا - م : نوج ایسوں کی کوئی آس کرے جو وقت پر آنکھیں پھیر لیں -

— لگانا (ف م) ۱- امید باندھنا، امیدوں میں بسر کرنا ، متوقع رہنا - م : اتنے دن آس لگائی تو کیا پایا- ۲. گانے باجے میں ہم آہنگی کرنا ، راگ میں سر ملانا - : بیوی گاتی میاں آس لگاتے ہیں- ۳- اڑواڑا دینا، ٹیکن لگانا - م : آس لگا کر ستون کو تھاما - ۴- دیکھو : آس رکھنا ، آس کرنا -

— لینا (ف م) سہارا لینا، مدد پانا - م : آس لیے بغیر گا نہیں سکتا - (موسیقی)

— مراد (مث) عو - دیکھو : آس معنی نمبر (۷) - ۱- آل اولاد، ۲- دلی مقصد - م : جو مجھ غریب کو ستائے وہ بھی اپنی آس مراد کو نہ پہنچے - (کوسنا)

— مراد کا (ص مذ) ۱- منتوں مرادوں سے پیدا شدہ اور پالا پوسا، اللہ آمین کا ، ارمانوں کا- ۲- اکلوتا، عزیز، لاڈلا- م: آس مراد کا بچہ ' تو اسے کوستی ہے؟

— مراد کی (ص مث) دیکھو : آس مراد ، کا جس کی یہ تانیث ہے- م : آس مراد کی ایک بچی ، اس کو تو کوستی ہے؟

— مراد والی (ص مث) ۱- دولت اور اولاد والی- ۲- صاحب نصیب بی بی - م : ہے کوئی آس مراد والی جو فقیر کی جھولی بھردے ! (صدائے فقیر) - ۳- دیکھو: آس مرادوں کی مانی -

مرادوں کی مانی (ص مث) ۱. منتوں سے پیدا ہوئی اور اللہ آمین کی ہلی، اللہ آمین کی لڑکی :

ماں باپ کی پیاری ناز بھری آنکھوں آگے نسدن پھرتی
لت رہتی ہاتھوں چھاؤں میں اور مانی آس مرادوں کی
(نظیر)

— منانا (ف م) امید میں خوش خوش اور شاد شاد ہونا۔ م : جن کے آنے کی آس منا رہے تھے وہ رستے میں راہی ملک عدم ہوئے۔

— میں رهنا (ف ل) دوسرے سے امید و انتظار میں یا بھروسے پر رهنا اور کچھ نہ کرنا۔ م: جو آس میں رہے وہ آس میں ہی رہ گئے اور جنھوں نے ہاتھ پاؤں مارے وہ کامیاب ہوگئے۔

— والے (ص) ۱- امیدوار کرم۔ ۲- اهل تمنا و آرزو۔ ۳- مراد مند :

آس والوں کی تو اللہ مرے آس نہ توڑ
آس باندھے ہوئے بیٹھے ہیں یہ تیرے در پر (سرور)

آس پاس (مف) (آس تابع مہمل) گردا گرد، چوطرف، چوگرد، اطراف :

چنی جڑی ہو جیسے نگینے کے آس پاس (شاداں)

م : آس پاس ستارے بیچ میں چاند۔ ۲- پاس پڑوس میں، قرب و جوار میں، نزدیک قریب، دھورے۔ م : غیرت اور شرم کے تو وہ آس پاس بھی نہیں۔

گرد سر یار کے پھریں پھروں
ہم جو ہوں اس کے آس پاس کہیں (میر)

۳- (اسم) پاس پڑوس، قرب و جوار۔ م : نورالدین کی وزارت وہ چمکی کہ آس پاس کے شہروں میں دھوم مچ گئی۔ (الف لیلہ، حیرت، صفحہ ۷۲) م : آس پاس کے

لوگ اکٹھے ہو گئے - ۴- اہل قرب، ساتھی، ہمراہی، پڑوسی - م : اکیلے نہیں ڈوبیں گے ڈوبے تو آس پاس تک کو لے ڈوبیں گے۔

[۰ : آس پاس - س: آسن + پارشو - پ: آسیہ + پاس]

— نہ کرنا (فم) مروت، لحاظ، پروا وغیرہ نہ کرنا - م: وہ کسی کا آس پاس نہیں کرتے اپنے فائدے سے غرض رکھتے ہیں ا

— برسے دلی پڑی ترسے (مثل) ۱- لفظاً، ہر طرف بارش ہو اور دلی میں ایک قطرہ نہ پڑے - ۲- سب مستفید ہوں مگر اصل حقدار محروم منہ دیکھا کریں - م : سب کے لیے تحفے تحائف سوغات، غریب بیوی کے لیے کچھ نہیں، آس پاس برسے، اور دلی پڑی ترسے -

— پھرنا (فل) چوگرد چکر لگانا، طواف کرنا، صدقے ہونا :

کافر ہے کون ہم میں سے مومن پھرے ہے تو
کعبے کے آس پاس تو ہیں دل کے آس پاس
(مومن)

۲- زیادہ قریب نہ پھٹکنا، لگا نہ کھانا، الگ الگ رھنا :

دور سے جلتے ہیں پر جبریل
عقل کل آس پاس پھرتی ہے (نادان)

آس نہ پاس (مف) قرب و جوار میں بھی نہیں، پڑوس تک میں ندارد، بالکل مفقود - م : مروت تو ان کے کہیں آس نہ پاس -

آسا (مث) ۱- امید، بھروسا :

مایا مرے نہ من مرے مر مر گئے سریر
آسا ترشنا نا مرے کہہ گئے داس کبیر

۲۔ انتظار ، امیدواری ۔ م : تمھاری آسا میں کب تک بیٹھے رہے ۔ ۳ ۔ (ص) امید رکھنے والا ، پر امید ۔ م: بہت سے دنیا کے درد ہیں کہ امید نہ ہوتو ہرگز نہ جھیلے جائیں ' آسا جیے نراسا مرے (نیرنگ خیال ، صفحہ ۳۴) [ہ: آسا ۔ س : آشا ۔ پ : آسا]

— مناتا (فم) امید و توقع اور انتظار میں دن کاٹنا ۔ م: یہاں تو یہ سال آیندہ کی آسا منانے لگے ، اب اس جہاز کا احوال سننے کے قابل ہے ۔ (۲۔ الف لیلہ ، حیرت ، صفحہ ۱۵)

— لگانا (ف م) دیکھو ' آس لگانا '

شاد کو بھی نجف میں بلواؤ

یہ لگائے ہے ہو تراب آسا

(شاد لکھنوی)

— لگنا (فل) 'آسا لگانا' کا فعل لازم :

تمھاری آسا لگی ہے نسدن تمھارے درشن کو ترسیں نیناں

(نظیر)

آسا (مث) پورب (عو) ۔ عائشہ کا گنواری تلفظ حضرت بی بی عائشہ رض کا ۔

— کا چھلا (مذ) (عو) عورتیں آسا بی کے نام کا چھلا دھوکر مراد مانتے وقت پانی میں رکھ لیتی ہیں اور مراد پوری ہونے پر اس کی چاندی بیچ کر مٹھائی پر نیاز دلاتی ہیں :

چھلا اٹھاؤ دھو کے بی آسا کے نام کا

(جان صاحب)

— کا کاسہ (عو) ایک منت ہے جس میں مراد پوری ہونے پر حضرت عائشہ رض کے نام کی نیاز شیرینی وغیرہ کے کاسے یا کونڈے پر دلائی جاتی ہے (پورب) ۔ لکھنؤ میں اس کا نام رہ گیا ہے ، نیاز حضرت فاطمہ زہرا رضی‌اللہ تعالیٰ عنہا کی دلاتے ہیں ۔

— کے گاگلے (عو) وہ گلگلے یا میٹھا پکوان جس پر حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی نیاز دلائی جاتی ہے اور صرف عورتیں اس کو کھا سکتی ہیں۔

کھا گئے گلگلے یہ آسا کے
ٹوٹیں ٹانگیں جو چوبدار کرے
(جان صاحب)

آسا (مث) ایک راگنی کا نام جو صبح کے وقت گائی جاتی ہے (ہ) ۲۔ (عوام) عصا کا بگاڑ۔ م: ستر گز کا آسا تھا اور ستر گز کے موسیٰ۔

آسا حرف تشبیہ، مانند، مثل، طرح، سا۔ م: یہ لفظ فارسی مرکبات میں بطور لاحقہ مستعمل ہے جیسے حباب آسا، فلک آسا۔

شمع آسا کبھی جلتے کبھی روتے گزری
آگ پانی سے بنایا ہے خدا نے ہم کو (امیر)

[ف: (لاحقہ) = مانند — دیکھو 'سان' — ہ: سا]

آساڑھ (مذ) دیکھو: اساڑھ — [ہ: اساڑھ — س: آشاڈھ پ: آساڈھ]

آساڑھی (ص، مث) دیکھو: اساڑھی

آسامی (ص) ۱۔ ملک آسام سے متعلق۔ ۲۔ ملک آسام کی زبان۔

آسامی (مث) ۱۔ دیکھو 'اسامی' جس کا یہ بگاڑ ہے۔

اڑتی ہر رہرو الفت پہ نہیں اس کی نگاہ
ڈھونڈتا ہے کوئی آسامی وہ رہزن اونچی (ظفر)

آسان (ص) ۱۔ غیر مشکل، بےکٹھن، سہل، جیسے آسان کام۔ م: نیت ثابت منزل آسان (مثل)۔ ۲۔ سریع الفہم، غیر مغلق، سلیس (عبارت کلام وغیرہ)۔

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل (غالب)

۳- ہون ہار، ممکن- م: روپے کے آگے سب کچھ آسان ہے- ۴- کم مقدار ، تھوڑی، ہلکی، کم - م : قسطیں ایسی آسان رکھیں کہ بار نہ معلوم ہو- ۵- معمولی بات ، دقت سے خالی یا بے خطر و بے ضرر وغیرہ :

آساں نہیں ہے رشتۂ الفت کا توڑنا

۶- سریع الحصول، بغیر تکلیف کے حاصل ہونے والا :

ملنا نہیں اگر ترا آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں (غالب)

۷- (مف) (کرنا ، ہونا) آسانی سے ' بہ آسانی - ۱- (الف) بے اذیت، آرام سے (ب) بے تکلیف و تکلف ، رسان سے ، آہستہ ، سہج -

مر گئے مرغ قفس کیا آسان
پاؤں پھیلائے نہ بازو پھڑکے

۸- بے تامل ، بے تکلف- م : کیا آسان کہہ دیا کہ نشتر دلوالو ، یہ نہ سوچا کہ نشتر میں تکلیف کتنی ہوتی ہے؟ (جز و ترکیبی و لاحقہ) (الف) بمعنی آسان کرنے والا ، جیسے ''قرآن آسان قاعدہ'' - (ب) آسائش دینے والا ، جیسے تن آسان میں -

[ف : آسان - پہلوی : آسانیہ (فرھنگ بن دھنش) ا س پ ے ن (ھارن) - زند : آ س ا ن ش- اوستا : ا س پ ے ن ، ا س پ ے ن ہ- بمعنی خوشی، آسائش، خوشحالی - (س ی ن) بمعنی ترقی دینا ، بڑھنا- مادہ: (س پ ی ن) بڑھ کر بڑا ہونا - (لغوی معنی) پھولنا ، پھینکنا ، لٹکانا - بلوچی و مکرانی : آسان-
پشتو: آسان- ترکی: اسان- کردی: ھاسان]

۲۔ آسان — (مذ) بے تکلف جلدی اور روانی کے ساتھ ہوجانے والا کام یا طریق وغیرہ ۔ م : آسان کو چھوڑ کر مشکل کو اختیار کرنا عقل مندی سے بعید ہے۔

— چھوٹنا — (ف ل) ۱۔ سستا چھوٹنا ، مفت نجات پانا ۔ م : آسان نہ چھوٹو گے ، رتی رتی کا حساب دینا ہوگا ۔

کرنا — (ف م) ۱۔ کٹھن نکال دینا، دشوار نہ رکھنا ۔ م : لوہے کے چنوں کا چبانا اسان کر دیا۔ ۲۔ سلجھانا، کھولنا ۔ م : اس معاملے میں بڑا پیچ آ پڑا تھا تم نے آسان کر دیا ۔ ۳۔ (بوجھ) آتارنا ، ہلکا کرنا ۔ م : قرض کا بھی بڑا بوجھ تھا خدا نے آسان کر دیا ۔ ۴۔ حل کرنا، پانی کر دینا ۔ م : حساب کی مشکل کو قاعدے اور پہاڑے ہی آسان کرتے ہیں بغیر اُن کے کام نہیں چلتا۔ ۵۔ پیچیدگی رفع کرنا ۔ م : کام کیسا ہی مشکل ہو، محنت بالآخر آسان کر دیتی ہے۔ ۶۔ بیڑا پار لگانا، مشکل سہل کرنا ، اڑی نکالنا۔ م: خدا سب کی مشکل آسان کرے ۔

— ہونا — (ف ل) ۱۔ سہل ہونا، کٹھن نہ ہونا ۔ م : مسلسل محنت سے بالآخر ہر کام آسان ہو جاتا ہے ۔ ۲۔ سہل الحصول ہونا ، ممکن ہونا ، قبضے کی بات ہونا :

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا (غالب)

۳۔ صاف ہوجانا، حل ہوجانا، پیچیدہ نہ رہنا، کھل جانا۔ م : اب تو یہ عقدہ آسان ہوگیا ۔ ۴۔ اہم نہ رہنا، معمولی بات ہونا ۔ م : مار ڈالنا کیا آسان ہو گیا کہ بات بات پر اس کی دھمکی دینے لگے ۔ ۵۔ گراں نہ ہونا، گوارا ہونا ۔ م : اپنی برائی سننا ایسا آسان نہیں جیسے غیر کی برائی سننا۔

آسانی — (مث) دشواری کی ضد ۔ ۱۔ سہولت ۔ م : ڈھیلے پائینچے کے اتارنے چڑھانے میں آسانی رہتی ہے۔ ۲۔ آرام،

آسائش - م : آج کل سفر میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔ ۳۔ فراخی ، فراغت ، مرفہ الحالی - م : تو فراخی اور آسانی میں خدا کی طرف متوجہ ہو۔ (ح - ف) ۴۔ عدم دقت ، سہل پن ، سلاست - م: شعر میں اتنی آسانی بھی پسندیدہ نہیں کہ دماغ پر کچھ زور ہی نہ پڑے۔ ۵۔ (لاحقہ) جیسے تن آسانی میں بمعنی تن پروری (مصادر : آنا، پانا، کرنا، ملنا، ہونا) [ف : آسان + ی]

— سے (مف) ۱۔ جلدی اور روانی کے ساتھ - م : تنگ پائینچے آسانی سے چڑھ اتر نہیں سکتے - ۲۔ بے سوچے سمجھے، بلا تامل سہج سے ، بے تکلف - م : آسانی سے کہہ دیا کہ مشکل ہی کیا ہے کرو تو خبر پڑے۔

— کو (مف) سہولت کی خاطر، درد سری بچانے کے لیے - م : تمھاری آسانی کو ہم کہتے تھے ورنہ ہمیں کیا غرض ۔

آسائش (مث) ۱۔ راحت ، آرام ، سکھ ، چین ، کل - م: اپنے گھر کی سی آسائش کہیں نہیں - ۲۔ سہولت، آسانی - م: اس علاقے میں ریل کی آسائش ہے نہ تار کی - ۳۔ آسائش قانونی، مثلاً رستے، روشنی اور ہوا کا حق - م : ہمسائے نے آسائش کی نالش کر کے آٹھ فٹ رستہ چھڑوا لیا - ۴۔ آرام طلبی، تن آسانی - م : آسائش میں پڑگئے نوکری کے کام کے نہیں رہے۔ (پانا ، پہنچنا ، پہنچانا ، دینا ، ڈھونڈنا، رھنا) [ف : آسائش، آسائیدن کا حاصل مصدر - پہلوی : آس اس ن ، آس وس د ن — اوستا : س و = سونے کے لیے لیٹ جانا ، پھیلانا - پازند : آسودن]

— کا (ص) ۱۔ آرام دہ ، آرام کا - ۲۔ ضروریات سے مہیا - م : بڑی آسائش کا مکان ہے۔

— ملنا (ف ل) ۱۔ سہولت حاصل ہونا، کام نکلنا - م: آپ کی موٹر سے بڑی آسائش ملی - ۲۔ آرام یا راحت پانا - م :

چند روز آسائش ملی تو چہرے پر رونق آ گئی ورنہ کیا
صورت ہو رہی تھی ۔

آسائشی (ص) آرام و راحت کا ، ضروری آرام کا ۔ م : آرائشی
اور آسائشی سب سامان غارت ہوا کچھ نہ رہا ۔

(ف : آسائش + ی)

آستاں (مذ) ڈیوڑھی ، دروازہ ، باب ۔

یہ آسماں نہیں ہے ، ہے آستان جاناں
اس کی بلندیوں سے ہرگز نہ ہوگی پستی

۲۔ چوکھٹ ، دھلیز ۔

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں
(غالب)

۳۔ آرام گاہ ، تکیہ گاہ ، استھان ۔

بلبل نے گل کے سر پر ہی آشیاں بنایا
ہم نے تو اس کی چوکھٹ کو آستاں بنایا (نادان)

۴۔ درگاہ ۔

مدفون جو یہاں ہیں بے شبہ جنتی ہیں
ٹکڑا بہشت کا ہے خود آستان خواجہ

۵۔ ترکیب میں بطور لاحقہ جز ترکیبی ۔ جیسے فلک
آستاں ، عرش آستاں یعنی عرش جیسا یا فلک جیسا
آستاں رکھنے والا ۔

کیا وہ عرش آستاں دکھائی دے
آسماں کی ہے دوربیں میں خاک (شاد لکھنوی)

[ف : آستاں ، آستانہ ، ستاں ۔ (استادن سے ۔ مادہ : ستا)
پارسی میغی : ا + ستان (س ت ا ن) ۔ مقام ، جگہ ۔

اوستا : س ت ا ن ا = اصطبل ، گھڑسال - پہلوی : س ت ا ن - س : ستھان]

— بوس (ص) ۱- لفظاً چوکھٹ چومنے والا- ۲- در پر حاضری دینے والا، حاضر درگاہ - م : ہر سال اجمیر شریف جا کر آستان بوس ہونا اپنے اوپر لازم کر رکھا تھا -
[ف : آستان + بوس (بوسیدن = چومنا)]

— بوسی (مث) دیکھو: آستانہ چومنا - [ف : آستاں بوس+ی]

آستانہ (مذ) دیکھو: آستان - ۱- درگاہ -

جناب خواجہ کا آستانہ ہے بے کسوں کے لیے ٹھکانا
جو بسمل اپنا ہے آب و دانہ تو چل کے ابواں مقام ہوگا
(بسمل خیر آبادی)

۲ - چوکھٹ- دہلیز -

منقلب اکثر جہاں کا کارخانہ ہوگیا
بارہا بام فلک بھی آستانہ ہوگیا
(ناسخ)

[ف - دیکھو: آستاں]

— چومنا (ف م) چوکھٹ کو بوسہ دینا - ۲- مودبانہ حاضری دینا ، حاضر و فائز ہونا :

قصد کعبے کا تھا پھرے الٹے
چوم کر اس کے آستانے کو
(ذوق)

آستائی (مث) ۱ - وہ لے جس میں راگ شروع کیا گیا ہو آہستہ لے ، خلاف انترے کا جس میں آواز تیز و بلند کرکے اسی مصرع یا بول کو چمکا کر دہرانے ہیں - استائی - ۲ - بعض کے نزدیک الاپ یا دھرپت کا پہلا حصہ مگر یہ معنی غیر روشن ہیں -
(موسیقی) [ہ : دیکھو 'استائی']

— ہرن (مذ) (موسیقی) اگر گویا ایک ہی سر کو مسلسل لگائے یا چند سر اس طرح لگائے کہ ہر سر پر تھوڑی دیر کا وقفہ رہے تو اس کو آستائی ہرن کہیں گے مثلاً
سا۔ رے۔ ما — دھا — نی — سا [٥]

آستاوا (مذ) (عوام) دیکھو ' آفتابہ ' بمعنی دستے دار لوٹا ۔ [فارسی '' آفتابہ '' کا بگڑا ہوا]

استر (مذ) دیکھو: استر ۔ الف غیر ممدودہ سے زیادہ بولتے ہیں ۔ م : لگے بیٹھنے بچھونوں پر جن کا آستر تافتہ اور میوہ ان باغوں کا جھک رہا ۔
(تق ، عبد القادر ، صفحہ ٥٦٣)
[آستر کسی چیز کا نچلا حصہ خاص کر لباس کا ، ف: آستر ۔ اوستا : و س ت ر = پارچہ ۔ س : ا س ت ر = پہننا]

استھائی (مث) دیکھو : آستائی

آستے (مف) (عوام) آہستہ ۔ [فارسی ' آہستہ ' کا بگاڑ]

استین (مث) ١۔ شانے سے پہنچے تک کا حصہ لباس کا، جس میں ہاتھ داخل رہتے ہیں ۔ کرتے انگرکھے کی مہریاں۔ ٢ ۔ انگیا (محرم) کا شانہ یا مونڈھا (عو) [ف : استین ۔ آستیم ۔ آستی]

— الٹنا (فم) ١۔ آستین کا کف اوپر موڑ لینا ، کف الٹ لینا ، آستین چڑھانا :

وہ آستین الٹی ہوئی مرفقین تلک (انیس)

٢ ۔ آمادۂ جنگ و پیکار ہونا ، آمادۂ قتل ہونا :

الٹی جو آستین تو اک صف الٹ گئی
تیغ برہنہ ہو گئے اس دلربا کے ہاتھ
(نادان)

کرے گا ذبح خدا جانے کس کو وہ ظالم
جو لے کے ہاتھ میں خنجر کو آستیں الٹی
(ظفر)

— پکڑنا (ف م) ۱۔ ہاتھ تھامنا ، باز رکھنا ، روکنا :

اڑاتے آنکھ جو دیکھا چمن میں نرگس سے
صبا نے برگ ہزارہ کی آستیں پکڑی
(شاہ نصیر)

۲۔ دامن گیر ہونا، سر ہونا ۔ م : ہاتھ اٹھانا چاہتا تھا کہ میں نے آستین پکڑلی ۔ م: قرض خواہ سر بازار آستین پکڑ لیں گے ۔

— تھامنا (ف م) ۱۔ ذمہ دار گردانتا ۔ ۲ ۔ داد چاہنا ۔ ۳۔ وصولی یا ادائی چاہنا ۔ م : تم ضامن ہوئے تھے ہم تو تمھاری آستین تھامیں گے ۔

— جھاڑنا (ف م) ہاتھ جھٹکانا ۔

ہے مجھے اے ابر دریا بار اتنا تو یقیں
تجھ سے نکلیں گے کئی جھاڑوں اگر میں آستیں
(سودا)

— چڑھانا (ف م) ۱۔ آستین کو سکیڑ کر اونچا کرلینا یا آستین کے کف الٹ لینا تا کہ آلودہ نہ ہوں ۔ م: آستین چڑھا کر وضو کرنے بیٹھے ۔ ۲۔ آمادہ و مستعد ہونا :

آستیں اس نے چڑھائی لے کے خنجر ہاتھ میں (ظفر)
آستینیں قتل عاشق پر چڑھانا کیا ضرور (اسیر)

۳۔ دھمکانا ، مارنے لڑنے پر آمادہ ہونا ۔ م : کیوں بیچارے غریب پر آستین چڑھاتے ہو ؟ :

غضب سے گر چڑھاتا آستیں وہ تند خو آئے (میر)

۰۔ آستین لگانا۔ م: ساری اچکن تیار ہے صرف آستین چڑھانی ہے۔ (خیاطی)

— چڑھنا (ف ل) دیکھو: آستین چڑھانا۔ یہ فعل لازم ہے:

آستیں ہر گھڑی چڑھتی ہے مری دامن پر
دشت وحشت بھی بڑا رستم دستاں نکلا (صبا)

— دار (ص) ۱۔ جس میں آستینیں ہوں۔ ۲۔ لمبی آستینوں والا یا والی:

کرتی شبنم کی آستینوں دار (ملق لکھنوی)

— دینا (ف م) ۱۔ آستین لگانا۔ م: مخمل میں اطلس کی آستین دوگے تو بے جوڑ نہ معلوم ہوگی۔

— ڈالنا (ف م) آستین کا جوڑ مونڈھے سے پیوست کرنا، آستین لگانا۔ م: اچکن کھڑی کرلی ہے آستین ڈالنی باقی ہے۔

— کا (ص)۔ آستینوں دار، جیسے کہنیوں تک آستین کا کرتہ۔ ۲۔ آستین سے منسوب جیسے آستین کا سانپ۔

— کا پلا ہوا (ص، مذ) ۱۔ جس کو آستین میں پالا ہو (جیسے گلہری کا بچہ)۔ ۲۔ اپنے ہاتھوں کا کھلایا ہوا، خود اپنا پالا پوسا پروردہ، اکثر اس کے لیے مستعمل جو پرورش پاکر بعد کو مخالف ہوگیا ہو، بغلی گھونسا۔ م: آستین کے پلے ہوئے نے دشمنی کی۔

— کا چاک (مذ) آستین کا کف جس کے دونوں جانب ملا کر سینے سے چھوڑ دیے گئے ہوں اور کھلے رہتے ہوں۔

— کا چور (ص، مذ) (اصطلاح اطفال) کرتے کی آستین کا سرا یا کف جس کو مٹھی میں دبا کر اوپر سے چغے وغیرہ کی آستین پہنتے ہیں۔

کا سانپ (ص) ۱۔ اپنا پروردہ جو بعد کو دشمن موذی ثابت ہو، محسن کش۔ ۲۔ عزیز و قریب یا دوست ہمراز

جو در پردہ دشمنی کرے ، قرابت یا دوستی کے بھیس میں دشمنی کرنے والا ، (مرادف : بغلی دشمن ، بغلی گھونسا) :

دوستی دشمن جتاتا ہے مجھے
ڈرتا ہوں میں آستیں کے سانپ سے
(یادگار غالب)

— کھینچنا (ف م) ۱- اپنی طرف گھسیٹنا یا متوجہ کرنا - ۲- ٹھوکنا ، متنبہ کرنا ، منع کرنا - م: میں اس کی نسبت بھی کچھ کہنے کو تھا کہ اس نے پیچھے سے میری آستین کھینچی میں چپ ہو گیا -

— کی (ص ، دیکھو ' آستین کا ' جس کی یہ تانیث ہے :

آستیوں کی وہ پھنسی چولی (مرزا شوق)

۲ - آستین میں رہنے والی یا پوشیدہ جیسے آستین کی چھری -

— کی مہری (مث) لمبا کھلا آستین کا :

آستینوں کی تری مہریاں ویسی ہی تنگ
(مصحفی)

— لگانا (ف م) دیکھو: آستین ڈالنا -

— میں چھری رکھنا (ف م) ۱- دشمنی کرنے کے داؤ میں ہونا - ۲- چھپا دشمن ہونا - م: بھائی کے لیے آستین میں چھری رکھے پھرتے ہیں ، ہر جگہ اس کی کاٹ کرتے ہیں -

— میں سانپ پالنا (ف م) ۱- دشمنوں کو بغل میں پرورش دینا - ۲- موذیوں کو دوست ہمراز و مصاحب بنانا -

دیتا ہے دل میں اپنے اس زلف کو جو جاگہ
گویا کہ آستیں میں وہ سانپ پالتا ہے
(مصحفی)

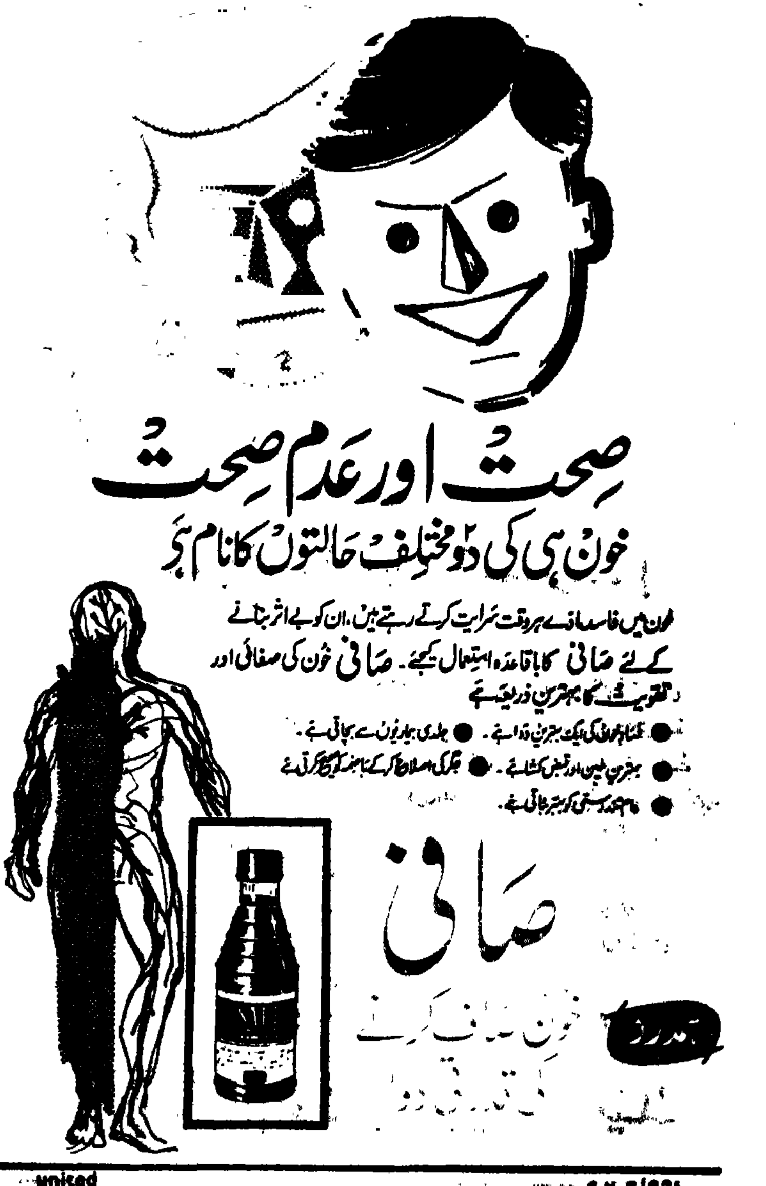
"غالباً کوئی دوسری ایئرلائن ایسی نہیں جو ایک نئے ملک کی تعمیر و ترقی میں اتنی بھرپور امداد دینے میں پی آئی اے کا مقابلہ کر سکے"

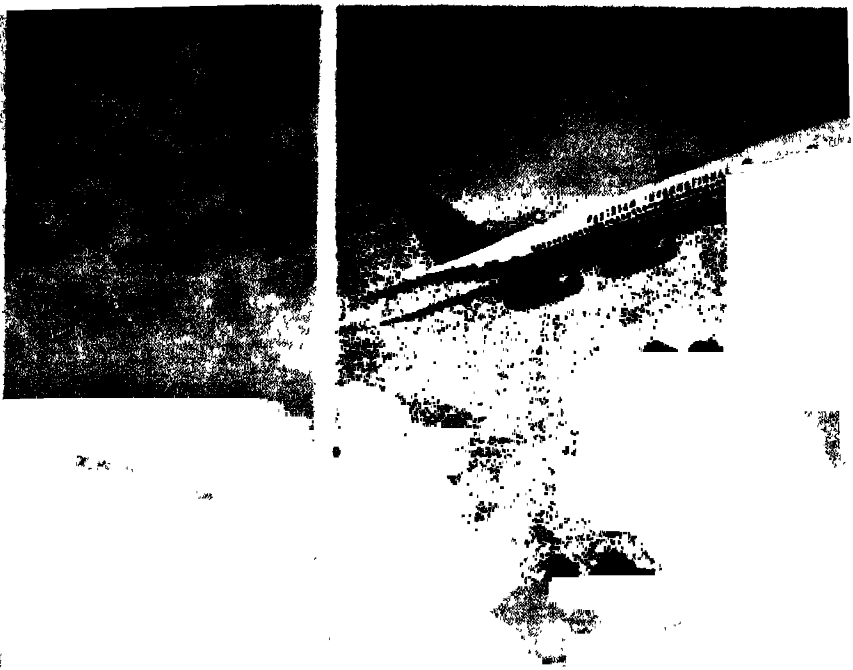
— ایڈلئی ویلس
ڈیفنس اور ایوی ایشن کارسپانڈنٹ
اخبار "آبزرور" لندن

[illegible]



PIA پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز


صحت اور عدم صحت
خون ہی کی دو مختلف حالتوں کا نام ہے
خون میں فاسد مادے ہر وقت سرایت کرتے رہتے ہیں۔ ان کو بے اثر بنانے
کے لئے صافی کا باقاعدہ استعمال کیجئے۔ صافی خون کی صفائی اور
تقویت کا بہترین ذریعہ ہے
جلدی بیماریوں سے بچاتی ہے۔
صافی
united



۱۹۸۰

پھر آئے ایسے ہی عظیم الشان سال

PIA

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز